افق سے افق تک

# افق سے افق تک

(۷۹)

کتابیں

قومی

وقار

کی

بنیاد

میں

# افق سے افق تک

۱ رپور تاژ

۳ ڈرامے

۶ افسانے

۱ ناولٹ

## آغا اشرف

چوک مینار انارکلی لاهور۔ ۸

ڈیڈوڈ ڈارلنگ، اپنی بیوی کے نام
جس کی موت میری زندگی کا سب سے
بڑا انقلاب ہے۔

میری لائبریری میں ادب و افسانہ کی دوسری کتابیں

ادداہ - منشی پریم چند

بارِ خاطر - ابوالکلام آزاد

یوانِ غالب - مطابق متن عرشی

کلیات غالب - فارسی دیوان مرتبہ وزیر الحسن عابدی

لذتِ آوارگی (دیوان) اے، ڈی، اظہر

پتھر کا دیس (ناول) عادل رشید

منزل منزل دل بھٹکے گا (چار ناولٹ) عنایت اللہ

میرے بھی صنم خانے (ناول) قرۃ العین حیدر

اردو کا بہترین انشائی ادب - مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

بہترین شخصیت نگاری - مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

میرزا ادیب کے بہترین افسانے - مرتب عرش صدیقی

مختصر تاریخ ادب پنجابی - مرتب احمد حسین قلعداری، ڈاکٹر وحید قریشی

پنجابی زبان دے بہترین ڈرامے - مرتبہ عبدالغفور قریشی

شیر شیر شیر (شکار کی کہانیاں)

ادب کا تنقیدی مطالعہ - ڈاکٹر سلام سندیلوی

اندیشۂ شہر - احمد جمال پاشا

روپ متی - سید فیاض حسین

سلطانی محلوں کے راز - جمال پاشا - عبدالرزاق ملیح آبادی

زندگی کے موڑ پر - چالیس سچی کہانیاں

فاصلے - سیدہ عفرا بخاری

ندیم کے بہترین افسانے، مرتبہ مظفر علی سید

ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ، سلمٰی عنایت

# ترتیب

## رپورتاژ

حرفِ اول ۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ۷
دل دیا داغ لیا، ۹

## ڈرامے

حرفِ اول ۔ سید امتیاز علی تاج، ۱۶۵
یہ ربط ۔ ۱۶۷
جادو ۔ ۲۰۳
چھ فنکار ۔ ۲۳۷

## افسانے


حرفِ اول ۔ مولانا صلاح الدین احمد، ۲۶۴
حرفِ اول ۔ عبدالمجید سالک مرحوم، ۲۶۵
آم کی گٹھلی، ۲۶۶
آرک لائٹ، ۲۷۷
ایک کے بعد ایک، ۲۸۶
گل رخ، ۳۰۱
موم بتی، ۳۰۹
دلربا، ۳۱۷


## ناولٹ


حرفِ اول ۔ اشفاق احمد، ۳۵۴
ریشم کا کیڑا، ۳۵۵


---


پرنٹر:- پاکستان ٹائمز پریس لاہور ★ پبلشر:- بشیر احمد چودھری

# حرف اول

"افق سے افق تک"، آغا اشرف کے تین ڈراموں، سات افسانوں، ایک رپورتاژ اور ایک ناولٹ کا مجموعہ ہے۔ آغا صاحب اردو اور پنجابی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ایک منجھے ہوئے ایکٹر اور سلجھے ہوئے ریڈیو آرٹسٹ ہیں۔ انھوں نے ڈرامے کے فن کو محض علم کتابی کے طور پر حاصل نہیں کیا بلکہ ڈرامے کی تکنیکی ضروریات اور خصائص کو خود برت کر دیکھا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے تین ریڈیو ڈرامے ہیں اور تینوں میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ریڈیائی ڈرامے کی پابندیوں اور مفاہمتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ریڈیائی ڈرامے کی کامیابی کا انحصار کرداروں کی حرکات و سکنات پر نہیں بلکہ تمام تر مکالموں پر ہے۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک ان کا سب سے کامیاب ڈرامہ "چھ فنکار" ہے۔ "ربط" میں انھوں نے یونانی علم الاصنام کی Theme کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور یونانی ڈرامے کی فضا اور خطابت کو محبت کی تمثیلی حیثیت میں اجاگر کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ عشق و محبت کو وہ روحانی سطح پر لا کر دیکھتے ہیں اور انسانی ترقی کے مختلف مدارج کو انھوں نے آرفیوس کے آسمانی سفر کے استعارے کی شکل میں چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ "جادو" نسبتاً کمزور ڈرامہ ہے اور اس کی کمزوری کا سبب ڈرامے کے لوازم سے بے اعتنائی نہیں ہے بلکہ شاعر کے کردار کا جذباتیت آمیز اظہار ہے "جادو" کا یہی مرکزی کردار ان کے رپورتاژ "دل دیا داغ لیا"

میں بھی پایا جاتا ہے۔ جادو میں آغا صاحب نے ایک عجیب تراش کے اندر
سوئے ہوئے شاعر کو بیدار کرنے کی کوشش کی تھی وہی ادیب اور شاعر
" دل دیا داغ لیا " میں زیادہ بہتر روپ میں رونما ہوا ہے لیکن اس کہانی
میں بھی اس کی جذباتیت آخر میں آ کر ایک وحشتناک رخ اختیار کرنے لگتی
ہے لیکن فنکار یہاں اپنے کردار سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ مولسری کے درخت
کی تمثیل اس کہانی کو ایمائی شکل دے دیتی ہے۔ آغا اشرف کی کامیابی اس
میں ہے کہ وہ اس رپورتاژ کو ایک صحافتی روداد نہیں بنا دیتا۔ کئی مواقع
ایسے آئے تھے جہاں وعظ و نصیحت کے ذرا طویل ہو کر صحافت بن جانے
کا کلی امکان تھا خصوصاً پاکستان کے موجودہ دور کے تجزیے میں اور بعض
زندہ امثال کو گرفت میں لینے سے ہر موقع پر اس کا امکان تھا۔ آغا اشرف
ایسے مقامات پر دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے اور نہایت ہنرمندی اور
فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے آگے گزر جاتے ہیں۔

" افق سے افق تک " میں آغا اشرف صاحب کے چھ افسانے بھی
شامل ہیں۔ جن میں وہ بہت کچھ منٹو کے قریب ہیں۔ خصوصاً " موم بتی "
میں ان کی افسانوی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آئی ہیں۔ وہ افسانوں میں
بھی ڈرامائی کیفیتیں پیدا کر کے قاری کے لئے افسانے کے تاثر کو آسانی
سے قابل قبول بنا دیتے ہیں۔

آغا اشرف کی ادبی تربیت کا دور ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے زیر اثر وجود میں
آنے والی رومانی تحریک سے لے کر منٹو کی بے رحم حقیقت پسندی تک پھیلا

ہوا ہے۔ اور اس کے نشانات ان کی تحریر میں نظر آتے ہیں۔ آغا اشرف کے اسلوب میں روانی اور مکالموں میں زور ہے۔ ان کے تجربات میں تنوع ہے۔ وہ زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا انوکھا شعور رکھتے ہیں۔ جس سے ان کی نگارشات خاصے کی چیز ہو گئی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آغا صاحب فرضی اور مصنوعی ماحول کی بجائے گردوپیش کی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ دورِ حاضر کے مسائل پر اس قدرت اور اعتماد سے شاید ہی کسی افسانہ نگار نے لکھا ہو۔ میں آغا صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی

۱۳/۷/۶۸

۲۶۹ - این

سمن آباد۔ لاہور

"میری لائبریری — کی
کتابوں کی اشاعت و انتخاب میں جو سلیقہ
اور خوبصورتی دکھائی دیتی ہے — وہ
دوسروں کے ہاں خال خال ہے!"

میاں بشیر احمد

# دل دیا داغ لیا

میرے دل میں ایک داغ ہے۔

جب میں اُسے دل کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ تو یہ دھرتی، یہ سمندر، یہ آسمان مجھے اس کے مقابلے میں چھوٹے سے نظر آتے ہیں۔ اور وہ ویرانی وہ اداسی جو اس میں ہے۔ شاید ہی دنیا کے کسی ہولناک سے ہولناک ویرانے میں ہو۔

اس داغ کی ایک بڑی ہی دردناک داستان ہے۔ ایک بڑی ہی المناک کہانی ہے۔ جو ایک بستی سے شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ نئی بستی ہے۔ اس کا نام۔ میرے سطحی اندازے کے مطابق اس بستی میں پانچ چھ ہزار مہاجر بستے ہیں۔ بڑی گنجان ہے۔ اس کی آبادی جیسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی حصہ اور مغربی حصہ۔ مشرقی حصے میں پرانے مکان ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے ڈھارے ہیں جن میں عیال دار لوگ بھرتی کی طرح کھپے ہوئے ہیں۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ پہلی منزل میں اگر نانبائی رہتا ہے تو دوسری منزل میں منیاری بیچنے والے کا ڈیرہ ہے۔ تیسری منزل میں پنواڑی گھسا ہوا ہے تو چوتھی منزل کمہار کے پاس ہے۔ اس کمرے پر موچی کا قبضہ ہے تو اُس کمرے میں کوئی چپڑاسی جھنڈے گاڑے بیٹھا ہے۔ اور زندگی کے سارے دھندے اُسی کمرے میں ہو رہے ہیں۔ وہیں کھانا پکانا وہیں نہانا دھونا۔ ٹٹی پیشاب کے لئے بھی اس کمرے کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ رات کے وقت چار پائیاں ایک دوسری میں ٹھونس

ٹھانس کر وہیں بچھا دی جاتی ہیں۔ اور صبح کو اٹھا کر وہیں کسی کونے میں فرش سے لے کر چھت تک ان کا مینار سا بنا دیا جاتا ہے ساگر وہاں کُھرا وغیرہ ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ہے تو کسی دیوار میں شگاف کر کے نالی بناتے ہوئے چھوٹی بڑی اینٹیں جوڑ توڑ کر وہاں کُھرا بنا لیا گیا ہے۔ جس کا گندا پانی یا تو آس پاس کی دیواروں میں دھنستے ہوئے سیلن، کھٹمل، پِسّو اور مچھّر پیدا کرتا ہے۔ اور یا پھر کسی چھجے یا رونس پر بہہ کر اس کے آنگن میں یا باہر گلی میں آبشار کی طرح گرتے ہوئے راہ گیروں کا ناطقہ تنگ کرتا ہے۔ آنے جانے والے پھسلتے ہیں۔ چھینٹوں سے ان کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ وہ شور مچاتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں۔

کئی کمرے روشن دان نہ ہونے کی وجہ سے دھوئیں سے کالے ہو رہے ہیں۔ ان کی چھتوں سے دھوئیں اور مکڑی کے جالے لٹک رہے ہیں۔ تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے دروازے کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہونے کی وجہ سے اُن میں گھٹن سی پیدا ہو رہی ہے۔ سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ مگر وہاں رہنے والے ہیں کہ نہ جانے کیسے سانس لئے جا رہے ہیں۔ کیسے جی رہے ہیں۔

کئی کمروں کی دیواریں برسوں سے مرمت اور سفیدی نہ ہونے کے باعث اپنا آپ چھوڑ رہی ہیں۔ ان کا پلستر اکھڑتا جا رہا ہے۔ نیچے سے اینٹیں ننگی ہو رہی ہیں۔ لونی اٹھ رہی ہے۔ جا بجا دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ چھپکلیوں اور چوہوں نے سوراخ نکالے ہوئے ہیں۔ اور جو فرش دیکھو تو وہ بھی ویسا ہی۔ مٹی سے اٹا ہوا۔ جا بجا پان کی پیکوں کے نشان۔ چکنا ہٹ کے دھبے۔ چونے اور

کونے سے کھچی ہوئی لکیروں کے گیرٹی کاڑسے۔ کہیں برتن بکھرے ہوئے ہیں کہیں کھانے پینے کی چیزوں پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اڑوس پڑوس کی بلیاں ضیافت اڑا رہی ہیں۔ برتنوں میں کبھی منہ کبھی پنجے کبھی دم چلا رہی ہیں۔ کہیں میلے کچیلے پارچات کے ڈھیر لگے ہیں۔ کہیں ننھا بیٹھا مُوت رہا ہے۔ ٹٹی کر رہا ہے۔ چولہے کی راکھ سے لت پت ہو رہا ہے۔ غل غپاڑہ کر رہا ہے۔ مُوت میں ٹانگیں چلا کر چھینٹیں اڑا رہا ہے۔ کپڑے سن رہے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں ٹھٹھر رہی ہیں۔ عجیب ابتری نظر آتی ہے۔ اس کونے میں ایندھن پڑا ہے۔ اُس کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہے جس میں سبزیوں کے چھلکے، بچی کھچی باسی روٹیوں کے ٹکڑے، چھان لُورا، ننھے کا گُوت مُوت، بلبلے چھوڑتا باسی سالن، ردی کاغذ، گھاس پھوس اور چیتھڑے دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہیں ناک سنکا جاتا ہے۔ وہیں تھوکا جاتا ہے۔ کھانس کھنکار کر بلغم کے تھوبے بھی وہیں تھوپے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں مل جُل کر سڑتے گلتے ہوئے بڑی ہی بھیانک باس پیدا کر دیتی ہیں۔ جس سے طبیعت خواہ مخواہ الکانے لگتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے پر گڑبڑ ہوئی تو اس بستی کے کافی مکان جل جلا کر ٹوٹے پھوٹے ڈھارے بن گئے۔ کھنڈر بن گئے۔ کچھ تو بارشوں، آندھیوں، زلزلوں سے زمین کے ساتھ زمین ہو گئے اور کچھ ابھی تک اسی حالت میں موجود ہیں۔ کسی کی اگلی دیوار نہیں ہے۔ کسی کی پچھلی دیوار نہیں ہے۔ کسی کی دیواریں تو جُوں کی تُوں موجود ہیں مگر چھتیں غائب ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں نہیں ہیں۔ سیڑھیاں نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو اب انہیں سیڑھیاں نہیں پُل صراط کہنا

کہا جا سکتا ہے۔ جہاں سے گزرنے کے لئے اگر دفتر عمل ساتھ نہ ہو تو دل گردوں کا ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ سیڑھیاں اوپر یا نیچے لیجانے کی بجائے کہیں اور بھی لے جا سکتی ہیں۔ ان پر چڑھنے یا اترنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ ان زینوں سے پرے کیا ہے؟ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ زینے کدھر جاتے ہیں؟

ان ڈھاروں میں لکڑی یا اُس سے بنی ہوئی کسی شے کا اب کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ کچھ لکڑی تو شعلوں سے جل جلا کر راکھ ہو چکی۔ کچھ انسانوں اور ڈنگر ڈھوروں کی لاشوں کو جلانے میں مرگھٹ میں کام آئی۔ اور بچی کھچی لکڑی لُٹ پُٹ کر آنے والے مسافروں نے ٹھٹھری یخ راتوں میں جلا کر آگ تاپی۔ اب وہاں لکڑی کہاں۔ البتہ اُن شعلوں کے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ جو آج سے پندرہ سال پہلے نہ جانے کیا کیا جلا کر بجھے تھے۔ بجھائے گئے تھے۔

اِن ڈھاروں کی کئی چیزیں، کئی حصے تو ایسے ہیں، جو ان میں بسنے والوں کی زندگی کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ مثلاً لوہے کے ٹیڑھے میڑھے گارڈر، نیچے کو جھکی ہوئی ممٹیاں اور منڈیریں۔ آدھی غائب آدھی موجود چھتیں۔ اور جھولتی جھالتی وہ دیواریں جو ابھی تک ہوا میں معلق نظر آتی ہیں۔ وہ جہاں تھیں ابھی تک وہیں کھڑی ہیں۔ مگر بے ستون۔ بے سہارا۔ انھوں نے ہوا کو پکڑ رکھا ہے یا ہوا نے ان کو پکڑا ہوا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ان ڈھاروں کے چھوٹے چھوٹے رخنوں میں، شگافوں میں تو چیلوں کبوتروں اور ابابیلوں کے گھونسلے ہیں۔ اور بڑے شگافوں میں انسانوں کے گھونسلے۔ ان کھنڈروں میں آسیب اور پرندے ہی نہیں انسان بھی بستے ہیں۔ جن پر کہیں

توہوا میں معلق کوئی ٹوٹی پھوٹی منڈیر، ممٹی یا چھت موت بن کر لٹک رہی ہے۔ اور کہیں یہ موت سے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ بے ستون۔ بے سہارا۔ زندگی سے بہت دور۔ موت سے بہت قریب۔ مگر زندگی اور موت دونوں سے بے نیاز۔ بے پرواہ۔ بے فکر۔ مینہ آئے یا آندھی۔ چلچلاتی دھوپ ہو یا کڑکتے جاڑے ہوں۔ یہ کھلے آسمان تلے یونہی پڑے رہتے ہیں۔ اور اپنے ماضی و مستقبل کے سپنے دیکھتے ہوئے سوچا کرتے ہیں۔ یہ رات کب کٹے گی؟ سویرا کب ہوگا؟ کون جانے یہ کس سویرے کا انتظار کر رہے ہیں۔

ان ڈھاروں سے کبھی کسی ساز کسی باجے کی آواز نہیں آتی۔ نہ ان میں کبھی ڈھولک بجتی ہے۔ نہ گیت گائے جاتے ہیں۔ نہ چوڑیاں چھنکتی ہیں۔ نہ پائل کے چھنا کے سنائی دیتے ہیں۔ نہ کبھی کسی کے بولنے کی آواز آتی ہے نہ ہنسنے کی۔ البتہ اس سناٹے میں کبھی کبھی رونے اور بین کرنے کی آوازیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔ اور یا پھر برسات کے دنوں میں جب کالے، کالے بادلوں سے سمندر برستے ہیں تو ان سے یکدم ایک قیامت خیز شور اور مہیب چیخیں اٹھا کرتی ہیں۔ ڈھارے کا کوئی حصہ دھڑام سے زمین پر آجاتا ہے۔ کینے کے سارے لوگ ملبے کے نیچے دب جاتے ہیں۔ کچھ تو اسی وقت وہیں سرد ہو جاتے ہیں۔ کچھ زخموں سے سسکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ملبے کے اس پہاڑ تلے کون کون کہاں کہاں پڑا ہے، اور اس پر کیا بیت گئی ہے۔

اس بستی کے مغربی حصے میں جھونپڑوں کا ایک سمندر ہے۔ جس کے طول وعرض

میں مٹی گارے گھاس پھوس کے جھونپڑے بڑی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں غریب و مزدور لوگ رہتے ہیں۔ محنت کش لوگ رہتے ہیں۔ یہ جھونپڑے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پاس پاس کچھ اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ تیز و تند آندھی میں بھی ہوا کا کوئی جھونکا کبھی ان میں سے نہیں گزرا، اور سورج کی روشنی کا بھی یہی حال ہے۔ بے شمار جھونپڑے ایسے ہیں کہ پوری شدت سے چمکتے ہوئے سورج کی کوئی کرن کبھی ان میں داخل نہیں ہوئی۔ ان میں کبھی کوئی سویرا نہیں جاگا۔ کبھی کوئی اجالا نہیں ہوا۔ ہمیشہ گہرا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ جس میں ٹمٹماتے دیئوں کی روشنی سسک سسک کر دم توڑ جاتی ہے۔ خدا کی ایک مخلوق اسی اندھیرے میں جئے جا رہی ہے۔ اس مخلوق کے اندر بھی اندھیرا ہے اور باہر بھی اندھیرا۔ اس مخلوق نے اندھیرے ہی سے جنم لیا ہے۔ اندھیرے ہی میں لہو تھوکتے اور کھانستے ہوئے سوکھ سوکھ کر مر جاتی ہے۔ اس مخلوق نے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ایک اندھیرے سے دوسرے اندھیرے تک روشنی کا راستہ بنانے کی کوشش میں دیئے جلاتے اور ان کو بجھاتے ہوئے ہی ان کی عمر گزر جاتی ہے۔ مگر روشنی کا کوئی راستہ نہیں بنتا۔ یہ لوگ اپنے منظر و پس منظر میں خود فریبی کے سراب بنائے چلے جاتے ہیں۔ گزرتے بیتے لمحوں کی لکیریں پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ لکیریں ان کی قسمت کی لکیریں ہیں، ان کی زندگی کا گورکھ دھندا۔

یہ لوگ رات دن کام کرتے ہیں۔ محنت و مزدوری کرتے ہیں لیکن پھر بھی ننگے بھوکے رہتے ہیں۔ کھانے کو انہیں روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں

ملتا۔ آمدنی کم ہے۔ عیالداری زیادہ ہے۔ کئی لوگ ان میں ایسے ہیں جنہیں بیکاری نے بوکھلایا ہوا ہے۔ وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ مہنگائی کا زمانہ ہے، کریں تو کیا کریں۔ جائیں تو کدھر جائیں۔ بڑھیا قسم کا آٹا ایک روپے دو آنے کا دو سیر اور گھٹیا قسم کا اڑھائی سیر۔ مگر ان دونوں قسموں میں ملاوٹ۔ کوئی چیز بھی تو ملاوٹ سے خالی نہیں۔ انسانوں کی روح اور ضمیر میں بھی ملاوٹ ہو چکی ہے۔ اشیائے خوردنی کے ساتھ انسانی قدروں کو بھی زندگی کے ترازو میں پاسنگ رکھ کر کھوٹے بٹوں سے تولا جا رہا ہے۔ اگر یہ انقلابی حکومت وجود میں نہ آتی تو خدا جانے کیا قیامت آجاتی۔ موجودہ حکومت نے چیزوں میں ملاوٹ کرنے اور انہیں مہنگا بیچنے والوں کے لئے مناسب سزائیں تجویز کرتے ہوئے پانچ کروڑ انسانوں کے جسم پر رستے ہوئے گھناؤنے ناسور کا شافی علاج کیا ہے۔ مگر پھر بھی کئی ایسے ہیں جو ابھی تک چھپ چھپا کر شروع ہیں۔ دودھ میں پانی۔ گھی میں چربی اور تیل۔ آٹے میں مٹی چونا اچھی خاصی مقدار میں ملایا جا رہا ہے۔ انسانوں کو کھلایا جا رہا ہے۔ اور چور بازاری بھی کسی نہ کسی چھپر میں ابھی تک چل رہی ہے۔ منافع خور اب بھی ناجائز منافع لینے سے گریز نہیں کرتے۔ دودھ دس آنے سیر۔ گوشت کبھی ساڑھے تین کبھی چار روپے سیر۔ آلو آٹھ آنے سیر۔ گوبھی کا پھول چھوٹے سے چھوٹا دس بارہ آنے میں۔ اتنا سا ایک پیاز ایک آنے میں۔ کبھی دھنیا پیاز وغیرہ سبزی خریدنے پر دکاندار سے جھونگے میں مل جاتا تھا۔ ایک آنے کا کڑوا تیل، مرچیں، ہلدی لینے جاؤ تو کریانے والا مذاق اڑاتا ہے۔ سید ھے منہ

بات نہیں کرتا۔ناک سے اس کے بچھو گرتے ہیں۔کوئی حد ہے مہنگائی کی۔
کمانے والا ایک اور کھانے والی لام ڈوری۔گھر کی گھاگر اپلیٹن۔چکی چولہے کا
مسئلہ ایک بہت بڑی مصیبت بنا ہوا ہے۔راشن کے ریلے کہیں رکنے نہیں
دیتے۔ادھر لاؤ ادھر ختم۔بھوک نہیں مٹتی۔پیٹ پورے نہیں ہوتے۔ایک
روٹی نہ جانے کتنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ایک پاؤ دال اور اس میں دو سیر
پانی۔پھر بھی دو پہر نہیں نکلتے۔سالن کی جگہ نمک مرچ پانی میں گھول کر نوالے
لئے جاتے ہیں۔پیاز اور لہسن کی چٹنی بنا کر روکھی چاٹی جاتی ہے۔کیسی نہ کسی
طرح بھوک کو مٹانا ہے۔مگر بھوک تو شاید پیٹ کے اندر چھپا ہوا چھلاوا
بن گئی ہے۔ڈائن بن گئی ہے۔بس ہر وقت کھانے کو مانگے جاتی ہے۔
بچے خالی ہنڈیا اور چمچے چاٹ کر رہی سہی کسر کو پورا کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔بڑے ایک لقمہ اور اس کے ساتھ دو گھونٹ پانی پی کر بھوک کے
چھلاوے کو چھلنا چاہتے ہیں۔مگر بھوک انہیں چھل جاتی ہے۔
کوئی حد نہیں ہے مہنگائی کی۔اور ستم پہ ستم تو یہ ہے کہ چیزیں جتنی مہنگی
ہیں اتنی ہی ناقص ہیں۔کئی فنکار تو ایسے ہیں کہ جانوروں کے کھاجے پھپاک کو
مرچوں کا رنگ دے کر انسانوں کو کھلا رہے ہیں۔اپنی فنکاری کے جوہر
دکھا رہے ہیں۔میں سوچا کرتا ہوں کہ جراثیم زیادہ خطرناک ہیں یا ایسے انسان؟
کپڑے کا یہ عالم ہے کہ دکانیں ہر قسم کے کپڑے سے بھری ہوئی ہیں۔ملکی
ملیں اب اچھے سے اچھا کپڑا لاکھوں گانٹھوں اور تھانوں کی مقدار میں تیار
کر رہی ہیں۔مگر کپڑا ہے کہ سستا نہیں ہوتا۔منافع خور آڑھتی اسے گندل سے

نہیں فیتوں سے ناپ رہے ہیں۔ پیوندگی اس زندگی میں دن رات اور نیئے پیوند لگاتے ہوئے خود کو فریب دے لینا تو اتنا مشکل نہیں مشکل کا احساس تو اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ سامنے دھری ہوئی لاش کو ڈھانپنے کے لیئے کم سے کم ایک روپے چار آنے گز بکتے ہوئے لٹھے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ لوگ بڑی مشکل میں ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ تن ڈھانپ رہے ہیں۔ یہ گھاس پھوس مٹی گارے کہ اس رکے رکے تھمے تھمے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے کبھی ڈوب رہے ہیں کبھی ابھر رہے ہیں۔ مگر کوئی موج ایسی نہیں آتی جو انہیں اس مردہ سمندر سے اٹھا کر کنارے تک لے جائے۔ اس سمندر سے کوئی جوار بھاٹا جنم نہیں لیتا۔ اس سمندر کا کوئی ساحل نہیں ہے۔

ان جھونپڑوں سے بہتا ہوا گندہ پانی نکاس کا کوئی راستہ نہ ہونے کے سبب ادھر اُدھر پھیل کر جا بجا کیچڑ کی دلدلیں بنا تا گڑھوں میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اور مہینوں ان میں پڑا سڑتا گلتا رہتا ہے۔ سڑاند پیدا کرتا ہے۔ وبائی بیماریوں کے جراثیم پیدا کرتا ہے۔ ہیضہ، چیچک، ڈائریا، پیچش اور تپ دق تو اس بستی کی سوغات ہیں۔ متعدی بیماریاں اس کی مٹی میں ملی ہوئی ہیں۔ اس کی ہواؤں میں گھلی ہوئی ہیں۔ ان جھونپڑوں میں رہنے والے پچیس فیصد لوگ مرض دق میں مبتلا ہیں۔ وہ ہر وقت کھانس رہے ہیں۔ لہو تھوک رہے ہیں۔ بخار سے ان کا جسم ہر وقت تپتا رہتا ہے۔ نہ تازہ ہوا نہ سورج کی روشنی۔ اور نہ صاف ستھرا ماحول۔ پچیس فیصد زرد چہرے۔ کھوکھلے ڈھانچے۔ دیمک لگے پنجر۔

مدقوق روحیں ان جراثیم آلود اندھیروں اور گندگی کے ڈھیروں میں سسکنے پر مجبور ہیں۔

ان جھونپڑوں میں زیادہ تر گوالے، گھسیارے، چرواہے، کوچبان اور شتربان رہتے ہیں۔ اور یا پھر حالات وواقعات سے مجبور وہ سفید پوش لوگ جو مکانوں کی کمی کے باعث مناسب کرائے کا کہیں مکان نہ مل سکنے کی وجہ سے ایسی ہی کسی نیلام لاٹ میں چھپرا کھپرا بنا کر وقت کاٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان میں کئی لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں باوجود مہاجر ہونے کے کوئی مکان الاٹ نہ ہو سکا۔ اور وہ بنا بنایا کوئی جھونپڑا کسی سے خرید کر، پگڑی دے کر، یا خود اپنا جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ جیسے کہ ٹوٹے ہوئے ڈھاروں کے رہنے والے۔ یہ بستی بڑی گندی ہے۔ گندی وغلیظ بستی۔ اس میں حد سے زیادہ گندگی ہونے کی وجہ وہ مویشی اور پالتو جانور بھی ہیں۔ جو اپنے رکھوالوں کے ساتھ ہی ان جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ مرغیاں، کبوتر، بھیڑ بکریاں، گائیں بھینسیں، گھوڑے گدھے اور اونٹ بھی۔ جن کے گوبر کے اس بستی میں ہر جگہ ہر وقت ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں گوالوں نے گیلے گوبر کے اُپلے نہ لگائے ہوئے ہوں۔ جو اس بستی کے سارے جسم پر چیچک کے داغ۔ کوڑھ کے داغ۔ دق کے داغ معلوم ہوتے ہیں۔ مدقوق بستی۔ کوڑھی بستی۔ چیچک کی ماری بستی، جس میں انسانوں کی کئی نسلیں پرورش پا رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ یہ داغ بھی پرورش پا رہے ہیں۔ یہ داغ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ پہلی کھیپ کے اترتے ہی

دوسری کھیپ وہاں پھر لگا دی جاتی ہے ۔ بہار کے موسم میں گھاس پھوس کے
ان گھروندوں پر مکھیوں اور مچھروں کی نئی پود کے دل یا دل منڈلایا کرتے ہیں ۔
دور دور تک مار کرتے ہیں ۔ لوگوں کو بیمار کرتے ہیں ۔ کمیٹی کا صفائی کا عملہ چاہے
کتنی کوشش کرے گندگی کے اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا ۔ یہ سیلاب
یونہی بہتا رہے گا ۔ اس سیلاب کا رخ بدلنے کے لئے اس بستی کا — ان
جھونپڑوں کا — ان انسانوں کا بہت کچھ بدلنا پڑے گا ۔

میں بھی اسی بستی میں ایک جھونپڑے میں رہتا ہوں ۔ جو دوسرے جھونپڑوں
سے کچھ مختلف ہے ۔ ہے تو ویسے وہ بھی جھونپڑا ہی مگر گیٹا گری کا فرق ہے ۔
میں نے اس جھونپڑے کا نام رین بسیرا رکھا ہوا ہے ۔ اس کی دیواریں اور
چھتیں گھاس پھوس کی نہیں اینٹوں کی ہیں ۔ اس میں تین کمرے ہیں ۔ جن کے
آگے قدِ آدم دیوار کھڑی کر کے چھوٹا سا ایک صحن بنایا ہوا ہے جس میں ایک
طرف غسل خانہ اور اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ ہے ۔ دوسری طرف گھاس
پھوس مٹی گارے کی بنی ہوئی ٹٹی ہے جس کی نالی ساتھ کی دیوار سے نکل کر باہر
بہتی ہوئی بڑی نالی سے جا ملتی ہے ۔ صحن کے عین وسط میں مولسری کا پیڑ ہے ۔
جو میں نے آج سے پندرہ سال پہلے یہاں لگایا تھا ۔ جبکہ ہم سرحد پار کر کے
نئے نئے یہاں آئے تھے اور رہنے سہنے کو یہ جھونپڑا اپنایا تھا ۔ اس وقت یہ پیڑ
اتنا سا تھا ۔ اور اب کافی اونچا ہو گیا ہے ۔ اس کی شاخیں صحن کے اوپر چھتری
کی طرح پھیلی ہوئی ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ اس میں پھولوں کی پہلی پھرن
اس کو لگانے سے سات سال بعد آئی تھی ۔ وہ پھول جو اس میں پہلی بار کھلے تھے

میرے دل میں ابھی تک کھلے ہوئے ہیں اور شاید جنم جنم تک کھلے رہیں گے۔ ان پھولوں سے میری محبت نے جنم لیا تھا۔ میں اس پیڑ کو بڑا ہی مقدس سمجھتا ہوں۔ اس کے پھولوں سے مجھے نجمہ کی مہک آتی ہے۔ یہ پیڑ میرے لئے بڑا ہی مقدس ہے۔ جیسے زرتشت کے لئے وہ شعلہ بڑا مقدس تھا۔ جس میں اس نے خدا کو دیکھا تھا۔ جیسے پاربتی کے لئے مہادیو کے بالوں کی وہ لٹ بڑی مقدس تھی جس سے گنگا کی دھارا بہتی تھی۔ جیسے رادھا کے لئے کنہیا کی مرلی کی وہ تان بڑی مقدس تھی۔ جس نے بندرابن کی کونج گلی میں رنگ رس کی لیلا رچائی تھی۔ برسات میں یہ پیڑ مولتا ہے تو اس کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک اس بستی کی بدبوؤں میں اجنبی سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنا جادو جگائے بغیر نہیں رہتی۔ اس کے ہولتے ہی کھانستی، کھنکارتی لہو تھوکتی اس بستی میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے۔ بھنائے ہوئے دماغ بڑا چین پاتے ہیں۔ اداسے ہوئے دل بہل جاتے ہیں۔ آنکھوں سے دور دور بھاگنے والی نیند مست ہو کر خود بخود چلی آتی ہے۔

ہمارے جھونپڑے کے عقب میں تھوڑی دور برگد کا پیڑ ہے۔ بہت پرانا اور بڑا ہی ڈراؤنا۔ دیو قامت۔ میں اسے بستی کا دیو کہتا ہوں۔ جس کی مونچھوں کے اور سر کے بال نیچے لٹک کر زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ جس کے بھاری بھرکم ڈالوں پر بیٹھے ہوئے گدھ اپنی چونچ کھول کر چیخا کرتے ہیں۔ نیچے جھونپڑوں میں لہو تھوکتے اور کھانستے انسانوں کو رہ رہ کر جھانکا کرتے ہیں۔ گھورا کرتے ہیں۔ اس دیو کے تانے پیٹے اور قد کاٹھ سے اس کی عمر دو سو سال سے اوپر ہی معلوم ہوتی ہے۔ بڑے انقلاب دیکھے ہوں گے اس پیڑ نے، مگر خود کسی

انقلاب کی زد میں نہیں آیا۔ کئی بستیاں اس کے سامنے اجڑ گئی ہونگیں۔ پھر آباد ہوئی ہونگیں۔ پھر اجڑ گئی ہونگیں۔ کئی لوگ آئے اور چلے گئے ہوں گے۔ مگر یہ جہاں تھا وہیں ہے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ چپ چاپ کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس بستی کا پہریدار ہے۔

اس پیڑ سے ذرا آگے پرانے وقتوں کی ایک بارہ دری ہے۔ کسی مغلیہ شہنشاہ کی یادگار۔ اس میں تہہ خانے ہیں۔ سرنگیں ہیں۔ سانپ ہیں۔ بچھو ہیں، اور کہتے ہیں وہاں بھوت بھی ہیں۔ ہوں گے۔ مگر انسان سب سے بڑا بھوت ہے۔ بھوتوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ پناہ گزین ان تہہ خانوں اور سرنگوں میں بھی جا گھسے ہیں۔ بھوت انہیں تنگ کرتے ہیں۔ بچھو اور سانپ انہیں کاٹتے ہیں۔ مگر جو زندگی کے زہریلے ڈنک کھا چکے ہیں کیا پرواہ کرتے ہیں۔ ایک زخم اور سہی۔ ایک ڈنک اور سہی۔ زہر کا ایک گھونٹ اور سہی۔ جاڑے کی سنسناتی راتوں میں بارہ دری کے کنگوروں میں چھپے ہوئے اُلو باہر نکل کر بولا کرتے ہیں۔ وہ اجاڑ چاہتے ہیں۔ اور انسان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث اجاڑوں میں بسنے پر مجبور ہے۔

اس بارہ دری سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نئی بنی ہوئی ایک عالیشان حویلی ہے، جس کا مالک انیس خاں ہے۔ وہ مہاجر نہیں مقامی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لوٹ کھسوٹ کی گنگا بہنے سے پہلے وہ گلی گلی کوچے کوچے منیاری بیچا کرتا تھا۔ اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ کچھ کر کے ایک مالدار اسامی بن گیا۔ اس بستی کا چوہدری بن گیا۔ نہ جانے وہ کیا کیا بن گیا۔ اس بستی کی

ہر پنچایت کا وہی پردھان ہوتا ہے۔ اس بستی میں بسنے والوں کے ہر جھنجھٹ ہر جھگڑے کا وہی فیصلہ کرتا ہے۔ تھانے میں اس کی بڑی عزت بنی ہوئی ہے۔ کُتے پالنے اور ٹی پارٹیاں کرنے کا اُسے بڑا شوق ہے۔ اپنی حویلی کا نام اُس نے رنگ محل رکھا ہوا ہے۔

رنگ محل کے پچھواڑے میں ایک درگاہ ہے۔ ایک مزار ہے۔ جسے گوندی پیر کا مزار کہتے ہیں۔ کیونکہ مزار پہ گوندی کا درخت اُگا ہوا ہے۔ ہر جمعرات کو قوالی ہوتی ہے۔ بھنڈارہ بٹتا ہے۔ مرادیں اور منتیں مانگی جاتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ بستی کی پچانوے فیصد آبادی اس مزار کی معتقد ہے۔ اس درگاہ کے مجاور کا نام سمندر سائیں ہے۔ سائیں جی واقعی کسی پرسکون سمندر کی طرح اوپر سے بڑے خاموش مگر اندر سے بڑے گہرے ہیں۔ کوئی پیندا کوئی تہہ نہیں ہے ان کی۔ اللہ لوگ ہیں اور ہر وقت اللہ لوگوں کی محفل لگائے رکھتے ہیں۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جبکہ دس پندرہ اللہ لوگ ان کے پاس بیٹھے چرس چانڈو نہ پی رہے ہوں۔ وہ سب کلیان سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کی اوٹ میں چھپے رہتے ہیں۔ تاکہ دنیادار انہیں دیکھ نہ لیں۔ بقول ان کے وہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز کو چھوڑ چکے ہیں۔ اپنوں اور پرایوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ہر شے فانی اللہ باقی۔ دنیا کا ہر شخص باعزت طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی محنت مزدوری کرتا ہے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ لیکن یہ اللہ لوگ صرف اللہ اللہ کرتے ہیں۔ روٹی انہیں اللہ کے پیارے دے جاتے ہیں، اور اگر نہیں تو نہ سہی۔ کیونکہ بال بچوں کو انھوں نے اللہ کے

سپرد کیا ہوا ہے اور ان کے لئے روحانی غذا چرس چانڈو ہی کافی ہے۔ اس کے بغیر روحانیت نہیں ملتی۔ خدا نہیں ملتا۔ جب تک نشہ نہ آئے خدا نظر نہیں آتا۔ خدا سے لو لگانے کے لئے چرس چانڈو کا کش لگانا بہت ضروری ہے۔

برسات کی وہ بھیگی بھیگی مہکی مہکی سانولی سی شام مجھے کبھی نہ بھولے گی جبکہ میری محبت نے مولسری کے پھولوں کی مہک سے جنم لیا تھا۔ متواتر دو دن ایک ہی رفتار سے برستے ہوئے بادل اس وقت تھم گئے تھے۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹپک رہی تھی اُن سے۔ اور چھتیں تھیں کہ بدستور ٹپک رہی تھیں۔ مضبوط مکانوں کو بھی بنیادوں سے ہلا دیا تھا اُس طوفانی بارش نے۔ ٹوٹے پھوٹے ڈھاروں اور جھونپڑوں کی تو بساط ہی کیا تھی۔ کئی جھونپڑے تنکا تنکا ہو کے بہہ گئے پانی کے ریلوں میں۔ کئی چھپروں کو تیز و تند ہوائیں کاغذ کے پرندوں اور دھجیوں کی طرح اڑا کے لے گئیں۔ کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے۔ ڈھاروں کے دھائیں دھائیں گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ زخمی ہو رہے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ لوگ ملبے تلے دبے ہوئے تھے۔ اک قیامت سی آ رہی تھی اُس بستی میں۔ فائر بریگیڈ اور کارپوریشن کے عملے کے لوگ بستی کے درد مند نوجوانوں کے تعاون سے مصیبت زدہ لوگوں کے لئے بڑا کام کر رہے تھے۔ ملبہ ہٹا کر نیچے دبے ہوؤں کو نکالا جا رہا تھا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ خطرناک مکانوں کے مکینوں کو ان کے ضروری سامان کے ساتھ کسی محفوظ مقام پہ پہنچایا جا رہا تھا۔ عجیب دردناک سماں تھا۔

میرا دل اس ناگہانی آفت کے خیال سے بڑا بوجھل ہو رہا تھا۔میں بڑا اداس سا تھا۔ میں بڑی تکلیف میں تھا۔ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ زیادہ ہلنے چلنے کی بھی ممانعت تھی۔مگر میں ایک جذبے کے تحت بستر سے اٹھ کر چل دیا۔بستی کے دوسرے دردمند اور حساس نوجوانوں کی طرح میں بھی مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبت میں کام آنا چاہتا تھا، مگر جھونپڑے سے باہر آتے آتے ہی میرا دم پھول گیا۔دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ ہیجانی کیفیت میرے لئے اچھی نہ تھی۔کثرت سگریٹ نوشی سے مجھے اختلاج قلب کا عارضہ ہو گیا تھا۔میں اپنا دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے دل پر کسی نے بوجھل پتھر رکھ دیا ہے۔ اور وہ اس کے نیچے تڑپ رہا ہے مجھے چکر آنے لگے۔ قریب تھا کہ بیہوش ہو کر زمین پر گر جاتا۔مگر مولسری کی مہک میں بسے ہوئے جھونکوں نے مجھے سنبھال لیا۔میرے دل کو بڑی تقویت دی۔ میرے الجھے الجھے سانس ذرا درست ہوئے۔اور پھر رفتہ رفتہ دل کا بوجھ کم ہوتا چلا گیا۔دل اپنی ٹھیک رفتار پر آ گیا، اور میرا سانس بھی بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اتنے میں سفید داڑھی والے ایک بزرگ بڑی پریشانی میں میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔

"ہم لوگ وہاں ایک جھونپڑے میں رہتے ہیں۔جو بارش کی مار سے بس گرنے ہی والا ہے۔ہم لوگ خطرے میں ہیں۔اگر آپ اجازت دیں تو یہاں آپ کے ڈیرے میں آ جائیں۔"

"بڑی خوشی سے۔" میں نے جواب دیا۔"آپ اس جگہ کو اپنی ہی جگہ سمجھیں۔"

وہ شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی مستورات کو لے آئے
۔ بولے ۔

"آپ انھیں اندر بٹھائیں ۔ میں جلدی سے چند ضروری چیزیں نکال لاؤں
سارا سامان تو نکالا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ نکل آئے غنیمت ہے ۔ چھت کا شہتیر
کڑک رہا ہے۔ بس گرا کہ گرا ۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر چلے گئے ۔ میں نے ان کی عورتوں کو کمرے میں اپنی والدہ
کے پاس بٹھا دیا۔ وہ اندھی ہیں ۔ مدت سے اپنی بینائی کھو چکی ہیں ۔ مگر ان کے
دل کی آنکھیں روشن ہیں ۔ وہ بڑی رحمدل ہیں ۔ بڑی خلیق ہیں ۔ کسی کو مصیبت میں
دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہیں ۔ ان عورتوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان کے ساتھ گھل
مل کر یوں باتیں کرنے لگیں ۔ جیسے وہ کوئی عزیزہ تھیں ۔ تھوڑی دیر میں وہ بزرگ
ایک صندوق اور اس کے اوپر گٹھری سر پر رکھے ہوئے آ گئے ۔ اور بارش پھر
شروع ہو گئی ۔ پہلے سے بھی تیز ۔ برستے پانی کی جھنکار سن کر رونگٹے کھڑے
ہونے لگے ۔ بڑے میاں نے بڑی جلائی اور میرے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر
کی باتیں کرنے لگے ۔ اور پھر انھوں نے اپنی باتیں شروع کر دیں ۔ وہ اپنی آپ
بیتی سنانے لگے ۔ اپنی زندگی کی کہانی ۔ اور میں بڑے غور سے سننے لگا ۔ میں ہر
کہانی کو بڑے غور سے سنتا ہوں ۔ اس لئے کہ مجھے اچھی کہانیوں کی ہمیشہ تلاش
رہتی ہے ۔ میں دھرتی پر بہتے ہوئے انسانوں کے سمندر کے ساحل پر کھڑا ان کے
دُکھ سُکھ کے جوار بھاٹوں کا انتظار کیا کرتا ہوں ۔ جوار بھاٹے آتے ہیں تو بہت
سی کہانیاں ان کے ساتھ ساحل پر آتی ہیں ۔ میں ان کہانیوں کو سیپ سمجھ کر موتی

سمجھ کر چن لیتا ہوں۔ ریت سے کھیلتی ہوئی جھاگ کو ٹٹولا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی بڑا ہی عجیب عنوان مجھے مل جایا کرتا ہے اپنی کسی کہانی کے لئے ریت اور جھاگ سے۔ سمندر اور ساحل دونوں بڑے پُراسرار ہیں۔

میں ایک قلمکار ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔ کہانیاں بیچتا ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ صبح ہوتے ہی میں اپنی کہانیوں کو اپنی زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیس میں رکھ کر گھر سے نکل جاتا ہوں۔ گلیوں اور بازاروں میں ہانکے دیتا پھرتا ہوں۔ "کہانیاں لے لو۔ کہانیاں لے لو۔" میں اپنی کہانیوں کے خریدار ڈھونڈتا ہوں۔ مگر مجھے میری مرضی کے خریدار نہیں ملتے۔ ان کی پوری قیمت ادا کرنے والے گاہک مجھے کہیں نظر نہیں آتے۔ میری زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیس میں نئی کہانیاں بھی ہیں اور پرانی کہانیاں بھی۔ تازہ کہانیاں بھی ہیں اور باسی بھی۔ میرے نزدیک باسی کہانیاں وہ ہیں جو میں نے بڑی مدت سے لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن ابھی تک نہیں بکیں۔ وہ انمول کہانیاں ہیں۔ خریدار ان کی قیمت سن کر ڈر جاتے ہیں۔ اور مجھے میرا افلاس، میری غربت، میری بھوک ڈراتی رہتی ہے۔ میں ان بازاروں کے دوراہوں، چوراہوں اور موڑوں پہ رک کر ذرا دم لیتے ہوئے سوچا کرتا ہوں۔ میں قلمکار کیوں بن گیا؟ برف میں لگے ہوئے رسگلے اور آئس کریم بیچنے والا کیوں نہ بنا؟ موزے، دستانے، ٹوپیاں اور بوٹ بیچنے والا کیوں نہ بنا؟ کہانیاں لوگ کم خریدتے ہیں اس لئے کہ انہیں کھایا، پیا اور پہنا نہیں جا سکتا۔ یہ تو محض مطالعہ کی چیزیں ہیں۔ انہیں صرف پڑھا جا سکتا ہے اور پڑھنے کے لئے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ انسان۔ حیوان۔ درخت۔ پتھر جنہیں مفت پڑھا جا

سکتا ہے۔ مگر ہر شخص انسانوں، حیوانوں، درختوں اور پتھروں کو نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہر شخص فطرتاً داستان گو ہے۔ ہر شخص کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ کہانیاں سُنا سکتا ہے۔ کہانیاں بنا سکتا ہے۔ یہ سب سے آسان فن ہے۔ کہانی کہانی ہی تو ہے۔ ہر چیز کو کہانی بنایا جا سکتا ہے۔ ہر چیز کی کہانی بن سکتی ہے۔ ہر چیز ایک کہانی ہے۔ آنکھیں موندے چوک کے بیچ دھرنا مار کر بیٹھا جگالی کرتا، کان ہلاتا بوڑھا سانڈ بھی ایک کہانی ہے۔ گندے پانی سے پیاس بجھانے والا زبان باہر لٹکائے، ہانپتا، ہونکتا، بھونکتا نالی کی طرف بھاگتا خارش زدہ کتا بھی ایک کہانی ہے۔ اپنے چہرے اور چھاتیوں کو لانبے لانبے چیکٹ بالوں سے چھپائے، اپنے ننگے بدن کو اکٹھا کئے، کوڑے کی ڈھیری پر جھک جھک کر خالی ڈونے اور پتر چاٹتی پاگل عورت بھی ایک کہانی ہے۔ کتابیں اٹھائے، ٹیڈی لباس میں بس سٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑی سیب کے رخساروں اور نیلے ریشم کی آنکھوں والی کوئی لڑکی بھی ایک کہانی ہے۔ سڑک کو لکڑی کی ٹانگ سے ٹھکورتے ہوئے، آتے جاتے راہ گیروں سے بھیک مانگنے والا مبروص بھکاری بھی اک کہانی ہے۔ کسی اونچی عمارت کی چوٹی پہ اوولٹین اور خاندانی منصوبہ بندی کا جلتا بجھتا سائیکو سائن جہازی سائز کا بورڈ بھی اک کہانی ہے۔ دونوں ہاتھ پھیلائے فٹ پاتھ پر چت لیٹے ہوئے کوڑھی کے پیپ سے بھرے ہوئے متعفن زخم اور ان پر بھنبھناتی مکھیاں بھی ایک کہانی ہیں۔ بڑے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے یہ بہت سے لوگ کفن میں لپٹی ہوئی ایک کہانی ہی چارپائی پہ اٹھائے لئے آتے ہیں۔ باجوں کے شور اور براتیوں کے

ہجوم میں گھوڑے پر یہ ایک کہانی ہی سہرا باندھے بیٹھی ہے ۔ نعمت کدہ کی دیوار سے لٹکتا ہوا مرغ مسلّم کا بورڈ ۔ اس کے سامنے شوکیس کے اندر لمبی سی سیخ میں پروئے ہوئے مرغ بریاں ۔ چینی کے خوشنما برتن ۔ خانسامے ۔ قورمہ و بریانی کی بھوک کو تیز کرنے والی خوشبو ۔ ٹاور میں لگا ہوا لاؤڈ سپیکر اور کلاک بھی ایک کہانی ہے ۔ اس کے ہندسے ۔ گھنٹے ۔ منٹ ۔ سکینڈ ۔ سوئیاں ۔ سائے ۔ وقت کا یہ جنتر منتر ۔ اندھیرے اجالے ۔ دن رات ۔ یہ سب سالوں ۔ صدیوں ۔ آتی جاتی رتوں اور بدلتے زمانوں کے چکر میں گھومتی ہوئی کہانیاں ہی تو ہیں ۔ صبح سے شام تک انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں ایک نہیں کئی کہانیاں ہوتی ہیں ۔ اگر کوئی کہانی پڑھنے کو دل چاہے تو انسان جو کچھ کرے اُسے کہانی سمجھ کر پڑھ لیا کرے ۔ مول لے کر کہانیاں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اور میری کہانیوں کے کاغذی کردار ۔ میری غربت ، میری بھوک میں چھپا ہوا نقاد کہتا ہے ۔ ان کاغذی کرداروں ہی میں گھوم پھر کر ، بول چال کر ، ہنس رو کر سو جاتے ہیں ۔ یہ جاگتے کم ہیں اور سوتے زیادہ ہیں ۔ یہ نیند کے ماتے ہیں ۔ یہ لوٹس ایٹر ہیں ۔ بالکل مٹھس ہیں ۔ بیکار ہیں ۔ مردہ ہیں ۔ مجھے انہیں زندہ کرنا چاہیئے ۔ میرے افلاس ، میری غربت میں چھپا ہوا نقاد مجھ پر کڑی تنقید کیا کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے ایک تم ہی نہیں کہانیاں لکھنے والے اور بھی ہیں ۔ تم کہتے ہو میں ایک کہانی ایک افسانہ نہیں لکھتا اپنے خیالوں کے رنگوں سے ایک تصویر کھینچتا ہوں تمھیں اپنی نقاشی و مصوری پر بڑا ناز ہے ۔ تم اپنے آپ کو ایس میاتا ۔ جدد جوسلے ۔ تنتورتو ۔ آندرے بوشاں ۔ ریمبراں ۔ بردگھل ۔ دہ دنا تیلو ۔ فرا انجیلا ۔

آندرے دوغیں۔ پیٹر بلوم۔ موڈی لیآنی۔ رادل ڈوفی۔ سیورا۔ پالوآن۔ پبلو پکاسو۔ یوجین برمن۔ بوٹی چلی۔ پال ملنار۔ نیورا اور لیونارڈ ڈاونچی سمجھتے ہو۔ مگر تم لغلول ہو۔ بدصو ہو۔ ایک بہت بڑے چُغد ہو۔ زندگی کے خون سے کہانیاں اور افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام لال سیاہی سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایسی تصویریں بنانے کے لئے ریویز اور ڈریکو کے واٹر کلر اور آئیل کلر استعمال کرو۔ امپریشن ازم۔ ریئل ازم تکنیک۔ آرٹ یہ سب بکواس ہے۔ اس گول مارکیٹ میں سب کچھ چلتا ہے۔ کھوٹا کھرا سب کچھ چلتا ہے۔ تم جس سویرے کا انتظار کر رہے ہو اک چھل ہے۔ فریب ہے۔ دھوکہ ہے۔ دھرتی پہ اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو ان اندھیروں میں چلنا سیکھو۔ میری غربت، میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد مجھ پہ کڑی نکتہ چینی کرتا ہے۔ بڑے کمزور ہیں تمہاری کہانیوں کے کاغذی کردار۔ اعصاب زدہ ہیں۔ سرطان زدہ ہیں۔ ان کے اندر بھی سرطان کی بستیاں آباد ہیں۔ ان کے چہروں پر بھی چیچک اور کوڑھ کے داغ ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ تمہاری کہانیوں کے کاغذی کردار کھانستے ہیں۔ لہو تھوکتے ہیں۔ انیمیا کے مریض ہیں۔ دق کے مریض ہیں انہیں صحت مند بناؤ۔ ٹانکیں کھلا کر ان میں طاقت پیدا کرو تاکہ یہ اپنا کاغذی کفن پھاڑ کر اتنی بڑی دنیا کے اتنے بڑے دائرے میں کود پڑیں۔ اگر کودنے کی جرأت نہیں رکھتے تو ان کاغذوں کے پیرا شوٹ بنا کر نیچے اتر آئیں۔ اور دیکھیں کہ کس زاویے میں ان کی زندگی ندریں ہو سکتی ہے۔ کن فریموں میں ان کی خواہشوں کی تصویریں فٹ آتی ہیں۔ کاغذ کے ان پتلوں میں کوئی تحریک، کوئی ہلچل، کوئی حرکت،

کوئی جنبش پیدا کرو۔ دن رات بت بنے بیٹھے سوچتے سوچتے کیا پاگل ہو جاؤ گے؟
اتنا نہ سوچا کرو۔ کہانیاں لکھنے کے لئے اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں۔ پیگوڈا کی شکل
کی ایک کوٹھی میں رہتے ہوئے ہری چھال۔کے کیلے کھانے اور موسمیوں
کا جوس پینے والے بلڈ پریشر کے مریض ادھیڑ عمر کے اُس عورت نما شخص کو
دیکھو جس کے متعلق تمہارے ایک دوست نے تمہیں یہ کہانی سنائی تھی کہ بیک
وقت وہ بہت سے کام کرتا ہے۔ بیک وقت وہ مصور بھی ہے، موسیقار
بھی ہے۔ ریڈیو اور موٹر میکینک بھی ہے۔ کچھ لوگ اُسے ہکی ماؤس ٹیکنی کلر
فلم سمجھتے ہیں۔ وہ مصنف بھی ہے۔ ملٹی مین ہے وہ۔ بیک وقت وہ
بہت سے کام کرتا ہے۔ اور ان میں ایک کام کہانیاں لکھنا بھی ہے۔ کہانیاں
لکھتے وقت وہ بالکل نہیں سوچتا۔ بس دھڑا دھڑ تیز گام کی رفتار سے لکھتا چلا
جاتا ہے۔ کہانیاں۔ افسانے۔ ڈرامے۔ اور نہ جانے کیا کچھ یعنی سب، کچھ۔
وہ اگر ایک افسانے میں دو سو جملے لکھتا ہے تو سو جملے ان میں بالکل غلط، بے
معنی، بے ربط ہوتے ہیں۔ ان میں املا کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مگر چھاپنے
والے اُسے چھاپتے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے اُسے پڑھتے چلے جاتے
ہیں۔ کیونکہ وہ سوچ کر کہانیاں نہیں لکھتا۔ بس لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سب
کچھ کسی فن کے تحت نہیں فارمولے کے تحت لکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے یہ سمجھ
لیا ہے کہ زندگی میں فن سے زیادہ فارمولوں کی ضرورت ہے۔ کہانیاں لکھنے
اور انہیں بیچنے کے لئے سوچنے سے کہیں زیادہ ان کے سنار یو کو سمجھنے کی
ضرورت ہے۔ سونے چاندی کے چکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ روٹی پانی کے

چکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ اس زندگی میں بس چکر ہی چکر ہیں چین نہیں ہے ۔ یہ زندگی علی بابا کے چالیس چوروں کا غار ہے ۔ بند سم سم ہے ۔ اس سم سم کو کھولنے کے لئے سوچنے سے کچھ نہ ہوگا ۔ سوچنے سے یہ سم سم نہیں کھلنے کا ۔ اسے کھولنے کے لئے سراغ لگانا پڑے گا ۔ سرنگ لگانا پڑے گی زندگی کی اس دیوار چین میں جسے میں اور میری طرح کے کئی یاجوج و ماجوج رات ہوتے ہی چاٹنا شروع کرتے ہیں لیکن صبح ہونے تک وہ جوں کی توں موجود ہوتی ہے ۔ تم بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرو ۔ میری غربت ۔ میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد کہتا ہے ۔ اپنی کہانیوں کے کاغذی کرداروں کو بلیکیئے، سمگلر اور سکینڈل ساز بناؤ پھر تمہارے لئے بنگلو، بنک بیلنس، تمہاری زندگی اور مستقبل خود بخود بن جائے گا ۔ زندگی بنانے کے لئے اس چکر میں کہانیاں نہیں چلتیں سکینڈل چلتے ہیں ۔ اگر تم کوئی سکینڈل نہیں چلا سکتے تو بس سمجھ لو کہ تم کسی ٹوٹی پھوٹی موٹر کا ہینڈل ہو جو کہ جام ہو چکا ہے ۔ بیکار ہے ۔ بالکل کوئی کام نہیں کر سکتا ۔ اور میں اس بیباک منہ پھٹ نقاد کی کڑی تنقید سے بوکھلا جاتا ہوں ۔ گھبرا جاتا ہوں ۔ کیونکہ میری کہانیوں کے کردار تو ریفارمر ہیں ۔ ریفیوجی ہیں ۔ ناہموار راستوں پر انہیں چلنا نہیں آتا ۔ وہ کسی شخصیت کا کوئی ریڈی میڈ بہروپ بدلنے کو تیار نہیں ۔ وہ کوئی سوانگ بھرنا نہیں چاہتے ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میری کہانیاں پسند نہیں کی جاتیں ۔ ان میں برف میں لگے ہوئے رسگلوں اور آئس کریم کا مزہ نہیں ہے ۔ ان میں دستانوں اور موزوں کی نرماہٹ اور گرماہٹ نہیں ہے ۔ ان سے سرا ور پاؤں کی وہ آرائش نہیں ہو سکتی جو ٹوپی اور بوٹ سے ہو سکتی ہے ۔ میری غربت ، میری بھوک میں چھپا ہوا نقاد

مجھ سے کہتا ہے۔ کہ تم ان کاغذوں کے کپڑے اور موزے دستانے بناؤ۔
ایک کنٹوپ بناؤ۔ اُسے اپنے سر پر رکھ لو۔ کاغذ کے کپڑے اور موزے دستانے
پہن کر اس چوراہے میں چورن بیچا کرو۔ مینگوسکوئیس بیچا کرو۔ پھر شاید ان
راہ گیروں میں تمھیں دیکھ کر کوئی ہلچل پیدا ہو جائے۔ اور تمہاری زندگی کی رُکی
ہوئی مشین پر سے غربت و افلاس کا زنگ اُتر جائے۔ اور وہ چلنے لگے۔
کرنسی نوٹ چھاپنے لگے۔ اس تیز نقاد کی تنقید میرے مزاج کو بڑا تیز کر دیا
کرتی ہے۔ سارا دن ٹانگیں بے فائدہ چلاتے چلاتے تھک کر، مایوس
ہو کر جب میں گھر لوٹتا ہوں تو سودا بیچ کر کب سے فارغ بیٹھے ہنستے اور
ماہیا گاتے ہوئے چھابڑی فروشوں کو دیکھ کر میرا دل رونے لگتا ہے۔ اور مجھے
یہی مشورہ دیتا ہے کہ کہانیوں کے اس ٹوکرے کو یہیں چوراہے میں رکھ کر جلا دو۔
اور جب شعلے اٹھیں تو ان میں کود کر تم بھی خودکشی کر لو اور میں ایسا کرنے پر
تیار ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک ان دیکھی۔ انجانی۔ میرے اندر چھپی ہوئی کوئی چیز مجھے
آواز دیتی ہے۔ للکارتی ہے۔

"ایسا نہ کرنا۔ ان اندھیروں میں سویرا ہو چکا ہے۔ اب تم اندھیرے
میں نہ رہو گے۔ کوئی بھی اندھیرے میں نہ رہے گا۔ غربت و افلاس کا
سالوں پرانا روگ یکدم تو نہیں جائے گا۔ کچھ وقت لگے گا۔ اس روگ
کا مناسب علاج شروع ہو چکا ہے۔ ہوا سے لہلہاتے گندم کے
کھیتوں، دھان کے کھیتوں کا لاکھوں ٹن اناج اب زمین دوز ذخیروں
میں نہیں جائے گا۔ رات کے سناٹوں میں سرحدوں سے پار نہیں پہنچے گا۔

اس ملک کی منڈیوں میں آنے لگا۔ اور بڑا سستا بکے گا۔ اناج سے
بھرے ہوئے یہ سنہری خوشے، یہ سنہری بالیاں اب کال نہیں خوشحالی
پیدا کریں گی۔ اس کا مناسب انتظام ہو رہا ہے۔ ہر فنکار، ہر دستکار
ہر صنعت کار، ہر انسان کی خوشحالی کے لئے بڑے اونچے پلان
سوچے جا رہے ہیں۔ منصوبے عمل میں آ رہے ہیں۔ تمہارے
اچھے دن آ رہے ہیں۔ اپنے ماضی سے منہ موڑ کر اپنے مستقبل
کو دیکھو۔ تمہارا مستقبل بڑا درخشاں ہے۔ مطمئن رہو۔ تمہیں تمہاری
محنت کا صلہ ملے گا۔ ضرور ملے گا۔ تمہارے شاہکار، تمہارے
شہ پارے، تمہاری کہانیاں جن میں تم نے ان اندھیروں میں روشنی
کرنے کے لئے اپنے لہو کے چراغ جلائے ہیں، بڑی عزت و احترام
سے دیکھی جائیں گی۔ تمہاری کہانیاں مردہ نہیں زندہ ہیں۔ انہیں لوٹس
ایٹر نہ کہو یہ لوح و قلم پر تحریر ہو چکی ہیں۔ انہیں شعلوں میں جلانے کی
کوشش نہ کرو۔ ان کا ایک ایک لفظ بڑا مقدس ہے۔ انہیں زندہ
رہنے دو۔ اور خود بھی زندہ رہو۔ آنے والا وقت تمہارے اعزاز میں
ایک اعلان کرنے والا ہے۔"

یہ آواز مجھے ہر بار روک لیتی ہے۔ مجھے اپنی کہانیوں اور ان کے کاغذی کرداروں
کا قتل عام نہیں کرنے دیتی۔ مجھے اپنی کہانیوں کے کاغذی کرداروں کو آگ نہیں لگانے
دیتی۔ مجھے کچھ نہیں کرنے دیتی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے درخشاں مستقبل کے
سپنے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیونکہ میں ڈریمر (DREAMER) ہوں۔ ڈریمر۔

سپنوں کا متوالا۔ دن کے اُجالے میں بھی اور رات کے اندھیرے میں بھی سپنے دیکھنے والا۔ میری کہانیاں میرے سپنوں ہی سے جنم لیتی ہیں۔ اور میرے سپنے اُس ماحول سے اور ان انسانوں سے جنم لیتے ہیں جن میں مجھے رہنا ہے۔ میں اپنے سپنوں کی عکاسی کرتا ہوں۔ اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہوں۔ اُس میں بسنے والے انسانوں کی عکاسی کرتا ہوں۔ فرصت کے وقت میں اپنی گہری سوچوں کو ساتھ لیے اپنے سپنوں کے پیچھے آوارہ پھرا کرتا ہوں۔ سب سے الگ تھلگ، چپ چاپ کچھ سوچتے ہوئے اپنے سپنوں کے ساتھ ساتھ اندھیروں اور اجالوں میں بہت دور نکل جانا میری ہابی ہے۔

سپنوں کی بستی ہے میری زندگی۔ میری زندگی۔ میری ڈریم لینڈ جس پر میری سوچوں کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ جس کی ہر چیز کُہر میں لپٹی ہوئی ہے۔ جس میں ہر وقت دھندلی دھندلی دھواں دھواں سی سلگتی شام کا سماں ہوتا ہے۔ جس میں سورج اور ستارے بہت کم چمکتے ہیں۔ جس میں اجالا کم اور اندھیرا زیادہ ہے۔ اگر ان اندھیروں میں میرے سپنوں کے جگنو نہ جگمگائیں تو میں اور میری کہانیاں شاید ایک پل بھی نہ جی سکیں۔ ان سپنوں کا جگمگانا ہی میری اور میری کہانیوں کی زندگی ہے۔ جب میں نے پہلے پہل نجمہ کو دیکھا تھا تو وہ بھی مجھے ایک سپنا ہی معلوم ہوئی تھی۔

نجمہ ———— نجمہ ————

یہ بڑے میاں کی بیٹی کا نام تھا۔ وہ اُس دن باتوں ہی باتوں میں میرے ساتھ اتنے مانوس ہو گئے۔ اتنے گھُل مل گئے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی

کو میرے سامنے ایکسپوز کر دیا۔ نبی بخش تھا ان کا نام۔ وہ رنگ ساز تھے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹے مر چکے تھے۔ بیٹیاں زندہ تھیں۔ نجمہ اور رخسانہ۔ نجمہ دسویں جماعت پاس تھی۔ اور رخسانہ نے پانچویں جماعت پاس کر کے سکول چھوڑ دیا تھا۔ وہ عمر میں نجمہ سے چھوٹی تھی۔ دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑے میاں اپنی زندگی کے سب سے بڑے قرض سے فارغ ہونے کی بڑی کوشش کر رہے تھے۔ بڑھاپے میں بھی دن رات کام میں لگے رہتے تھے۔ دن کو رنگسازی کرتے اور رات کو فرصت میں تصویریں بناتے۔ انہیں بیچتے۔ یہ ان کا سائیڈ بزنس تھا۔ انہیں اپنی دونوں بیٹیوں کا جہیز بنانا تھا۔ شاید اسی احساس فرض نے اُن میں اتنی توانائی پیدا کر دی تھی کہ دن رات کام کرتے نہ تھکتے تھے۔

اس بستی میں آنے سے پہلے بڑے میاں شہر سے بڑی دور ایک بستی میں رہتے تھے۔ اپنے کام کاج پر شہر آنے کے لئے انہیں ہر روز بس پر بڑا لمبا سفر کرنا پڑتا۔ ساٹھ ستر پیسے آنے جانے میں کرائے میں اٹھ جاتے۔ اسی دُکھ سے اُنھوں نے کاروباری سلسلے میں اس شہر کو چھوڑ کر جاتے ہوئے شبراتی کباڑیئے سے یہ جھونپڑا سو روپے میں مول لے لیا۔ جان پہچان ہونے کی وجہ سے شبراتی نے اُن سے لاگت ہی لی تھی پگڑی نہ لی تھی۔ اچھا سودا ہو گیا۔ وہ ہر روز اتنی دور سے آنے جانے کے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ شہر کے بالکل قریب ہی جیسا کہ وہ چاہتے تھے انہیں رہنے سہنے کو جگہ مل گئی۔ ورنہ مکانوں کی قلت کی وجہ سے شہر میں کہیں کوئی خالی مکان کوئی کوٹھری، کوئی کھولی

مل جانے کا مسئلہ تو ایک مدت سے ایک بہت بڑی مصیبت بنا ہوا ہے۔ جو ابھی تک حل ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اور پھر پگڑی لینے دینے کا رواج تو ایسا چل نکلا ہے کہ ہم لوگوں کا تو ذکر ہی کیا پلّے والے لوگوں کی پیچدار پگڑی بھی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں کی بات نہیں پگڑی لینے والے ہزاروں کی بات کرتے ہیں۔

وہ رات ہم نے باتیں کرتے ہوئے ہی گزار دی۔ صبح ہوئی۔ طوفانی بارش بند ہو چکی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج نکلا تو بڑے میاں اپنا جھونپڑا دیکھنے نکلے۔ واپس لوٹے تو بہت پریشان نظر آئے۔ ان کا جھونپڑا گر گیا تھا۔ سامان ملبہ پڑنے سے کچھ تو ٹوٹ پھوٹ کر بالکل بیکار ہو گیا تھا اور کچھ پانی میں بہہ کر نہ جانے کدھر نکل گیا۔ بڑی پریشانی کی بات تھی۔ بڑے میاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ کل چار دن اس جھونپڑے میں انہیں رہنا ملا۔ اور پھر بارش کا طوفان آ گیا۔ روپیہ بھی گیا اور جھونپڑا بھی گیا۔ ان کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے۔

”سلیم صاحب جب تک ہمارے رہنے سہنے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا ایک کمرہ ہمیں دے دیں۔ بڑی مہربانی ہو گی آپ کی۔ ہم کرایہ دیں گے۔“

”کرائے کی کوئی بات نہ کریں آپ۔“ میں نے کہا۔ ”میں اماں جی سے بات کرتا ہوں۔ اگر وہ ہاں کر دیں تو بس ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات اور ہے۔“

"جی کیا بات ؟" بڑے میاں یکدم چونکے اور بیڑی سلگاتے ہوئے بولے
"ہمارے پاس صرف تین کمرے ہیں ۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے
کہا ۔ "ایک کمرے میں تو سامان کچھ بھرا ہوا ہے ۔ تل دھرنے کو جگہ
نہیں ہے ۔ دوسرے کمرے میں ہم لوگ سوتے ہیں ۔ کل دو چارپائیوں کی جگہ
ہے اس میں تیسری نہیں بچھ سکتی ۔ رہا تیسرا کمرہ تو یہ میرے مطالعے کا کمرہ ہے ۔
میرا نشانتی نکیتن ۔ اس کمرے میں بیٹھ کر میں کہانیاں لکھا کرتا ہوں ۔ اپنے سپنوں
کی تصویریں بنایا کرتا ہوں ۔ مگر یہ کمرہ کچھ چھوٹا ہے ۔ تنگ ہے ۔ کیا آپ
کے لئے کافی ہو گا ؟"

"جی ہاں کافی ہو گا اگر آپ کا دل تنگ نہ ہو ۔" بڑے میاں نے مسکرانے
کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔

"جی نہیں ۔ میرا دل بڑا وسیع ہے ۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب
دیا ۔

"بس تو پھر ہمارا سامان ہی کیا ہے ۔ اور ہم کتنے ہیں ۔ کل چار بندے ۔ بخوبی
گزارہ ہو جائے گا ۔ وقت ہی گزارنا ہے گزر جائے گا ۔"

"میں اپنے پڑھنے لکھنے کا سامان اٹھا کر سونے والے کمرے میں لے
جاؤں گا ۔ آپ کے لئے اور جگہ خالی ہو جائے گی ۔ میرا مطلب ہے آپ کی
چارپائی کے لئے بھی جگہ نکل آئے گی ۔" میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا ۔

"اجی کیا ضرورت ہے اتنی تکلیف کرنے کی ۔ آپ سے کیا پردہ ہے ۔
میں آپ کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں ۔ بیشک ہم ہیں بیٹھ کے اپنا کام کیجئے ۔ کیا ضرورت

ہے اپنے پڑھنے لکھنے کا سامان اٹھانے کی۔ میری چارپائی کے لئے جگہ کا آپ کچھ خیال نہ کریں۔ درویشوں کا کیا ہے۔ زمین پر ہی بوریا بچھالیں گے۔ آخر کو اس زمین میں ہی سمانا ہے۔ اور سنیئے "

" جی فرمایئے ؟"

" میں بھی تصویریں بنایا کرتا ہوں "

" اچھا "

" جی ہاں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دو مصور "

" جی ہاں خوب گذرے گی "

" جلدی جایئیے اب اپنی والدہ سے پوچھیں کیا کہتی ہیں " بڑے میاں نے نئی بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

میں نے ساتھ والے کمرے میں جاکر اپنی والدہ سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ بولیں ۔۔

" تم کام پر چلے جاتے ہو تو میں یہاں اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ میرے پاس رونق ہو جائے گی۔ اور دیکھو ان سے کرایہ نہیں لینا۔ جب تک ان کا جی چاہے گزر بسر کریں۔ ہمیں کرایہ نہیں چاہیئے۔ خدا دیتا ہے کھاتے ہیں۔ ان کے پیسوں سے ہم نے کونسا رنگ محل بنا لینا ہے۔ اس کی دی ہوئی یہ کٹیا ہی کافی ہے "

مگر اس کٹیا میں ایک رنگ محل ایک تاج محل بن کر ہی رہنا تھا۔ اور بن گیا۔ جس کی بنیاد نجمہ نے رکھی۔ اور پہلی اینٹ بھی اُسی نے لگائی۔ پیار کی ابتدا اُسی نے

کی۔

تجمہ ______

اکیس بائیس سال کی نازک بدن ایک خوبرو لڑکی۔ جس کی رنگت مولسری کے پھول سی تھی۔ خدوخال ترشے ہوئے۔ میڈونا فیس۔۔ جب وہ گردن جھکائے کشیدہ کاڑھنے یا روٹی پکانے میں لگی ہوتی تو یہی معلوم ہوتا کہ سائیکی آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے۔ گھریلو مصروفیتیں اس کے خدوخال میں ایک عجیب سی کشش پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کی مخمور آنکھیں عمر خیام کی دو رباعیاں تھیں، جن کو دیکھتے ہی مجھے سرور ہو گیا۔ اور میں بن پیئے جھومنے لگا۔ اُس نے مجھے ایک نیا جنم نیا وجود دیا۔ اس کے شاعرانہ حسن میں جادو تھا۔ اس نے میرے اندر چھپے ہوئے برفانی آدروں میں آگ لگا دی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہ کی تھی۔ میرا جنسی وجود لکڑی کا، لوہے کا، پتھر کا، برف کا بت تھا۔ حرکت و حرارت سے خالی۔ ایک بہت بڑا گلیشیر جو صنوبر کے سایوں میں گھری ہوئی کسی جھیل کی سطح پر جما ہوا ہو۔ اور پھسلنے یا پگھلنے کا نام ہی نہ لیتا ہو۔ کئی اچھی لڑکیاں خود بخود میرے راستے میں آئیں۔ اور اس جھیل میں جھانک جھانک کر کھلے ہوئے کنول تلاش کرتی رہیں۔ مگر کچھ نظر نہ آیا انہیں۔ گلیشیر سے سطح ڈھکی ہوئی تھی۔ مگر جب نجمہ نے جھانک کر دیکھا تو گلیشیر پگھل گیا۔ پارہ پارہ ہو گیا اور اس کے نیچے چھپے ہوئے کنول اوپر ابھر آئے۔ مہکنے لگے۔

مجھے نجمہ کے ساتھ محبت ہو گئی۔ میں نے اس کی محبت میں کئی افسانے۔ کئی کہانیاں لکھیں۔ اس کے نام کو اپنے ہر سانس کا وظیفہ بنا لیا۔ بڑی ذہین تھی وہ۔

تعلیم تو کوئی خاص نہ تھی اس کی مگر مطالعہ اس کا بڑا وسیع تھا۔ پنجابی ہوتے ہوئے اردو اس کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ انگریزی میں بھی کسی حد تک بات چیت کر لیتی تھی۔ اور اس دن تو میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جبکہ اس نے مجھے اپنی ایک رباعی دکھائی۔

وہ چولہے کے قریب چاندنی بیٹھی تھی۔ چاول پکا رہی تھی۔ رخسانہ اپنے دوپٹے میں لچکا لگا رہی تھی۔ بڑے میاں سلگتی بیڑی ہونٹوں میں دبائے جنگل میں ناچتے مور کی تصویر بنا رہے تھے۔ اور ان کی بیوی ساتھ والے کمرے میں میری والدہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ نجمہ مجھے دیکھ رہی تھی مگر یوں جیسے مجھے نہیں دیکھ رہی۔ نہ جانے کیسے دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہی ہے۔ میری نظروں نے بھی اس کی نظروں کے وہ انداز، وہ زاویے چرا لیے۔ میں بھی اُسے یوں دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے نہیں دیکھ رہا۔ نہ جانے کیسے دیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہا ہوں۔ ٹیلی پیتھی اندر ہی اندر کام کر رہی تھی۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ محبت کی مقدس آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ مگر نجمہ میں اس کی آنچ زیادہ تھی۔ اُسے میرے ساتھ بے انتہا پیار تھا۔ یہ اندازہ مجھے اس کی اُس نظر سے ہوا جو اچانک اس کا دوپٹہ رخسار سے سرکتے ہی مجھے جھونکے کی طرح چھو کر آگے نکل گئی۔ اور گنگناتے ہوئے میرے کانوں میں کچھ کہہ گئی۔ جسے میں نے نہیں میری روح نے سُنا اور وہ بھی گنگنا اٹھی۔ اتنے میں نجمہ کی ماں بھی آ گئی۔ بڑے میاں کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ بڑا پیار کرتے تھے اپنی بیگم سے۔ بیڑی منہ سے نکال کر باتوں کے

پتنگ اڑاتے ہوئے اپنی بیگم کے ساتھ پیچ لڑانے لگے۔ اسی اثنا میں مجھے نہ جانے کس جذبہ کے تحت اپنی جگہ سے اٹھ کر سہمی سہمی جھکی جھکی میرے پاس آئی۔ نظریں جھکا کر چپکے سے بولی۔

"یہ رباعی میں نے آج ہی کہی ہے۔ اصلاح چاہتی ہوں۔"

وہ کاغذ کا ایک پرزہ میرے سامنے میز پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ جیسے بہار کا ایک مہکا مہکا جھونکا آئے اور چلا جائے۔ کسی نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا۔ سانس لینے سے سانس لینے تک۔ آنکھ جھپکنے کے ایک مختصر سے لمحے میں وہ آئی اور چلی بھی گئی۔ اور کاغذ کا وہ پرزہ میری نظروں میں پھیلنے لگا۔ پھیلتے پھیلتے زمین سے لوح و قلم تک پھیل گیا۔ میں نے کاغذ کے اس پرزے کو کھولا۔ اس پر یہ رباعی لکھی تھی۔

جنوں اپنا ہی دلدادہ ہے اتنک
یہ ہستی تشنہ بادہ ہے اتنک
اجازت ہے تمہارا نام لکھ لوں
میرے دل کا ورق سادہ ہے اتنک (ماخوذ)

اس رباعی کا ہر مصرعہ، ہر شعر، ہر لفظ، ہر نقطہ میرے اندر عمر خیام اور غالب بن کر جھولنے لگا۔ اور فقط چند لمحوں میں نہ جانے کتنے دیوان، کتنی رباعیاں، کتنی غزلیں، کتنے قطعے، کتنے قصیدے، کتنی مناجاتیں، میں نے کہہ ڈالیں۔ مگر مجھے صرف چند شعر یاد رہے جو میں نے کاغذ کے اس پرزے کے پیچھے اصلاح کے طور پر لکھ دیئے۔ اور پھر ایک شعر تو بیساختہ

میرے منہ سے نکل ہی گیا۔

اک نظر دور سے دیکھوں گا در و بام ترے

حسرت شوق کو تڑپا کے چلا جاؤں گا (ماخوذ)

اور فوراً ہی اس کونے سے بڑے میاں کی آواز یوں چمکی جیسے دھوپ میں شیشے کا چمکارا سا پڑے۔

"واہ سلیم صاحب واہ۔ کیا اچھا شعر سنایا۔ پھر سنائیے۔ پوری غزل سنائیے۔ جی ہاں۔ ہم تو پوری غزل سنیں گے۔"

میں ذرا جھینپ سا گیا۔ انہیں ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کب ٹلنے والے تھے۔ اُچھل اُچھل کر اصرار کرنے لگے۔

"سُنیں گے۔ ضرور سنیں گے۔ نہیں چھوڑیں گے۔ آپ پوری غزل سنائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ عنایت ہوگی۔"

"غزل نہیں جناب یہ سائنٹ کا زمانہ ہے۔" میں نے کہا۔

"سائنٹ کس چیستان کو کہتے ہیں؟" بڑے میاں بولے۔

"ہمارے ابا مرحوم بھی شاعر تھے۔ غزلیں کہا کرتے تھے۔ یہ نیا نام آج ہی سنا ہے۔"

"جناب غزل کو انگریزی میں سائنٹ ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا ہم انگریزی نہیں سمجھتے شعروں کو سمجھتے ہیں۔ آپ غزل شروع کریں۔" بڑے میاں نے کہا اور اُچک کر پائنتی پر رکھے ہوئے بند بستر پر ہو گئے۔ میں نے سائنٹ شروع کی۔

"ایسے نہیں جناب ایسے نہیں۔" بڑے میاں سر جھٹکتے ہوئے بولے۔

"اور کیسے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے شاعر پڑھتے ہیں۔ گا کر۔ گا کر۔" بڑے میاں نے کہا۔ اور مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ میں دھیمی آواز میں ہکنے لگا۔

پھر خیالوں کے ریگ زاروں میں
آتشِ سوزِ غم جلائی ہے
سہمی سہمی سی نا تمام سی یاد
دور تک تم کو دیکھ آئی ہے
غم کے ویرانوں میں داغِ حسرتِ دل
یوں بھڑکتا ہے کپکپاتا ہے
جیسے مفلس کی جھونپڑی کا چراغ
تند جھونکوں سے ٹمٹماتا ہے

ہر شعر پر بڑے میاں مکرر مکرر کا شور مچاتے رہے۔ وہ کوئی خاص پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا زندگی کے کسی حصے میں یا تو کسی شاعر کے ساتھ رہے، اور یا مشاعرے سننے کا انہیں شوق رہا۔ مجھے جی بھر کر داد دی۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں بھی ان کی پیروی کر رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سارا کنبہ ہی شاعرانہ ذوق رکھتا ہے۔ اچھل اچھل کر تڑپ تڑپ کر داد دینے والوں میں نجمہ بھی تھی۔

اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ جیسے اُس کمرے میں کوئی نہ ہو۔ ایسی خاموشی میں

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے میں صدیاں گزار دیتے ہیں۔ نہ جانے کہاں تک ہو کر ایک ہی لمحے میں ہم واپس لوٹ آتے ہیں۔ جب میں نہ جانے کہاں سے واپس لوٹا تو اُس گہری خاموشی میں سوچنے لگا کہ میں تو افسانے لکھا کرتا ہوں۔ کہانیاں لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایک شعر بھی تو نہیں کہا۔ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اتنے شعر کیسے ہو گئے ؟ کیسے کہہ گیا ؟ یہ سوچ میرے ذہن میں اک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ جسے نجمہ نے فوراً ہی سلجھا دیا۔ وہ مسکرائی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جی نہیں رہا کوئی صحیفہ پڑھ رہا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پھول ہوئی شفق میرے ذہن سے الجھے ہوئے معمہ کو سلجھا گئی۔

"محبت سب کچھ کر سکتی ہے۔ یہ محبت کی سحر کاری ہے۔"

میں اپنی نظروں سے اس کی مسکراہٹ میں کھلے ہوئے پھول چُننے لگا۔ میں اس کی پلکوں کی سانولی شام میں طلوع ہوتے ہوئے ستاروں کی روشنی میں گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نشیلے ڈورے میری زندگی کے راستے بنتے جا رہے تھے۔ معاً میرے ذہن میں ایک سوچ اُبھری۔ آخر میرے قدم مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں ؟ میں کدھر جا رہا ہوں ؟ مگر میں نے اس سوچ کو وہیں سُلا دیا۔ میں اپنے متعلق اس وقت کچھ بھی سوچنے کو تیار نہ تھا۔ میں ان راستوں ہی میں کھو جانا چاہتا تھا۔ بڑے میاں اس وقت موڈ میں تھے۔ مجھ سے ابھی کچھ اور سننا چاہتے تھے۔ کوئی افسانہ کوئی کہانی۔ نجمہ نے انہیں لقمہ دیا۔

"ان سے ان کا افسانہ خلا سنیئے۔ بڑا اچھا افسانہ ہے۔ میں نے ان کی میز پر رکھے ہوئے رسالے میں پڑھا ہے۔"

لقمہ بڑا لذیذ تھا۔ اور بڑے میاں کو کچھ سننے کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ وقت کٹی کے لئے کوئی مشغلہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس وقت افسانہ سنایا جاتا یا پورا رسالہ پڑھ کر سنا دیا جاتا۔ وہ تو اس وقت کچھ سننا چاہتے تھے۔ "خلا۔ خلا" کا شور مچانے لگے۔ مگر میں ان کی اس فرمائش کو پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ میری زندگی میں اس وقت کوئی خلا نہ تھا۔ وہ میرے سامنے تھی۔ وہ میرے پاس تھی۔ اس وقت مجھے میری زندگی تاروں بھری ایک ایسی رات معلوم ہو رہی تھی۔ جس میں آسمان کا کوئی کنارا خالی نظر نہیں آتا۔ میں سر درد کا بہانہ کر کے کھڑکی میں آگیا۔ اور پیپل کے پیڑ کو دیکھنے لگا۔ پتے سرگم کر رہے تھے۔ برکھا بہار کا کوئی گیت گا رہے تھے۔ پچھم کی طرف سے کالے کالے بادل آ رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سورج ان میں چھپ گیا۔ کوندا لپکا۔ بادل گرجا۔ بارش کا پہلا چھینٹا ایک عجیب سی جھنکار کے ساتھ دھرتی پہ آیا۔ پھر ایک اور۔ ایک اور۔ اور اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی پھواروں میں بھیگنے میں اس وقت مجھے کچھ عجیب سا لطف آ رہا تھا۔ میں کھڑکی میں ذرا اور آگے کو سرک گیا۔ اور پانی پر ناچتے ہوئے بلبلوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔

زندگی بلبلا ہے پانی کا

اور وہاں کئی زندگیاں آنکھ جھپکنے میں ختم ہو رہی تھیں۔ پانی سے ابھر کر پانی ہی میں سما رہی تھیں۔ اور پانی تھا کہ اس سے بے خبر شور مچاتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا اس کی سطح پہ کیا ہو رہا ہے۔ اور مجھے بھی معلوم نہ تھا بہتے وقت کی نہر میں کیا ہو رہا ہے۔ انیس خاں کی بیوی مدت ہوئی مر چکی تھی۔ وہ نئی شادی

کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے لئے ایک خوبصورت اور کمسن لڑکی کی ضرورت
تھی۔ اسی سلسلے میں بندو گوالے کی لڑکی گوری کے ساتھ اس کا رومانس کئی دنوں
سے چل رہا تھا۔ دودھ میں پانی ملا کر بیچنے میں بندو کا چالان ہوا تو بستی کے
چوہدری نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے چالان کو آگے نہ چلنے
دیا۔ بندو کو جرمانہ سے بچالیا۔ وہ اسی خوشی میں دوسرے دن کی پیوسی کا نذرانہ
لیکے آیا۔ اس کی بھوری بھینس نے بچھڑا دیا تھا۔ انیس خاں نے اُسے اپنے پاس
ہی بٹھا لیا۔ اور اس دن اس سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

"بندو میاں میری بیوی کی موت سے گھر کی بربادی ہو گئی ہے۔ میں اپنا
گھر بسانا چاہتا ہوں۔ بس آگے کچھ نہ کہوں گا۔ بڑے سمجھدار ہو میری بات تم
سمجھ گئے ہو گے۔"

بندو واقعی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس نے حامی بھر لی۔ مگر رکاوٹ تو گوری
کے بھائی کے نہ آنے کی وجہ سے ہوتی رہی۔ وہ کراچی میں کسی مل میں لگا ہوا
تھا۔ اُسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ اسی اثنا میں انیس خاں کو اپنا گھر بسانے کے
نقشوں میں اتفاقاً ایک اور گڑیا بھی نظر آ گئی۔ اس نے نجمہ کو دیکھ لیا۔ بڑے
میاں کو جھونپڑے میں آئے دوسرا دن تھا۔ وہ نجمہ کے ساتھ کھڑکی میں کھڑے
اس نئے ماحول کا منظر دلپس منظر دیکھ رہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جھونپڑے
کے پچھواڑے میں مدت سے بند کنویں کے اوپر جھکی ہوئی بیری پر چڑیاں شور
مچا رہی تھیں۔ پاس ہی ایک غیر آباد کھپرے میں جواری بیٹھے جوا کھیل رہے
تھے۔ گھمسائی چل رہی تھی۔ کبھی چھکا کبھی تین کانے۔ پانچ چھ سو روپیہ ٹکری

میں گھوم رہا تھا۔ لکشمی ہاتھی دانت کے پانسہ پر ناچ رہی تھی۔ اوپر سے انیس خاں نے چھاپہ مارا۔ ہارے ہوئے جواری گھسیٹے کو چیان نے ہرے ہوئے مال کی گرہی سردی ہیں ان کی مخبری کر دی تھی پولیس کے مخبر کے آگے۔ بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ انیس خاں لپ جھپ موقعہ پر جا پہنچا۔ جواری اُسے دیکھتے ہی اٹھ بھاگے۔ مگر کچھ جواری جو تیز نہ بھاگ سکے پکڑے گئے۔ ہاتھ جوڑنے لگے۔ قدموں میں سر دھرنے لگے۔ مگر چوہدری ان چونچلوں سے ماننے والا نہ تھا۔ وہ تو چاندی چاہتا تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے آسمان کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر جیوڑے کھنکانے لگا۔ اسی اثنا میں اچانک اس کی نظر جھونپڑے کی کھڑکی میں اس وقت تنہا کھڑی نجمہ پر جا پڑی۔ چاروں طبق روشن ہو گئے چوہدری کے۔ اس کی نظریں جہاں تھیں وہیں چپک کر رہ گئیں۔

چوہدری کا ہاتھ جیب میں جاتا دیکھ کر جواریوں کے ہاتھ بھی اپنی اپنی جیب کی طرف، نیفے کی طرف سرک گئے۔ کسی نے پانچ، کسی نے دس، کسی نے پندرہ، کسی نے بیس دیئے۔ خوشی سے چوہدری کی بتیسی باہر نکل آئی جیب اس کی چاندی سے بھر گئی۔ مگر کھڑکی خالی ہو گئی۔ نجمہ ایک اجنبی مرد کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مگر انیس خاں اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اُسے اپنے گھر کی رانی بنانے کی ٹھان چکا تھا۔ اور ایک چکر چلانے ہی والا تھا کہ اچانک گاؤں سے ایک قریبی رشتہ دار کی موت کی خبر آ گئی۔ اور وہ چند دنوں کے لئے وہاں چلا گیا۔ واپس آیا تو نجمہ کو ہمارے گھر میں دیکھ کر

بڑا حیران ہوا۔ مگر اس نے اپنی حیرانی کو زیادہ نہ بڑھنے دیا۔ ہمارا پڑوسی فقیرو نانبائی اپنے گھاس پھوس کے کوٹھے کی چھت پر کبوتروں کا ایک کھولے بیٹھا تھا۔ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ نظریں اس کی خلا میں قلابازیاں لگاتے ہوئے اپنے کھُرے پر جمی تھیں۔ انیس خاں لپک کر آگے ہوا اور بانس کی سیڑھیوں پہ جلدی جلدی چڑھتے ہوئے کوٹھے پہ پہنچ گیا۔ چیونٹی کے گھر اوتار چلا آیا تھا۔ فقیرو سلام کرتے ہوئے ایکدم سپاٹ کھڑا ہو گیا۔ انیس خاں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ حقہ گڑگڑاتے ہوئے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک وہیں بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اور اپنا مطلب حل کر لیا۔

فقیرو نانبائی اس بستی کا چلتا پھرتا روزنامچہ ہے۔ ڈے بک ہے۔ صبح سے شام تک اس بستی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے سینے پر لکھا ہوتا ہے۔ اس نے انیس خاں کو بتایا۔

"یہ لوگ جھونپڑا دھڑا دھڑ سال بارش میں گر جانے سے یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔ مل جائے گا چلے جائیں گے۔"

"مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔" یہ ایک جملہ انیس خاں کے ذہن میں فوراً ہی ایک سکنڈل بن گیا۔ اور اس نے فوراً ہی اس سکنڈل کو چالو کر دیا۔ شام کو میں گھر آیا تو اس نے مجھے راستے ہی میں روک لیا۔ کہنے لگا۔

"سلیم صاحب اگر آپ بُرا نہ منائیں تو ایک بات کر دوں۔"

"ضرور کریں۔" میں نے کہا۔

"آپ خاندانی آدمی ہیں۔ بڑے شریف ہیں۔ آپ کے باپ دادا سُنا ہے

بڑے نامور لوگ تھے۔ دنیا اب بھی بڑی عزت سے ان کا نام لیتی ہے۔" انیس خاں نے کہا۔

"آپ کے شہر کے رہنے والوں سے بڑی تعریف سنی ہے آپ کی اور آپ کے گھرانے کی۔"

"جی جی آپ جلدی سے بات کریں مجھے ایک ضروری کام ہے۔" میں نے مصروفیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ جنہیں آپ نے گھر میں پناہ دی ہے خانہ بدوش لوگ ہیں۔" انیس خاں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بدنام لوگ۔ خانہ خراب لوگ۔ جو ان کے ساتھ مل بیٹھے اس کا بھی خانہ خراب کر دیتے ہیں۔ میں انہیں دیر سے جانتا ہوں۔ انہیں کئی بستیوں سے نکالا جا چکا ہے۔ عزت والے لوگ ایسے لوگوں کو کب پاس آنے دیتے ہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کا ہر شریف آدمی کو خیال ہوتا ہے۔"

"جی یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں کہنا چاہتا ہوں یہ دونوں لڑکیاں خراب ہیں۔ آپ کو کچھ خبر نہیں۔ آپ اپنے کام پر ہوتے ہیں۔ یہ جب دیکھو کھڑکی میں ہوتی ہیں۔" انیس خاں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ان کا کیا جائے گا گھر تو آپ کا بدنام ہوگا۔ سارا دن مشٹنڈوں اور لوفروں کا تانتا لگا رہتا ہے آپ کے گھر کے سامنے۔ نکالئے ان

گندی مچھلیوں کو یہاں سے کہیں سارا جل گندا نہ کر دیں۔"

میں اس شخص کی فطرت و خصلت سے خوب واقف تھا۔ اس کی ایک ایک کرتوت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ بستی کے اس بگلا بھگت کو خوب سمجھتا تھا۔ الیکشن میں غریبوں کے ووٹ لینے کے لئے رات کے اندھیرے میں چپکے سے ان کے جھونپڑوں کو آگ لگوا کر ان کی راکھ کے ڈھیر پر سر رکھتے ہوئے جب یہ رویا تھا تو میں نے اس کے آنسوؤں کو مگر مچھ کے آنسو کہا تھا۔ مصنوعی آنسو۔ موم کے آنسو۔ اسی ہنگامے میں اس نے ایک اور ڈھونگ بھی رچایا تھا غریبوں کے لئے نئے جھونپڑے بنانے کے لئے اس نے پانچ سو روپیہ دیا۔ اور دوسرے مخیّر لوگوں سے بھی چندہ لیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق چندے میں اس نے دو ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ جس میں سے سات سو روپیہ یہ بڑی استادی سے بغیر ڈکار کے ہضم کر گیا۔ پانچ سو روپیہ تو وہ جو اس نے اپنی جیب سے دیا تھا اور دو سو روپیہ اس کے سود میں سمجھ لیجئے۔ اور بقایا رقم کی غریبوں میں بندر بانٹ کی۔ جہاں کوئی دلچسپی، کوئی دل لگی دیکھی وہاں زیادہ دے دیا، اور جہاں کچھ نہ دیکھا وہاں بھی دیا مگر نہ دینے کے برابر۔ مجھ سے اس خبیث کی کوئی خباثت چھپی نہ تھی۔ بڑے سکون سے اس کی باتیں سن کر میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ اپنا جھونپڑا درست کرنے والے ہیں۔ پیسوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔ خود ہی چلے جائیں گے۔ میں کسی کو کسی کی پریشانی میں اور زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"

میری یہ بات اُسے بڑی ناگوار گزری مگر خاموش رہا اور اندر ہی اندر اس نے

ایک اور سکنڈل چلا دیا۔ مجھ سے پوشیدہ بڑے میاں سے دوستی گانٹھ کے ان کے کان بھرنے لگا۔ میرے خلاف ان کے ذہن میں زہر بھرنے لگا۔

"سلیم کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے تو ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔ یہ شراب پیتا ہے۔ جُوا کھیلتا ہے۔ بدنام عورتوں کو لیکے ہوٹلوں میں جاتا ہے۔ اگر اس کو آپ کے اس خادم کا خوف نہ ہو تو اس بستی میں کبھی نہ جانے کیا کیا گل کھلائے۔ یہ کوئی کام نہیں کرتا کہیں ملازم نہیں ہے۔ یونہی دکھاوے کے لئے چمڑے کا بستہ سا بغل میں دبائے صبح کے وقت گھر سے نکل جاتا ہے۔ اور ہیرا پھیری کر کے شام کو آجاتا ہے۔ کہتا ہے میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ کہانیاں بیچتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے یہ بھی کوئی کام ہے۔ یہ بڑا جھوٹا ہے۔ بڑا جھوٹ بولتا ہے۔ وہ تو آپ کے خادم کو اس کی اندھی ماں پر ترس آگیا اسے بچالیا۔ ورنہ اب تک جیل میں جوتے کھا رہا ہوتا۔ یہ بردہ فروش ہے۔ عورتیں بیچتا ہے۔ خدا کے لئے اس سے اپنی بیٹیوں کو بچائیے۔ اگر آپ کو مکان کی مجبوری ہے تو میرے اس بستی میں دو مکان ہیں۔ کل شام تک میں آپ کو حویلی میں جگہ خالی کرادوں گا۔ آپ کی خاطر کسی کرائے دار کو نکال دوں گا۔ اور اگر آپ اپنا نیا جھونپڑا بنانا چاہتے ہیں تو میں آپ کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ آپ کی شرافت نے مجھے آپ کا گرویدہ کر لیا ہے۔ میں آپ کو اپنے پاس حویلی میں رکھوں گا۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔"

نہ صرف یہ بلکہ ایسی ہی بے شمار باتیں جو انیس خاں نے بڑے میاں سے کہیں انہوں نے اپنی بیگم سے کہہ دیں۔ بیگم نے اپنی بیٹیوں کو بتائیں اور ان کی بیٹی نجمہ نے مجھے بتا دیں۔ بڑے میاں کی بیگم نے ایک دن اشارتاً میری ماں سے نجمہ کی شادی کی بات کی تھی۔ اور میری بڑی تعریف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا کہ سلیم سے اچھا لڑکا ہمیں نہ مل سکے گا۔ مگر انیس خاں کی باتیں سُن کر میرے متعلق اُن کے نظریے ہی بدل گئے۔ اس کی بنا دٹی باتیں سن کر بڑے میاں بن گئے۔ سکنڈل ساز مکڑی نے ایک سیدھی سادھی بھولی بھالی مکھی کو اپنے جال میں بڑی آسانی سے پھانس لیا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت وہ اپنا سازوسامان اکٹھا کرنے لگے۔ میری والدہ نے ان کی بیگم کو اور میں نے ان کو بڑا سمجھایا۔ انیس خاں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شام کے وقت اپنا سامان اٹھا کر اپنے کنبہ کے ہمراہ چل دیئے۔ وہ بڑا حسرتناک منظر تھا۔ نجمہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ سب کی نظروں سے بچ بچا کر کانپتے ہاتھوں سے اس نے مجھے جاتے ہوئے سلام کیا۔ اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اپنی اک نظر میرے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔

اک نظر دور سے دیکھوں گا در و بام ترے
حسرت شوق کو تڑپا کے چلا جاؤں گا

اُس نظر میں کیا کچھ نہ تھا۔ اس نظر میں سب کچھ تھا۔ حوصلہ، تسلی، عزم، آنے والی مشترکہ زندگی کے وعدے، منصوبے، مسکراہٹ۔ اس کی اُس نظر میں وہی جادو تھا جو رگ وید اور یجر وید کے منتروں میں ہے۔ اُس نظر میں وہی

مٹھاس تھی جو گیتا کے ہر شلوک میں ہے۔ اس نظر میں وہی معصومیت وہی تقدس تھا جو توریت و انجیل کی ہر آیت میں ہے۔ اُس نظر میں محبت کے وہی گیت تھے جو ٹیگور کی گیتا نجلی میں ہیں۔ اس کی وہ نظر میری زندگی کے اندھیروں میں اجالا کر گئی۔

گوتم کو برگد کے پیڑ سے گیان ملا تھا۔ مجھے نجمہ سے گیان ملا۔ گوتم نے پرماتما کو ایک روشنی میں دیکھا تھا۔ میں نے خدا کو پہلے نجمہ میں اور اس کے بعد ہر انسان میں دیکھا۔ وہ نظر مجھے انسان بنا گئی۔ میرے اندر بڑی سوچیں جگا گئی۔ وہ رات میں نے سوچتے ہی سوچتے گزار دی۔ میں ساری رات سوچتا رہا۔ اپنے متعلق۔ نجمہ کے متعلق، سکنڈل ساز لوگوں کے متعلق جو ہر معاشرے ہر ماحول میں شرافت و ہمدردی کے سائن بورڈ چہرے پہ لگائے اپنی روح اور ضمیر میں ساری کائنات کی گندگی اور غلاظت سمیٹے ہر گلی، ہر بازار، ہر علاقے ہر شہر میں موجود ہیں۔ جنکی روح میں رستے ہوئے ناسور ہو چکے ہوتے ہیں۔ جن کا ضمیر کار بنکل پھوڑا بن چکا ہوتا ہے۔ جس کے ہر لمحہ خالی ہوتے اور بھرتے ہوئے زخم کی پیپ کی بھڑاس ان کے اندر ایک ایسا کوڑھ پیدا کر دیتی ہے جسے وہ دوسرے انسانوں میں پھیلا کر خوش ہوتے ہیں جو دوسروں کی پرسکون زندگی کی گہرائیوں میں سکنڈلوں کے بڑے بڑے پتھر پھینک کر بے چینیوں کے بھنور پیدا کرتے ہیں۔ اس رات میں نے ایسے لوگوں کے متعلق بہت کچھ سوچا۔ اور اب بھی سوچا کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے ان کے متعلق بہت کچھ لکھنا ہے۔ کئی کہانیاں۔ کئی افسانے۔ کئی نئے تجربے، تجزیے کرنے

ہیں۔ مجھے اپنے افسانوں اور کہانیوں سے ان کی روح کے رستے ہوئے ناسور اور ضمیر کے کاربنکل کا علاج کرنا ہے۔ مجھے ان کو مجھ سے حاصل کیا ہوا گیان دینا ہے۔ ان کے دل کی بند آنکھیں کھولنی ہیں۔ تاکہ یہ خدا کو دیکھ سکیں۔ پہچان سکیں۔ جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہر چیز میں موجود ہے۔ جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا ہے۔

آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بونداباندی ہو رہی تھی۔ میں اپنی سوچوں کی چھتری تانے ٹھنڈی سڑک پر اپنے سپنوں کے پیچھے آوارہ پھر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور بونداباندی سے موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ میں کیسینو سے ذرا آگے نکلا تو سڑک کے اوپر دو درختوں کے درمیان کپڑے کا ایک لمبا سا پینل لٹکتے دیکھا۔ جس پہ بڑے بڑے حرفوں میں یہ جملے لکھے تھے۔

"تپ دق کے خلاف جہاد کر دو"

"تپ دق کے خلاف محاذ قائم کر دو"

"ٹی بی ٹکٹ خرید کر دق میں مبتلا پندرہ لاکھ انسانوں کی امداد کر دو"

ان جملوں نے میری تیز تیز چلتی ٹانگوں میں بریک سی لگا دی۔ تپ دق اور جہاد۔ قلمکار ہونے کی حیثیت سے میں نے ان جملوں کا فنی جائزہ لیا۔ جہاد تو بڑی مقدس چیز ہے۔ اور تپ دق ایک بڑی ہی نحس بیماری ہے۔ اور دوسرے جملے میں تپ دق اور محاذ کے الفاظ مجھے بے محل معلوم ہوئے۔ محاذ

تو اس وقت قائم کئے جاتے ہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم کو پائمال کرنے کے لئے۔ غلام بنانے کے لئے۔ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیئے میدان جنگ میں اترتی ہے۔ جب ایک ملک غاصبانہ قبضہ جمانے کے لئے دوسرے ملک پر یلغار کرتا ہے۔ مگر دق تو ایک مرض ہے۔ اس کا ملک اور قوم سے کیا تعلق۔ بظاہر تو یہ جملے مجھے خود بھی مدقوق سے معلوم ہوئے۔ کھانستے اور تھوکتے بیمار جملے، جیسے ابھی ابھی آپریشن تھیٹر سے نکلے ہوں اور ان سے کلوروفارم کی بُو آ رہی ہو۔ کبھی کبھی انسان کا ذہن یوں بھی سوچا کرتا ہے۔ یوں بھی محسوس کیا کرتا ہے۔ مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں جاگ رہا تھا مگر یوں جیسے نہیں جاگ رہا۔ اسی اثنا میں بادلوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ایک بوند میری کنپٹی پر گری تو میں چونک گیا۔ میرے ذہن نے ایک کروٹ سی لی۔ غیرارادی طور پر میری نظریں ایک بار پھر اُس کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ان جملوں کو ایک بار پھر اپنے ذہن میں دھرایا۔ اور عبارت آرائی سے ہٹ کر ان کے مفہوم پر غور کیا تو لیس گرما گرم کافی کے ایک لبریز فنجان کا سرور آگیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ انسان بیدار ہوگیا ہے۔ انسان چاند میں پہنچ گیا ہے۔ انسان نے زمان و مکان کو تسخیر کرلیا ہے۔ انسان نے اپنے اصلی دشمن کا پتہ لگا لیا ہے۔ انسان اب انسانوں سے نہیں بیماریوں سے لڑے گا۔ انسان اب ملکوں اور قوموں کو نہیں بلکہ ان خلا کو جیتے گا۔ موت کو جیتے گا۔ وباؤں اور ان کو پھیلانے والے جراثیم کے خلاف محاذ قائم کرے گا۔ ان کے خلاف جہاد کرے گا۔

انسان اب طوفانوں اور زلزلوں کے خلاف سینہ سپر ہو گا۔ انسان اب جنگی ہتھیار نہیں بنائے گا ٹریکٹر بنائے گا۔ خلا نورد راکٹ بنائے گا۔ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے غذائی بحران کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ اناج اُگائیگا۔ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو چاند تاروں میں منتقل کرے گا۔ وقت کا یہی تقاضا ہے۔ ہر ملک ہر قوم اس وقت اسی سطح پر سوچ رہی ہے۔ اُسے پیچھے نہیں آگے بڑھنا ہے۔ اسے باتوں کے بیلون نہیں اڑانے عملی طور پر کچھ کرنا ہے۔ واقعی یہ ایک جہاد ہے۔ ایک مقدس مہم ہے۔ جس کے صرف خیال ہی سے انسان کی آدھی مصیبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

میں نے انسان کے ماضی پر ایک بیساختہ قہقہہ لگایا۔ کیسی کیسی خطرناک راہوں سے نکلا ہے انسان۔ کیسے کیسے ریگستان عبور کئے ہیں انسان نے۔ کیسے کیسے جنگلوں میں ابتدائی زندگی گزاری ہے انسان نے اور نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد اُس مقام پر پہنچا ہے جہاں اب اُسے اپنی منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں۔ اسی خوشی میں ایک اور قہقہہ میرے حلق سے چھوٹ گیا۔ پیٹ سے ایک اور اُبھر رہا تھا۔ لیکن وہ حلق میں پہنچتے ہی بھاپ بن کر نکل گیا۔ بھاپ بن کر خارج ہو گیا۔ جیسے پنکچر ہو جانے سے ٹائر کی پھونک نکل جائے۔ میں یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ میرے آس پاس کچھ ہو رہا تھا۔ آتے جاتے لوگ۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین اور ان کے بچے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ مگر میرے یکدم سنجیدہ ہو جانے سے وہ بھی سب سنجیدہ ہو گئے۔ جیسے انہوں نے میرے متعلق اپنے کسی اندازے کو فوراً ہی بدل دیا

ہو اور میں اپنی حماقت کو حیرت کے حاشیوں میں چھپائے آگے کو حرکت کرنے لگا۔ حرکت میں برکت ہے۔ اب جو میں نے حرکت کی تو میرے گیان دھیان کی آٹو میٹک مشینری بھی حرکت میں آگئی۔ اور میری آنکھوں میں روحانیت کے حمارے بھی حرکت کرنے لگے۔ جس سے میں اور زیادہ حساس ہو گیا۔

ایک جگہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے تناور درخت کے تنے سے آدھا چپکا ہوا آدھا لٹکا ہوا ایک پوسٹر راہ گیروں سے ملتجی تھا کہ اس کے لٹکتے ہوئے حصے کو سیدھا کر کے اُسے بڑے غور کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پڑھا جائے۔ انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ جبکہ اس کا سویا ہوا احساس جاگتا ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز اُسے اپنے ساتھ ہمکلام ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑا ہی مقدس وقت ہوتا ہے۔ اس وقت انسان اپنی انا کے بہت قریب ہوتا ہے۔ ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے۔ اور اُس کیفیت کا دوسرا نام محبت ہے۔ اپنے آپ سے محبت۔ دوسروں سے محبت۔ تمام کائنات سے محبت۔ محبت ایک لازوال قوت ہے جب انسان محبت کے اس بھید کو پا لیتا ہے۔ تو لازوال ہو جاتا ہے۔ باکمال ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے چاند تاروں میں اترنے کے لئے خلا میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چاند تارے اس کی تلاش میں زمین پر اترتے ہیں۔ میں نے پوسٹر کو سیدھا کر کے پڑھنا شروع کیا۔ دق کے مریضوں کے لئے ایک چیسٹ کلینک بنانے کے لئے امدادی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ مشاعرہ کی ساری آمدنی ٹی بی فنڈ میں جانی تھی۔ ملک کے نامور شاعر اور شاعرات

اُس مشاعرے میں شرکت کر رہی تھیں۔ طرح مصرعہ تھا۔

صبح سے شام ہوئی ایک جہاں گزرا ہے

اور میرے گیان دھیان کی اُس وقت خدا کے عرش سے لگی ہوئی سیڑھی خود بخود ہلنے لگی۔ جیسے زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہوں۔ پندرہ لاکھ انسان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ پندرہ لاکھ مدقوق انسان۔ پندرہ لاکھ زرد چہروں والے کھانستے لہو تھوکتے ڈھانچے۔ اور میں نے اپنے دل سے فیصلہ کر لیا کہ اس مشاعرے کے لئے ضرور کوئی سانیٹ، کوئی غزل، کوئی نظم کہوں گا۔ شاعر ہوتے ہوئے اگر میں تخمینہ کی محبت میں ایک سانیٹ کہہ سکتا ہوں تو پندرہ لاکھ زندہ لاشوں کے لئے بھی مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوگا۔ مجھے ان کے ساتھ بھی محبت ہے۔ ہم سب انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ میں اس مشاعرے میں ضرور کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔ میں نے اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ اگر راک فیلر، ہینری فورڈ، آدم جی، داؤد جی اپنی دولت میں سے بہترین ذہنی تخلیق پیش کرنے والوں کو ہزاروں ڈالر، ہزاروں روپے دان میں دے سکتے ہیں۔ تو کیا میں اپنے پندرہ لاکھ دکھیا بھائی بہنوں کو ایک غزل کا دان نہیں دے سکتا؟ ضرور دوں گا۔ ضرور دینا چاہیئے، یہ میرے دل کی۔ میری روح کی۔ میرے گیان دھیان کے گوتم کی آواز تھی۔ مجھے ان کے متعلق۔ ان کے لئے بہت کچھ لکھنا ہے۔ کئی افسانے۔ کئی کہانیاں۔ اور اُس عرصہ تک لکھتے رہنا ہے۔ جب تک کہ دق میں مبتلا یہ پندرہ لاکھ انسان صحت یاب نہ ہو جائیں۔ اس عرصہ تک لکھتے رہنا ہے۔

جب تک یہ قومی خطرہ ، یہ متعدی بیماری اس ملک سے دور نہیں ہو جاتی۔ پندرہ لاکھ مدقوق انسانوں کے لئے میری محبت کا سمندر اس وقت کھول اٹھا تھا۔ میرے جذبات کے موتی اُچھل اُچھل کر باہر آ رہے تھے۔ چند اشعار تو وہیں کھڑے کھڑے ہو گئے۔

صبح سے شام ہوئی ایک جہاں گزرا ہے
ہر حسیں سائے پہ تیرا ہی گماں گزرا ہے
وائے وارفتگیٔ شوق کہ ہر آہٹ پر
تیری پائل کے چھناکے کا گماں گزرا ہے (ماخوذ)

میں ابھی ان اشعار کو چاکلیٹ بار کی طرح چسکے لے لے کر چوس رہا تھا کہ ادھر سے ٹی بی ٹکٹ بیچنے والے کالجیٹ لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی آ گئی۔ ایک نے ایک بازو تھام لیا۔ دوسرے نے دوسرا بازو۔ دو نازک سے، شبنم سے ہاتھ میرے سینے پہ دونوں طرف دونوں پھیپھڑوں کے اوپر ٹی بی ٹکٹ چسپاں کرتے ہوئے تھر کنے لگے۔ دو روپے بیس پیسے تھے بندے کی جیب میں۔ نکال کر فوراً پیش کر دیئے۔ اس وقت اگر میرے پاس دو ارب روپیہ بھی ہوتا تو انسانیت کے دکھ دور کرنے کے لئے پیش کر دیتا۔ اس کے نتیجے میں چاہے مجھے ساری عمر قلاش و دیوالیہ ہو کر ہی کیوں نہ جینا پڑتا۔ انسانیت بڑی مہنگی اور قیمتی شے ہے۔ انمول ہے۔

دوسرے دن میری ایک کہانی کا سودا ہوا۔ اچھے داموں بک گئی۔ گاہک میٹھے ٹیشن قسم کا پبلشر تھا۔ کہانی کا گوشت اور چربی ٹٹولنے والا۔ جملوں اور

مکالموں کا قد کاٹھ دیکھنے والا۔ مسودے کا وزن جانچنے والا۔ کہ کیا کیا چیز کتنی کتنی ہے۔ اور مجموعی وزن کتنا ہے۔ مسودہ ہاتھوں میں لے کر پہلے اُس نے صفحات گنے۔ پھر سطریں گنیں۔ الفاظ گنے۔ ہر باب پر نظر ماری۔ بولا۔

"مسودہ چھوٹا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ الف لیلےٰ نہیں ہے۔ طلسم ہوشربا نہیں ہے۔ چار پانچ سو صفحات کا ناول ہے اور بس ٹھیک ہے۔ مناسب ضخامت ہے۔ آئیرنی قائم رکھنے کے لئے اس قسم کے ناول کو بس اتنا ہی لمبا ہونا چاہیئے۔ شیطان کی آنت نہ ہونا چاہیئے۔ دریائے نیل نہ ہونا چاہیئے مسودے کا حدود اربعہ نہ دیکھئے۔ یہ دیکھیئے کہ اس میں لکھا کیا ہے۔"

اور میں نے پبلشر کو پورا ایک باب پڑھ کر سنایا جو اُسے بڑا اپسند آیا۔ مسودہ اس کی بغل میں اور نوٹ میری جیب میں۔ وہ اُدھر میں اِدھر۔ اپنی اپنی زندگی کے الگ الگ راستے ہیں۔ رقم کا آدھا حصہ میں نے اُسی دن ٹی بی فنڈ میں دے دیا۔ جاڑے کا موسم آرہا تھا۔ اس رقم سے میں نے ایک جسٹر، گرم کوٹ مفلر اور سوئیٹر خریدنا تھا مگر ملتوی کر دیا اس ارادے کو۔ میں نے سوچا۔ زندگی اور موت کے درمیان پڑے ہوئے پندرہ لاکھ انسانوں کا پہلے کچھ بن جائے۔ جسٹر اور گرم کوٹ تو پھر بھی بن سکتے ہیں۔ جسم اگر جاڑے سے ٹھٹھرتا ہے تو ٹھٹھر جائے مگر انسان کی روح کو نہ ٹھٹھرنا چاہیئے۔ روح کی وادیوں میں برف کے تودے نہ جمنے چاہئیں۔ گرم کپڑے صرف جسم کو گرمی پہنچا سکتے ہیں۔ روح

کو گرم یا ٹھنڈے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال میں نے اپنی روح کو تو نہ ٹھٹھرنے دیا مگر میرا جسم پورے چھ مہینے جاڑے سے ٹھٹھرتا رہا۔ پرانا گرم کوٹ گھس گھسا کر بیکار ہو چکا تھا۔ شدید سردی کو نہیں روک سکتا تھا۔ ایک دن اولے پڑے تو بندے نے روحانیت کے بڑے ہی نظارے دیکھے۔ میں روحانیت کے اتنے اونچے زینوں تک ہو آیا کہ دوسرے دن زکام ہو گیا اور مجھے دوائی لینے کارپوریشن کی فری ڈسپنسری میں جانا پڑا۔

واپسی پر راستے میں چند دوست مل گئے۔ وہ کافی ہاؤس جا رہے تھے۔ گپ شپ اڑانے میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ سنڈے ٹکی کلر پروگرام تھا۔ کافی ہاؤس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیبرے اور ڈانس۔ رمبا۔ فاکس ٹراٹ۔ ٹینگو۔ ہلکی پھلکی موسیقی۔ آرکسٹرے کے سازوں میں سیکسوفون کی آوازیں ٹیپ کے سروں میں سنائی دے رہی تھیں۔ کافی اور کوکو کی بھینی بھینی فلیور سلگتے ہوئے سگرٹوں کی فلیور کے ساتھ گھل مل کر مانٹی کارلو کے کسی کارنوال کا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ مگر میرے گیان دھیان میں سمادھی لگا کر بیٹھا ہوا گوتم اس ماحول سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی جنم بھومی، اس کی راج بھومی کے پندرہ لاکھ انسان زندگی اور موت کے خلاء میں پڑے سسک رہے تھے۔ پندرہ لاکھ تھوکتی کھانستی زندہ زندہ لاشوں کی آرتیاں، جنازے مرگھٹ کی طرف چلے جا رہے تھے۔

کپل وستو کے گوتم نے صرف ایک لاش، ایک آرتھی، ایک جنازہ دیکھ کر راج پاٹ بیوی بچے چھوڑ دیئے تھے۔ اپنا سکھ چین چھوڑ کر انسانوں کے

لئے مکتی اور نروان حاصل کرنے بستیوں سے دور، محل ماڑیوں سے دور جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ وہ سب کچھ تیاگ گیا تھا۔ سب کچھ چھوڑ گیا تھا میرے گیان دھیان کا گوتم کیا کیبرے اور ڈانس نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کافی کے گھونٹ نے میرے حلق میں کونین کا ذائقہ اختیار کر لیا۔ کپ میز پر رکھتے ہوئے میں خاموشی سے دروازے کی طرف سرک گیا۔ میرے دوست مجھے آوازیں دیتے رہے۔ بلاتے رہے۔ مگر میں نے ان کی کسی آواز کا کوئی جواب نہ دیا۔ پندرہ لاکھ سسکتی ہوئی روحوں کی دردناک آوازیں مجھے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ میں نے ان کے لئے مکتی اور نروان حاصل کرنا تھا۔ مکتی و نروان۔ جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے پہلا قدم اپنی بستی سے اٹھانا تھا۔ گیان دھیان کے اس اونچے درجے کی پہلی سیڑھی میری بستی میں تھی۔ جھونپڑوں اور ڈھاروں میں پچیس فی صد انسان لہو تھوک رہے تھے۔ کھانس رہے تھے۔ یہ راستہ جنت کو جاتا ہے۔ وہ راستہ جہنم کو جاتا ہے۔ یہ نیکی کا راستہ ہے۔ وہ بدی کا راستہ ہے۔ یہاں بے شمار راستے ہیں۔ راہی جدھر چاہے چلا جائے۔ مگر مجھے مکتی و نروان کا راستہ دیکھنا تھا۔ کیبرے اور ڈانس۔ ہلکی پھلکی موسیقی۔ سنڈے ٹکنی کلر پروگرام۔ یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ انسانیت سب سے پہلے ہے۔ کافی، کوکو اور سگرٹوں کے فلیور کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر میں اپنے گیان دھیان کی فضا میں آگیا جس میں پرانی بستی میں خاموش کھڑی ہوئی مولسری کے پھولوں کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ وہ مہک گوندی پیر کے تکیے کے اللہ لوگوں اور بستی کے سکنڈل سازوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی میری طرف

آؤ۔ یہ مہک ہی تمہاری منزل ہے۔ اس مہک کو اپنی ساری زندگی میں بسالو۔ چرس چانڈو نہ پیو اس مہک کو پیو۔ تمہارا ہر سانس مہک جائے گا۔ تمہارے لہو کی ہر بوند مہک جائے گی۔ تم مکتی و نروان پاؤ گے۔ گیان پاؤ گے۔ وہ روشنی پاؤ گے جس کا ہر انسان کی زندگی میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اندھیروں کے مسافرو۔ الجھے الجھے راستوں کے راہیو۔ یہ کٹھن منزلیں، یہ راستے اسی روشنی میں طے ہوں گے۔

میں گیان دھیان کی فضا میں مکتی و نروان کے گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ دکھیارے انسانوں کے دکھ درد کی کہانیاں لکھنے والے گیانی گوتم کے دل کا کنول کھل رہا تھا۔ ہر طرف سے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے قدم آسمان کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ کاہکشاؤں کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ میں اپنی کہانی کی قیمت کا آدھا حصہ ٹی بی فنڈ میں دے کر بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ایک عظیم کہانی لکھی تھی۔

ادھر نجمہ نے بھی بڑا عظیم کام کیا تھا۔ اس نے انیس خاں کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لالچ کا پتلا ہے انسان۔ انیس خاں نے بڑے میاں کو لالچ دیا۔

"میں نجمہ کو اس بستی میں ایک نیا مکان بنا دوں گا۔ پانچ ہزار روپیہ حق مہر ہو گا۔ دس تولے سونا اور پچاس بڑے ہی نفیس جوڑے۔ اور آپ کے لئے بڑے میاں میں نے یہ سوچا ہے کہ آپ کو اس بستی میں منیاری کی ایک دکان کھول دوں۔ دس بارہ ہزار روپے کا

اس میں مال ڈال دوں۔ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں محنت مشقت نہیں کر سکتے۔"

دس بارہ ہزار کا مال۔ منیاری کی دکان۔ مکان۔ پانچ ہزار روپیہ حق مہر سونا چاندی۔ بڑے میاں دولت کے چکر میں آ گئے۔ وہ اپنی بیٹیوں کا جہیز بنانے کے لئے مدت سے محنت مزدوری کرتے کرتے تھک چکے تھے لیکن ابھی تک بڑی مشکل سے کچھ جوڑے، دو تولے سونا، بارہ تولے چاندی اور کچھ برتن بن سکے تھے۔ اونچے اونچے دو پہاڑ کھڑے تھے ان کے کندھوں پر۔ مگر اب ایک پہاڑ کا بوجھ تو انیس خاں اپنے کندھوں پہ اٹھانے کو تیار تھا۔ اس نے بڑے میاں سے کہہ دیا تھا۔

"آپ کچھ فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ جتنی جلدی ہو سکے آپ ہمارے دو کلمے پڑھانے کی بات کریں۔"

اور بڑے میاں اس سے زیادہ جلدی میں تھے۔ وہ اپنے فرض کے بوجھ کو جتنی جلدی ہو سکے سر سے اتارنا چاہتے تھے اور ہر چیز مکمل ہو چکی تھی۔ انیس خاں نے سب کچھ دنوں ہی میں تیار کر لیا تھا۔ مگر نجمہ اس کے ساتھ نکاح پڑھانے کو تیار نہ ہوئی۔ اس دروازے سے مولوی اندر آیا اُس دروازے سے نجمہ چپکے سے گھر سے باہر ہو گئی اور بھگدڑ مچ گئی۔ نجمہ سیدھی میرے پاس آئی۔ مجھے ہر بات سے آگاہ کیا۔ کہنے لگی۔

"اب میں واپس نہیں جاؤں گی۔ سلیم بابو تم نے اگر میرا ساتھ نہ دیا تو خودکشی کر لوں گی۔ دریا میں کود جاؤں گی۔"

میں اس کا سچا ساتھی تھا۔ میں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ کچھ اپنے اور پرائے ہمارے موافق تھے کچھ مخالف، ایسے معاملے میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کچھ لوگ محبت کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں بدنام کرتے ہیں۔ بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی محبت کو بھول بھلیاں بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ وہ الجھ کر اپنا راستہ بھول جائیں۔ اور ایک دوسرے کو تلاش کرتے کرتے پاگل ہو جائیں یا خودکشی کرلیں۔ ان کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ کہ وہ اپنی منزل کی طرف قدم نہ اٹھا سکیں۔ کوئی نہ کوئی سکنڈل کھڑا کر دیا جاتا ہے ان کے خلاف تاکہ وہ اس کے جال میں پھنس کر یا تو دم توڑ دیں اور یا ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ جائیں ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی بڑی کوشش کی گئی۔ انیس خاں نے بڑے میاں کو ڈھال بنا کر ہم پر بڑے وار کیئے۔ بڑے ہنگامے ہوئے۔ کئی طوفان اٹھے۔ مگر ہم چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ ہم نے ہمت نہ ہاری۔ تند موجوں کے تھپیڑے کھاتے رہے مسکراتے رہے۔ محبت فاتح اعظم ہے۔ محبت شکست نہیں کھا سکتی۔ پولیس نے ہمارا کیس عدالت میں پیش کیا تو حاکم نے نجمہ کے بیان پر اس کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ جہاں اس کا جی چاہے جا سکتی ہے۔ جس سے اس کا جی چاہے شادی کر سکتی ہے۔ قانونی طور پر اُسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ وہ بالغ ہے۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ہمارے مخالف جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ خاص کر انیس خاں تو زخمی سانپ کی طرح بل کھا کے رہ گیا۔ دونوں پارٹیاں

عدالت سے باہر نکلیں تو بستی کے چند معززین نے ہمارا آپس میں سمجھوتہ کرانا چاہا۔ ان میں سے ایک نے بڑے میاں سے کہا۔

"اب غصّہ تھوک دیجئے بڑے صاحب۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آجکل لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی ہی سے شادی کرتے ہیں۔ نئی روشنی ہے نئی پود ہے۔ درگزر کیجئے۔ یہ لڑکا یہ لڑکی آپ سے معافی چاہتے ہیں۔ ان کا قصور معاف کر دیجئے۔ ان کی خوشی میں شامل ہو جایئے۔ انہیں پھلنے پھولنے کی دعا دیجئے۔"

کہنے والے نے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے کہ بڑے میاں کا دل پگھلا۔ ادھر جھکنے کے لئے گوت کھائی۔ مگر انیس خاں نے ماسنے ہی میں پٹا کاٹ لیا۔ بڑے میاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور نہ جانے کیا کچھ کہا سُنا کہ بڑے میاں بڑبڑاتے اور ہمیں گھورتے ہوئے ادھر چلے گئے۔ اور ہم دونوں کان لپیٹ کر ادھر سرک آئے۔

اسی دن شام کو میرے چند رشتہ داروں اور دوستوں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ نجمہ میری ڈریم لینڈ کی مونا لیزا بن گئی۔ میرے سپنوں کی بستی کی بیاٹرس بن گئی۔ نہ کسی نے ڈھولک بجائی۔ نہ کسی نے سہاگ کے گیت گائے۔ نہ چوڑیاں چھنکیں۔ نہ کسی کی پائل کے گھنگھرو چھنکے۔ بس ایک کمرے میں چند گھنٹوں کے لئے ذرا سی چہل پہل رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مٹھائی تقسیم ہو چکی تو اس تقریب میں شامل ہونے والے چلے گئے۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار اپنا کوئی سگا بھائی اپنی کوئی سگی بہن نہ ہونے کی کمی کو محسوس کیا۔ میرے

دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے بہت قریب بیٹھی ہوئی نجمہ مجھے دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ اس کے اور میرے درمیان دو آنسو حائل ہو گئے۔ جن کو میں نے فوراً ہی جھٹک دیا۔ جھونپڑوں کے سمندر سے آتی ہوئی کسی گوالے کی بانسری کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا وقت ہے۔ گوالے کے گیت نے مجھے جھنجھوڑا۔ کوئی گیت گاؤ۔ اپنا گراموفون بجاؤ۔ معاً مجھے خیال آیا۔ میں اپنی دلہن کو اس وقت سونے چاندی کے زیورات اور اطلس و کمخواب کے ملبوسات تو نہیں دے سکا۔ اسے کوئی گیت ہی پیش کرنا چاہیئے۔ گیت اور پھول بہترین تحفہ ہیں۔ اگر گیت اور پھول نہ ہوتے تو ہماری زندگی بڑی ہی اداس ہوتی۔

تیز تیز لہروں میں کنارے کی طرف بہتی ہوئی کشتی کا مانجھی بادبان کے بانس سے ٹیک لگائے نیلے نیلے آسمان میں اڑتے ممولوں اور سون چڑیوں کی ڈاروں کو دیکھتے ہوئے جب بانسری بجاتا ہے تو کتنا مسرور نظر آتا ہے۔ اپنے بیلوں کے پیچھے پیچھے دھان کے کھیتوں میں جاتا ہوا کسان جب اپنے الغوزے میں رنگ رس کی پھونکیں مارتا ہے تو کتنا خوش خوش دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس وقت کسی ماحول میں نہیں اپنے گیتوں میں بس رہا ہوتا ہے۔ کتنی پیاری ہے گیتوں کی دنیا۔ جھم جھم کے گیتوں کی دنیا۔ جس میں ہر چیز گیتوں کی بنی ہے۔ گیتوں کی زمین۔ گیتوں کا آسمان۔ گیتوں کے گاؤں اور شہر۔ گیتوں کی گلیاں اور بازار۔ گیتوں کے گھروندے اور ان میں گیت ہی بستے ہیں۔ جن کی زندگی بس گیت سی ہے۔ موت نہیں ہے گیتوں کی بستی میں۔ نہ غم ہے نہ اداسی خزاں

بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ بس ایک ہی رُت رہتی ہے۔ گیتوں کی بہار کی رُت۔ جس میں گیتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔ گیتوں کی دنیا میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام ہوتی ہے۔ ہمیشہ اور ہر وقت چٹکی ہوئی چاندنی کا سماں ہوتا ہے جس میں سرگم والاپ کرتے ہوئے گیت سپنوں کی طرح سرسراتے ہیں۔ دکھوں سے بھری ہوئی ہماری زندگی کو جو سکھ گیتوں کے شانتی نکیتن میں ملتا ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔

میں الماری سے گراموفون اٹھا لایا۔ اور اس پر ایک ریکارڈ لگا دیا۔ نجمہ گاؤ تکیے سے پیٹھ لگا کر گیتوں کی چلتی پھرتی گیتا سنگیتا لتا منگیشکر کا گایا ہوا ایک ریکارڈ سُننے لگی۔

برکھا بہار آئی رس کی پھوار لائی

گراموفون پر ریکارڈ نہیں آواز کا جادو چل رہا تھا۔ اور جب آواز کا جادو چلتا ہے تو زمانے بدل جاتے ہیں۔ رُتیں بدل جاتی ہیں۔ ماحول بدل جاتے ہیں۔ مہاکات بدل جاتے ہیں۔ وہ برکھا بہار کی رُت تو نہ تھی۔ پر لتا کی آواز کے میگھ ملہار نے رم جھم کا سماں باندھ دیا۔ نغموں کی پھوار پڑنے لگی جس میں بھیگنے کا مزا مجھ سے زیادہ نجمہ لے رہی تھی۔ اور پھر ایکا ایکی جھونپڑوں کے سمندر سے رونے پیٹنے کی ڈراؤنی آوازوں کا ایک سائیکلون سا اٹھا۔ میں نے گراموفون جلدی سے بند کر دیا۔ میرا خیال تھا جھونپڑوں میں شاید پھر آگ لگ گئی ہے۔ کھڑکی کھول کر میں نے اندھیرے میں جھانکا۔ کچھ سائے سے اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ سائے اِدھر بھاگے آ رہے تھے۔ رونے پیٹنے کی ڈراؤنی آوازوں نے

آس پاس رہنے والوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ اب جو ایک سایہ اُدھر سے ادھر آیا تو میں نے اوپر سے آواز دی۔

"کیا جھونپڑوں میں آگ لگ گئی ہے؟"

"نہیں۔ سنتو شتر بان کی زندگی کا جنگل جل گیا۔" نشیب سے آواز آئی۔

"اس کی بیوی مرگئی۔"

سنتو شتربان گرہستی بھی تھا اور بیراگی بھی۔ گرہست اس کے جسم میں تھا اور بیراگ اس کی روح میں۔ کبیر جی کے کبت پڑھنے کی اُسے ہر وقت لگن لگی رہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو کبیر جی کا کبت ہی سمجھتا تھا۔ بیراگ کی نظر سے اسے اپنی ذات ایسی ہی نظر آتی تھی۔ ایک گرہستی کی نظر سے اس نے زندگی اور اپنی ذات کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ گھرہستی کم اور بیراگی زیادہ تھا۔ اور اب تو اس کا بیراگ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی زندگی کے جنگل کو آگ لگ گئی تھی۔ اس کی بیوی مرگئی تھی۔ تین ننھے ننھے بچوں کی ماں مرگئی تھی۔ پندرہ لاکھ لہو تھوکتی کھانستی لاشوں میں سے ایک لاش کم ہوگئی تھی اور میرے گیان دھیان کا گوتم اداس ہوگیا۔ گہری سوچوں کے سناٹے میں چلا گیا۔

"سلیم بابو کیا سوچ رہے ہو؟" مجھے چپ چاپ دیکھ کر نجمہ نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اگر اس بیماری کے خلاف زبردست محاذ قائم نہ کیا گیا تو یہ بڑا کہرام مچائے گی۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بیماری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ پچھلی سرکاری رپورٹ میں اعداد و شمار دیکھے تو معلوم ہوا کہ ہر سال ایک لاکھ انسان اس موذی

مرض سے مرجاتے ہیں۔ اور دو لاکھ انسان اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ بیماری اسی رفتار سے پھیلتی چلی گئی تو دس بارہ سال میں اس ملک کی زمین میں مٹی کے ذروں سے کہیں زیادہ لہو کے دھبّے، لہو کے داغ نظر آئیں گے۔ جن میں کروڑوں کی تعداد میں کیڑے کلبلاتے ہوں گے، جنہیں چھلنی کرنے کو کوئی ثابت پھیپھڑا نہ ملے گا۔"

"اس بیماری کے اتنی تیزی سے پھیلنے کا سبب کیا ہے؟" نجمہ نے پوچھا۔
"صحت کے اصولوں سے عوام کی لاعلمی و لاپرواہی۔ چھوت چھات۔ گندی غذا۔ گندا ماحول۔ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کا فقدان۔ بیکاری و بیروزگاری۔ بھوک و افلاس۔ غم کھانا غم اوڑھنا۔ جس میں غم جاناں کم اور غم روزگار زیادہ۔ اقتصادی بدحالی و بے چینی۔ ایک نہیں اس کے پھیلنے کے کئی اسباب ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"اس بیماری کے خلاف محاذ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟" نجمہ نے پوچھا۔
"عوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کی اصلاح کی جائے۔ انہیں حفظانِ صحت کے اصولوں سے آگاہ کیا جائے۔ ان کے اقتصادی حالات بہتر بنائے جائیں۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"اس مرض کے مریض کو فوراً کسی ہسپتال میں داخل کرایا جائے۔ اس کا مناسب اور لگاتار علاج کیا جائے۔ اس کی، بدرک بمقام کے لیئے

لوگوں میں حفاظتی ٹیکے لگائے جائیں ۔"

مگر یہاں تو ہر ہسپتال میں نفسا نفسی کا عالم ہے ۔" نجمہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

" اس مرض میں مبتلا اِس بستی کی کئی عورتوں سے میں نے سُنا ہے کہ جن مریضوں کا کوئی وسیلہ نہیں ہوتا ہسپتال میں داخل نہیں ہو سکتے ۔ داخلہ لینے کے لئے انہیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ۔ کئی مہینے ان کو اسی انتظار میں گزر جاتے ہیں کہ جلدی سے کوئی بیڈ خالی ہو تو ان کی باری آئے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟"

" مریض زیادہ ہیں ۔ بیڈ کم ہیں ۔ ہسپتال کم ہیں ۔ نرسیں اور ڈاکٹر کم ہیں ۔" میں نے جواب دیا ۔

" تو پھر اس کمی کو پورا کیوں نہیں کیا جاتا ۔ آئے دن ٹی بی کے مریضوں کے لئے چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے ۔ ٹی بی ٹکٹ بیچے جاتے ہیں ۔ امدادی مشاعرے ہوتے ہیں ۔ دنگل ہوتے ہیں ۔ ویرائٹی شو ہوتے ہیں ۔ مینا بازار لگائے جاتے ہیں ۔ ریڈ کراس کے میلے ٹھیلے کافی روپیہ اکٹھا کرتے ہیں ۔ کیا اس سے ہسپتال نہیں بن سکتے ؟ وہ روپیہ کہاں جاتا ہے ؟"
نجمہ نے پوچھا ۔

" کیا معلوم کہاں جاتا ہے ۔" میں نے کہا ۔" بہر حال اس قومی کام میں اُن لاکھوں پتی لوگوں کو بھی حصہ لینا چاہئے ، جو اپنے لئے لاکھوں روپے کے بنگلے اور بلڈنگیں بناتے ہیں ۔ ان میں گلاب دیوی ، جانکی دیوی

ادھر سرگنگا رام ایسا کوئی دانی پیدا ہونا چاہئے۔ جو موت کے قریب پندرہ لاکھ انسانوں کو زندگی کا دان دے۔ مکتی ونر دان دے۔ ایک ہسپتال کا دان دے۔ دھرم دان دینے سے دھن گھٹتا نہیں بڑھتا ہے۔ نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور ضرور ملتا ہے۔ مگر لاکھوں پتی لوگ معلوم نہیں کیوں اس طرف توجہ نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔

"اور ڈاکٹر لوگ بھی مریضوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کئی ڈاکٹر تو اتنے جلال میں ہوتے ہیں کہ ان سے بات کرنا گویا خدا سے بات کرنا ہے۔ ان سے بات کرنے کی باضابطہ پرمٹ لینا پڑتی ہے۔ ان کے کمپوڈر یا اسسٹنٹ سے چِٹ لینی پڑتی ہے۔ ان کے کمرے کے دروازے پر گھنٹوں اٹن شن رہنا پڑتا ہے۔ ذرا بھی ریلیکس ہوئے تو گئے ردی کی ٹوکری میں۔ ڈاکٹر صاحب ریفر سمنٹ روم کے اندر اور مریض اپنے لواحقین کے ساتھ ڈسپنسری یا ہسپتال سے باہر کسی بس سٹاپ پر۔ گھر جاتے ہوئے راستے میں اگر اس کی نبض سٹاپ ہو جائے تو اسے خدا کی مرضی یا اتفاق کہا جائے گا۔ زندگی اور موت کی مشینری کے مکینک اپنے اوپر کوئی بات نہیں لیتے۔" نجمہ نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے اس موضوع پر تمہارے پاس وافر مواد موجود ہے۔ نجمی۔ ایسا کوئی ناول تو نہیں پڑھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"ناول نہیں۔ ایک جیتی جاگتی لہو تھوکتی کھانستی کہانی پڑھی تھی میں نے۔" نجمہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"بلقیس نے مجھے بڑی باتیں بتائی تھیں۔" نجمہ نے کہا۔

"کونسی بلقیس؟" میں نے پوچھا۔

"دادو کنجڑے کی بیوی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"اچھا وہ دادو۔ انیس خاں کا پڑوسی۔"

"ہاں وہی۔ دق تھی اس کی بیوی کو بھی۔"

"سنا تھا مرگئی اللہ کی بندی۔"

"ہاں مرگئی۔"

"کیا باتیں سنائیں تھیں اس نے تمہیں؟"

"بیچاری بڑی لاچار ہوگئی تو دادو اُسے کمیٹی کے ہسپتال میں لے گیا۔ کسی نے اُسے بتایا تھا وہاں علاج مفت ہوتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر بڑا رحمدل ہے۔ غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکے، دوائیاں، سوکھا دودھ بسکٹ وغیرہ مفت ملتے ہیں۔ مگر یہ تو اُسے وہاں جاکر معلوم ہوا کہ مفت تو آجکل موت بھی نہیں ملتی۔ پیسے بنا کوئی کام نہیں چلتا۔" نجمہ نے کہا۔

"کیوں کیا تکلیف پیش آئی اُسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی بیوی کی پرچی بنوا چکا تو نرس نے پرچی کے بیس پیسے مانگے۔ اس کی جیب میں اس وقت پانچ پیسے بھی نہ تھے۔ شرمندہ ہوکر بغلیں جھانکنے لگا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پاس ہی کوئی شریف آدمی کھڑا تھا۔ اس نے چپکے سے اس کی مٹھی میں چونی

دے دی۔ یہ پرچی لے کے آگے گیا تو ایک اور مصیبت میں پھنس گیا۔ ایک سڑیل سی ڈاکٹرانی گھومنے والی کرسی میں بیٹھی سب کو گھور رہی تھی۔ اس نے سلام کیا تو کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر سلام کیا تو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔"

"وہ کیوں؟"

"وہاں تو سانس لینے کی اجازت نہ تھی سلام کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی تھی۔ صرف سلام کرنے سے کمرے سے باہر ہونا پڑا۔ اور جو وہ کیوں کیا کرنے لگتا تو شاید کرسی بنا کر کہیں بچھا دیا جاتا۔"

"اور اس کی بیوی؟"

"اسے کمرے ہی میں ٹھہرا لیا گیا تھا۔ اس کی سکرین ہونی تھی۔"

"کمرے سے باہر ہو کر دادو کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یوں اٹن شن کھڑا رہا۔ یوں کھمبے کی طرح پورے دو گھنٹے کھڑا رہا۔ دونوں ٹانگیں جواب دے گئیں تو وہیں فرش پہ بیٹھ گیا۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"کیا وہاں کوئی بنچ نہ تھا بیٹھنے کو؟" میں نے سوال کیا۔

"تھا مگر اس پہ انتظار کی گھڑیاں گننے والے مریض یوں بیٹھے تھے جیسے کیلوں پر بیٹھے ہوں۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"کیا وہ تکلیف میں تھے؟" میں نے پوچھا

"سب کے سب جانکنی کے عالم میں تھے۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"کیوں ایسی کیا تکلیف تھی؟" میں نے پوچھا

"اب کوئی ایک تکلیف ہوتی تو کچھ پتہ چلتا وہاں نہ جانے کتنی تکلیفیں

ایک ساتھ چل رہی تھیں۔" نجمہ نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"جو اُس ہسپتال میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ دادو کی اور شامت آئی سامنے سے بھنگی گیلی بوری سے فرش صاف کرتے ہوئے آگیا۔ اس کے مزاج کا پارہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ جلی کٹی سنا کر دادو کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر گیا۔ نگاہ ادب روبرو۔"

"کیا مطلب؟"

"بڑے ڈاکٹر صاحب آرہے تھے۔ چپڑاسی، اہلکار، مریض سب ہٹو بچو کا شور مچا رہے تھے۔ دادو اُس دھاندلی میں دل کو پکڑے کونے میں دھنس گیا۔ مگر سرکار تو نہ آئی اندر سے چپڑاسی آگیا۔ دادو کو بلایا گیا تھا۔ وہ ڈرتا ڈرتا حاضر حضور ہوا تو یہ سنتے ہی اس کا بھرکس نکل گیا کہ اُسے پیسے جمع کرانے ہوں گے۔"

"کیسے پیسے؟"

"دواؤں کے۔ ٹیکوں کے۔"

"خیراتی ہسپتال میں تو پیسے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اب کیا معلوم کیا چکر ہے۔ بیچارہ دادو تو اس وقت چکرم بن کر رہ گیا۔ اس کی ہر چیز چکر کھانے لگی۔ بڑا لمبا چکر تھا۔ تین مہینے کا کورس۔ ہر روز اس کی بیوی کو ٹیکہ لگنا تھا۔ ہر روز اُسے ہسپتال میں آنا تھا۔ ہوا کے بند ہوتے ہوئے بھی دادو کے پھیپھڑے پسلیوں میں یوں پھولنے لگے۔ جیسے دھرتی کی

ساری ہوا یکدم اُن کے اندر گھس گئی ہے۔ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر پڑوسی کے چھکڑے میں اپنی بیوی کو لاد لدا کر وہاں لایا تھا۔ ہر روز آنے جانے کا جھنجھٹ اور پیسے جمع کرانے کی پتیا اس کے بس کا روگ نہ تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے لگا؛

"رونے لگا؟"

"اور کیا کرتا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ کہنے لگا۔ مائی باپ میں بڑا غریب ہوں۔ کنگال ہوں۔"

"پھر کیا جواب ملا؟"

"ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا اُسے کمرے سے دھکیل دیا گیا۔ دونوں میاں بیوی باہر اور دروازہ بند۔ وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ مگر اُسے زیادہ دیر سوچنا نہ پڑا۔ ایک مریض نے اُسے بڑے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جلدی جلدی وہاں پہنچا مگر چپڑاسی نے دروازے پہ ہی روک لیا۔"

"کیوں روک لیا؟"

"ڈاکٹر صاحب مصروف تھے۔"

"کسی مریض کو دیکھ رہے ہوں گے۔"

"معلوم نہیں اب وہ کیسے دیکھ رہے تھے۔ کیا دیکھ رہے تھے۔ باہر سے گرما گرم چائے، سموسے اور پھل جا رہے تھے۔ اندر سے ڈاکٹر صاحب کے گونجدار قہقہے آ رہے تھے۔ اور ان میں دبی دبی ہنسی کی سریلی گھنٹی کی سی آواز رہ رہ کر یوں مچل جاتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ڈاکٹر صاحب ایسے مصروف ہوئے ۔ ایسے مصروف ہوئے کہ دادو اور اس کی بیوی بیٹھے بیٹھے بنچ پر ہی سو گئے ۔ اور پھر جب اچانک ان کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر صاحب کی مصروفیت ختم ہو چکی تھی ۔ اور مریضوں کو دیکھنے کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا ۔ وہ اپنی کار میں انگوری رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی سریلی گھنٹی کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے ۔ دادو انہیں دیکھتا ہی رہ گیا ۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر ہڈیوں کی گٹھڑی کو کندھے پر اٹھایا اور چھکڑے میں لاد کر اپنی راہ لی ۔"

"کیا عجیب باتیں سنائیں تم نے ۔"

"میں پوچھتی ہوں ۔ یہ جو ہزاروں اور لاکھوں روپے چندے میں اکٹھے ہوتے ہیں ۔ ان میں دادو کی بیوی کا کوئی حصہ نہ تھا ۔"

"میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ۔" میں نے کہا ۔ "اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں جو چندہ اکٹھا کرتے ہیں ۔"

"سلیم بابو بلقیس کی باتیں سُن کر مجھے فلورنس نائیٹ انگیل اور ڈاکٹر الیگزنڈر فلیمنگ کا خیال آ گیا ۔ میں نے ایک رسالے میں ان سے متعلق ایک مضمون دیکھا تھا ۔ ڈاکٹر فلیمنگ نے پنسلین ایسی دوا ایجاد کر کے انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کیا ۔ فلورنس نائیٹ انگیل بیماروں کی تیمار داری میں وہ کرشمے دکھا گئیں جن کی مثال نہیں ملتی ۔ کیا ہماری دھرتی ایسے انسانوں کو جنم دینے کے معاملے میں بانجھ ہو گئی ہے ؟ کیا اس دھرتی سے ، اس مٹی سے ایسے انسان پیدا نہ ہوں گے ؟" نجمہ نے سوال کیا ۔

"ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"ترقی و تعمیر کے اِس ارتقا میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بہت کچھ بدل رہا ہے۔ بہت کچھ بدل جائے گا۔ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بہت کچھ ہو کر رہے گا۔ ارتقا کو روکا نہیں جا سکتا۔ ارتقا جاری ہے۔ ارتقا جاری رہے گا۔ اُس عرصہ تک جاری رہے گا جب تک کہ اِس معاشرے کا ہر انسان ایک مکمل اور مثالی انسان نہیں بن جاتا۔ رفتہ رفتہ بہت سی چیزوں کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ بہت سی چیزوں کی اصلاح کرنا پڑے گی۔ مہاتما کنفیوشس نے اس ارتقا کی بڑے ہی لطیف پیرائے میں تصویر کھینچی ہے۔"
"کیا تصویر کھینچی ہے انھوں نے؟"
"وہ کہتے ہیں اخلاقی ہم آہنگی کے لئے سب سے پہلے ہمیں خود اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرنا چاہیئے۔ قومی زندگی کی تنظیم کرنے والے سب سے پہلے گھریلو زندگی کو باقاعدہ بنائیں۔ جو لوگ گھریلو زندگی کو منظم بنانا چاہیں۔ وہ سب سے پہلے ذاتی زندگی کی تربیت کریں۔ اور جو لوگ اپنی ذاتی زندگی کی تربیت کرنا چاہیں۔ وہ سب سے پہلے اپنے دلوں کو پاک و صاف کریں۔ دلوں کو پاک صاف کرنے کی خواہش کرنے والے سب سے پہلے نیّتوں کو مضبوط بنائیں۔ نیتوں کو مخلص بنانے والے سب سے پہلے سمجھ اور مفاہمت پیدا کریں۔ اور سمجھ اشیا کے علم کی چھان بین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور سمجھ پیدا

ہو جائے تو نیت و ارادہ مخلص ہو جاتا ہے۔ اور جب نیت صاف اور ارادہ مخلص ہو جائے تو دل صاف ہو جاتا ہے۔ جب دل صاف ہو جائے تو ذاتی زندگی کی تربیت پوری ہو جاتی ہے۔ اور جب ذاتی زندگی کی تربیت ہو جائے تو گھریلو زندگی منظم اور باقاعدہ ہو جاتی ہے۔ اور جب گھریلو زندگی منظم ہو گی تو قومی زندگی بھی منظم ہو جائے گی۔ اور جب قومی زندگی منظم ہو گی تو ملک و قوم میں خوشحالی ہی خوشحالی ہو گی۔"

"بڑی اچھی باتیں کہی ہیں مہاتما کنفیوشس نے۔"

"میں ان اچھی باتوں کو عملی جامہ پہنا کر ملک و قوم کو خوشحال بنانے کا۔ پانچ کروڑ انسانوں کو خوشحال بنانے کا عزم کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے موت کے قریب انسانوں کو زندگی کے قریب لانے کے لئے کوئی ٹھوس کام کیا جائے۔ ٹوٹے ہوئے ڈھاروں اور گھاس پھوس کے ان تنگ و تاریک جھونپڑوں میں پڑے ہوئے بھوکے ننگے انسانوں کی غربت دور کرنے کے لئے ان کے دل سے زندگی سے مایوس ہو جانے کے احساس کو مٹانے کے لئے کوئی تحریک شروع کی جائے۔ جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوں۔ ترقی و تعمیر کا جذبہ ان کے اندر بھی بیدار ہو جائے۔ اور یہ بیداری ملک کے اس کونے سے لے کر اس کونے تک پھیل جائے۔ اور ہماری اجتماعی زندگی کے نظام کی مشینری کے جو کل پرزے غلط

کام کر رہے ہیں صحیح کام کرنے لگیں ۔ غلط اقدامات ۔غلط رجحانات اور غلط نظریے بالکل ختم کر دیئے جائیں۔ اور وہ کام شروع کر دیا جائے جسے اب شروع کر دینا چاہیئے۔"

"وہ تحریک کیا ہوگی ؟" نجمہ نے پوچھا۔

"ابتدا تھوڑے سے سرمائے کے ساتھ کسی گھریلو صنعت سے کی جائے۔ اس بستی کے بیکار لوگوں کو کسی کام پر لگایا جائے ۔عورتیں بھی فرصت کے وقت میں کام کریں ۔ اپنے کنبے کی خوشحالی کے لیئے محنت کریں۔ ترقی و تعمیر کے کام میں مردوں کے ساتھ وہ بھی حصہ لیں ۔ہم ان کے لئے کام مہیا کریں گے ۔ وہ محنت کریں۔ دولت کمائیں۔ ہم آمدنی میں سے ان کو ان کی محنت کا معقول معاوضہ دیں گے ۔ اور اپنی محنت اور وقت کا معاوضہ بھی اس میں سے لیں گے ۔ اور منافع کو اصلاحی و تعمیری کاموں میں لگائیں گے ۔ کیوں کیسا پلان ہے ؟"

"پلان تو بہت اچھا ہے ۔"

"ایسا کرنے سے ہم پندرہ لاکھ لھو تھو کتے کتنا نسنے انسانوں کی تکتی و ترہ ان کے لئے واقعی کوئی کام کر سکیں گے ۔ جھونپڑوں کے اس تاریک سمندر میں سویرے کی کوئی کرن پیدا کر سکیں گے ۔ ان بھو کے ننگے انسانوں کی زندگی میں کوئی تعمیری انقلاب لا سکیں گے ۔ ان کی زندگی ابھی تک کسی تعمیری انقلاب کی راہ دیکھ رہی ہے ۔ اور میں بڑی الجھن میں ہوں ۔"

"اُلجھن کیسی؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ دن رات سوچ رہا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ فقط کہانیاں اور افسانے لکھنے سے اس کام کی تکمیل نہ ہوسکے گی۔ ان کے ذریعے تو فقط پیغام دیا جا سکتا ہے۔ سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑا جا سکتا ہے۔ مردہ دلوں میں زندگی کی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے۔ قوت عمل سے خالی جسموں میں قوت عمل پیدا کی جا سکتی ہے۔ عمل کی مشینری کو متحرک کیا جا سکتا ہے مگر اُس مشینری نے کیا کرنا ہے۔ کیا بنانا ہے، یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ کونسی ایسی گھریلو صنعت شروع کی جائے جو بہت جلدی ترقی کر کے ہمیں اپنے ارادوں میں کامیاب کر دے۔ میں قلمکار ہوں۔ کہانیاں لکھنا جانتا ہوں۔ صنعت کار نہیں ہوں۔ صنعت کے متعلق کچھ نہیں جانتا مجھے اس وقت ایک صنعت کار ذہن کی ضرورت ہے۔ جو میرے ساتھ تعاون کرے۔ میری رہنمائی کرے۔"

"اس ضرورت کو میں پورا کر دوں گی۔" نجمہ نے بڑے اطمینان و یقین کے ساتھ کہا۔

"میں بتاتی ہوں تمھیں کیا کرنا چاہیئے سلیم بابو۔"

"ضرور بتاؤ۔ دیر نہ کرو نجمی۔" میں نے کہا۔

"میں اون کے موزے، دستانے، سوئیٹر، کوٹیاں، مفلر، ٹوپیاں بہت اچھی بنا سکتی ہوں۔ کشیدہ کاری بھی جانتی ہوں۔ یہ کام میں نے

ایک انڈسٹریل سکول میں سیکھا تھا۔ اور پھر وہیں مجھے استانی کی اسامی مل گئی تھی۔ انہی پیسوں سے میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ان جھونپڑوں اور ڈھاروں میں بسنے والی عورتوں کو میں یہ کام دنوں میں سکھا دوں گی۔ سلیم بالو تم مارکیٹ سے آرڈر لایا کرنا۔ ہم سب عورتیں مل جل کر کام کیا کریں گی۔ فی الحال تم یہ کام عورتوں تک ہی رہنے دو۔ چل نکلے گا تو پھر سوچ سمجھ کر اس کے ساتھ کوئی اور صنعت وسیع پیمانے پر شروع کر دیں گے۔ اُس میں تم اپنے ساتھ مردوں کو لگا لینا۔"

نجمہ کی یہ سکیم سن کر میں خوشی سے اچھل گیا۔ بہترین سکیم تھی۔ اور میں ڈریمر ہوں سکیمر اور ڈریمر دونوں نے مل کر کام شروع کر دیا۔ سکیمیں اور سپنے ہماری زندگی کے مشترکہ فریم میں اپنے سنہری دھاگوں سے گُل بوٹے بنانے لگے۔ نجمہ ہر ڈھارے میں گئی۔ ہر جھونپڑے میں گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں اس نے خواہشمند عورتوں کو کام سکھا کر اونی اشیا بنانے والی بہت سی انسانی مشینیں تیار کر لیں اور پھر ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت باضابطہ کام شروع ہوا۔ مجھے نٹنگ کے مختلف نمونے دیئے گئے۔ جنہیں میں اپنی کہانیوں کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے ٹوکرے میں شوکیس میں رکھ کر آرڈر لینے مارکیٹ میں نکلا۔ میری بھوک، میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد اس دن بڑا خوش تھا۔ وہ اس دن مجھ پر تنقید نہیں کر رہا تھا بس وہ خاموش تھا اور بڑا خوش جیسے کہہ رہا ہو۔ اب آئے سیدھے راستے پر۔ بڑھے چلو۔ بڑھے چلو۔ اب تم اپنے لیئے سب کے لیئے کتنی وزروان حاصل کر سکو گے۔

ابتدا میں کئی دشواریاں کئی رکاوٹیں راستوں میں آئیں مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔
اپنے کام میں لگے رہے۔ اور کام چل نکلا۔ آرڈر پر آرڈر آنے لگے۔ ہماری اشیا
نفیس، پائدار اور خوشنما ہونے کی وجہ سے بے حد پسند کی گئیں۔ سب اخراجات
نکال کر ایک سال میں ہم نے پانچ ہزار روپیہ کمایا۔ جس میں سے ایک ہزار روپیہ
بستی کی بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کیا۔ ایک ہزار روپیہ نادار بچوں کی تعلیم پر صرف
کیا۔ ایک ہزار روپیہ کام کو اور بڑھانے میں لگا دیا۔ بقایا دو ہزار روپیہ ٹی بی فنڈ
میں دے دیا۔ اور میرے گیان دھیان گوتم نے اپنی موڈ میں اُس دن کچھ ایسے
بھجن گائے کہ میری زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیس میں سجے سجائے اونی مفلر
موزے اور کہانیاں مجھے یوں معلوم ہوا جیسے ٹپ ڈانس کر رہی ہیں جلترنگ
بجا رہی ہیں۔ اور پھر ایکا ایکی نہ جانے کیوں اور کس بات پر ان میں احساس برتری
پیدا ہو گیا کہ ان کی آپس میں بوکسنگ ہونے لگی۔ جوا جٹسو ہونے لگی۔ موزے اور
مفلر پھٹنے لگے۔ کتابیں پھٹنے لگیں۔ ورق تیز تیز ہوا میں اڑنے لگے۔ اُون کے
دھاگے جھینگا مچھلی کی مونچھوں کی طرح میرے چہرے پر لٹکنے لگے اور میں نے
کرفیو لگا دیا۔ مارشل لا نافذ کر دیا۔ اور پھر میں نے ایک آنکھ والے یونانی
دیو پولائی سس کی طرح اپنا ایک ہاتھ اپنی زندگی کے ٹوکرے میں ڈال کر
انگلیوں سے کاغذ اور اون کی مخلوق کے منکے دبوچ لئے۔ مفلروں موزوں
کو ہٹا کر اِدھر کیا۔ کتابوں کو ہٹا کر اُدھر کیا۔ اور ہدایت کی۔ خبردار آپس میں لڑنا
نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی اس سکیم میں ایک دوسرے سے بہتر نہیں ہے۔ بڑا
نہیں ہے۔ تم سب اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے کام میں ایک سے ہو۔ جو کام

کہانیاں کر سکتی ہیں موزے اور مفلر نہیں کر سکتے۔ اور جو کام موزوں مفلروں سے لیا جا سکتا ہے کہانیوں سے نہیں لیا جا سکتا۔ تمہارا آپس میں لڑنا حماقت ہے۔ مل جل کر رہو۔ اپنا اپنا کام کرو۔ ہپ ہپ ہرے۔ کاغذ اور اُدن کی مخلوق نے تالیاں بجائیں۔ اور میں نے اُسی دن ایک بہت بڑے کام کا بونگ بجا دیا۔ بوٹ بنانے کا کارخانہ کھولنے کی سکیم تیار ہو چکی تھی۔ ضروری سامان بھی خریدا جا چکا تھا۔ اب میں نے گوندی پیر کے تکیے کے اُن لوگوں سے رجوع کیا۔ ان کی زندگی میں مولسری کی مہک پیدا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے بستی کے بیکار لوگوں کو اپنی طرف بلایا۔ میرے پاس ان کے لئے ایک پیغام تھا۔ ایک کام تھا۔ ان کی مکتی و نروان کا ایک روشن مانسہ۔ ان کی زندگی کے بند دروازے کی کنجی تھی اُس کام میں۔ مگر اسی اثنا میں انیس خاں پیچ میں کلبلا اٹھا۔ اب اُس سے صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارا ہر کام اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ ہماری ترقی و کامیابی کا ایک ایک لمحہ اُس کو گراں گزر رہا تھا۔ ہمارے کام کو سرد کرنے کے لئے اس نے ایک سکنڈل چلا دیا۔ اپنی قسم کے بستی کے دوسرے لوگوں کو اُس نے بھکایا میرے خلاف اکسایا کہ الیکشن کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ یہ کل کا چھوکرا ہمارے مقابلے میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ ہمیں جیتنا چاہتا ہے۔ یہ ہمارے اقتدار، ہماری عزت کو مٹی میں ملانے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اسی لئے اس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ یہ کھڑاگ کھڑا کیا ہے کہ ہمیں آسانی سے مٹا دے۔ بیکار کر دے۔ ہمیں گمنامی کے گڑھے میں دبا دے۔ جیسے بھی ہوا سے یہیں دبا دینا چاہئے۔

یہ دن بدن اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اس بستی میں اس کی ہر دلعزیزی بڑھ رہی ہے۔ لوگ اس سے بڑے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ اسے اچھا سمجھنے والوں کی نفری بڑھتی جا رہی ہے۔ جلدی سے اس کا کھڑنہ کرو۔ اور وہ سب ایک ہی ذہن کے اور ایک ہی سطح پر سوچنے والے لوگ میرے خلاف ہو گئے۔ میرے منصوبوں کے قلعوں کو اڑانے کے لئے اندر ہی اندر بارودی سرنگیں بچھانے لگے۔

میں اپنی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق گوندی پیر کے اللہ لوگوں کے پاس گیا تو وہاں اُن سے ہلا غُلا ہو گیا۔ وہ سب چرس چانڈو کے کش لگا کر حسب معمول اس وقت اللہ سے لو لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے جسم زمین پر تھے اور وہ آپ اللہ کے پاس تھے آسمان پر۔ میری آواز ان تک نہ پہنچ سکی۔ مگر ان کے مرشد کامل سمندر سائیں نے میری آواز کو سنا تو چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی طرح سائیں سائیں کرنے لگے۔

"درویشوں، ملنگوں، اللہ لوگوں سے بوٹ بنواتے ہو۔" وہ مجھے لال انگارہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولے۔

"نہیں جوتوں میں کھینچو گے۔"

"سائیں جی کیا ہرج ہے۔ بیکار بیٹھے رہنے سے جوتیاں بنانا کیا بُرا کام ہے۔" میں نے بڑی انکساری سے کہا۔

"بیکار نہیں بیٹھے رہتے۔ یہ سب اللہ اللہ کرتے ہیں۔ عاقبت سنوارتے ہیں اپنی۔ دنیا کے دھندوں میں کیا دھرا ہے۔" سائیں جی بولے۔

"اور محنت مزدوری کرنا بھی ایک عبادت ہے۔" میں نے عرض کیا۔

"ارے بابو یہ دنیا کو چھوڑ چکے ہیں۔ ان کی عبادت دنیا داروں کی عبادت سے الگ ہے۔"

"مگر یہ رہتے تو اسی دنیا میں ہیں جہاں دوسرے دنیادار رہتے ہیں۔"

"ارے بابو دوسری دنیا میں تو انسان مرنے کے بعد جاتا ہے۔ یہ ابھی زندہ ہیں۔"

"جی میں تو انہیں مردہ سمجھتا ہوں۔"

"کیا کہا مردہ۔" جلال کے زلزلے کی ان میں ایک لہر اٹھی۔

"جی بالکل مردہ۔ بیکار آدمی کو مردہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کے دماغ کو شیطان کا کارخانہ۔"

"کیا کہا شیطان۔" وہ جلال کی تیز رو سے کانپ گئے۔

"جی بیکار آدمی کے دماغ میں شیطانی باتیں ہی جنم لیتی ہیں۔ وہ بڑے الٹے سیدھے کام کرتا ہے۔"

"انپر تہمت نہ لگاؤ بابو یہ بیچارے تو اللہ اللہ کرتے ہیں۔"

"ان کے یوں اللہ اللہ کرنے کا فائدہ؟"

"اور بوٹ بنانے کا فائدہ؟"

"بوٹ بنانا ایک کام ہے۔ پیشہ ہے۔ انسان کوئی کام کرتا ہے روزی کماتا ہے۔ باعزت طریقے سے زندگی بسر کرتا ہے۔"

"انہیں روزی کمانے کی کیا ضرورت ہے۔ روزی انہیں اللہ کے ہاں سے

آتی ہے۔"

"اچھا تو من و سلوے اترتا ہے ان پر۔"

"تم دنیا دار کیا جانو کیا کیا اترتا ہے ان پر۔"

"جی دنیا کی اتر نہیں اوڑھنے والوں پر کچھ نہیں اتر سکتا آسمان سے۔" میں نے کہا۔

"یوں کہئے کہ ہر دو گھنٹے کے بعد ان کا نشہ اتر جاتا ہے۔"

"مذاق اڑاتے ہو درویشوں کا۔"

"جی مذاق نہیں میں ایک مقصد کی بات کر رہا ہوں۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔" سائیں جی آستین چڑھاتے ہوئے بولے۔

"میں اپنے لئے تو کچھ نہیں چاہتا۔ ان کے لئے ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی کام کریں۔ باعزت طریقے سے زندگی گزاریں۔ اس سوسائٹی اس سماج میں یہ بیکار نہیں ہیں۔ یہ اپنے آپ کو بیکار نہ سمجھیں۔ اپنے آپ کو بیکار نہ کہیں۔ بیکار نہ رہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔"

"ارے بابو یہ کیا جانیں بوٹ بنانے۔ کیا بیکار باتیں کر رہے ہو۔"

"ہم انہیں بوٹ بنانا سکھائیں گے۔ دو مستری اسی کام کے لئے ملازم رکھے ہیں۔ ہم انہیں دنوں میں کاریگر بنا دیں گے۔"

"ارے بابو تم کیا بنا سکو گے۔ اور کوئی کیا بنا سکے گا۔ سب کو بنانے والا تو اللہ ہے۔"

"جی یہ تو ٹھیک ہے مگر اللہ چرسی چانڈو باز نہیں بناتا۔"
"کیا کفر بول رہے ہو بابو۔ سب کچھ اللہ کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔"
"یہ غلط ہے جناب۔ اللہ چرس چانڈو پینے کا حکم نہیں دیتا۔ میں چرسی اور چانڈو باز بنانے والے خدا کو نہیں مانتا۔"
یہ سنتے ہی سائیں جی آگ بگولہ ہو گئے۔ کڑکنے لگے۔
"تم مشرک ہو۔ ملحد ہو۔ کافر ہو۔ فل بوٹ ہو۔ تم اللہ کو نہیں مانتے۔ پیروں فقیروں کو نہیں مانتے۔ تمہاری بات کون مانے گا۔"
اتنی سی بات تھی جسے سائیں جی نے بتنگڑ بنا دیا۔ اور پھر جو انھوں نے ہُو حق کا ایک ایٹمی نعرہ لگایا تو اس کے دھماکے سے نشے کی پینک میں اونگھتے جھومتے دس بیس بیڈول پھکڑ یکدم چونک گئے۔ سائیں جی کا معرفتی اشارہ پاتے ہی ان کی آنکھوں میں کسی وحشی درندے کی چمک آگئی۔ گھورنے غراتے اٹھے۔ بھگڈر مچا دی۔ کسی نے اینٹ اٹھائی، کسی نے پتھر۔ کوئی حجرے سے لپک کر لاٹھی لے آیا کوئی بانس۔ کسی نے چرس پینے والے نلیان کی نڑی کھینچ لی۔ کسی نے جوتا پکڑ لیا اور پل پڑے۔ اچھلتے ہوئے، کودتے ہوئے، اناپ شناپ بکتے ہوئے مجھے چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا۔ ایک دو نے پتھر بھی اچھالے۔ میرا ماتھا زخمی ہوگیا۔ اتنے میں انیس خاں اپنی نئی نویلی دلہن رخسانہ کو ساتھ لئے اپنی میٹھی مراد پوری ہونے کی خوشی میں گوندی پیر کے مزار پر منت چڑھانے آیا۔ اپنے ساتھ بوندی کے لڈو لایا۔ شیرینی کے تھال دیکھ کر سمندر سائیں کے شیر تو ادھر ہو گئے اندر میں

ادھر چلا آیا۔ میرے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ مجن مچھیرے نے جلدی سے اپنے سلوکے کی جیب سے ایک چیتھڑا سا نکال کر میرے ماتھے پہ پٹی باندھی۔ یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بولا۔

"سلیم بابو ان کی رپٹ کرا دو تھانے میں۔ شہادت میں دوں گا۔"

مگر میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکے سے گھر کا راستہ لیا۔ میں تھانے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہنگامہ کرنے والے لوگ مجھے سمجھے نہ تھے۔ میں انہیں سمجھا نہ سکا تھا۔ میری باتیں انھوں نے عقل سے نہیں جذبات سے سنی تھیں۔ جذبات میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میرے گیان دھیان کا گوتم گیان دھیان میں مگن تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ مطمئن تھا۔

اس ہنگامے کو انیس خاں نے اور ہوا دی۔ سائیں جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کو اور بھڑکایا۔ میرے خلاف بستی میں بڑا ہی زہریلا پراپگنڈا کرنے کی ترغیب دی۔ وہ میرے خلاف گھر گھر زہر پھیلانے لگے۔ لوگوں میں اعتقادی جذبات بھڑکانے لگے۔ اس بات کو عقیدہ و اعتقاد کی بات بنا دیا گیا۔ میرے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ میں خدا کو نہیں مانتا۔ پیروں فقیروں کو نہیں مانتا۔ ان کی شان میں گستاخیاں کرتا ہوں۔ بستی کے لوگ مجھ سے بدظن ہو گئے۔ جس کا ہمارے کام پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کئی عورتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے مارکیٹ میں ہمارے مال کی سپلائی کسی حد تک رُک گئی۔ وقت پر مال نہ ملنے سے کئی گاہک ٹوٹ گئے۔ گودام میں دس بارہ ہزار روپے کی مالیت کا خام مال پڑا تھا۔ جسے آگ لگا کر جلا دیا گیا اور کچھ سراغ نہ ملا آگ لگانے والے کون

تھے ۔ ادنی مال بنانے والی دو مشینیں خریدی تھیں وہ بھی اسی اثنا میں چرا لی گئیں۔
اس بستی کے اندھیروں میں کسی سویرے کا انتظار کرنے والے اندھیروں کے
مسافروں کے اجالے کی آخری کرن بھی چرا لی گئی ۔ جلادی گئی۔ جھونپڑوں
میں کھانستے لہو تھوکتے پچیس فیصدی کھوکھلے ڈھانچوں کی زندگی کی آخری رمق
بھی مٹ گئی۔ کام چل رہا تھا تو انہیں سب کچھ مل ہی رہا تھا ۔ دوائیاں ، دودھ
مکھن ۔ انڈے ۔ بسکٹ ۔ پھل ۔ جو ہم سے ہو سکتا تھا اُسے زندگی کا سب سے
بڑا فرض سمجھتے ہوئے ہم کر ہی رہے تھے ۔ مگر جب سارے راستے مسدود
ہو گئے تو ہم مجبور ہو گئے ۔ نقصان ہو جانے کا مجھے اتنا افسوس نہ تھا۔افسوس
تو اس بات کا تھا کہ نقصان کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ وہ کس کا نقصان
کر رہے ہیں ۔

اس ابتری میں انیس خاں کی بن آئی تھی ۔ اُس نے بستی میں ایک ہوزری
اور دو کارخانے کھول دیئے ۔ ہوزری میں ادنی مال تیار ہونے لگا ۔ایک کارخانے
میں صابن بنانے کا کام شروع کر دیا گیا اور دوسرے میں جوتے بنانے کا۔ وہ
عورتیں جو ہمارے یہاں کام کرتی تھیں وہاں کام کرنے لگیں ۔ اگر بندو گوالہ اور
اس کی بیٹی گوری اس وقت ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو کام اُسی وقت ٹھپ
ہو جاتا ۔ انیس خاں نے بندو اور اس کی بیٹی کو دھوکہ دیا تھا ۔ وہ دونوں اس کے
سخت خلاف ہو گئے تھے ۔ انھوں نے اپنی برادری کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ
ملا لیا تھا ۔ ہونے والے الیکشن میں انیس خاں ان کی برادری سے اب ایک

ووٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ بندو گوالہ پوشیدہ طور پر اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر رہا تھا۔ انیس خاں نے اس کی بھولی بھالی بیٹی کو برباد کر دیا تھا۔ یہ بات بندو کی برادری کے لوگوں کے دلوں میں بھی پھانس بن کر رہ گئی تھی۔ اور گوری کا تو اس صدمہ سے بہت برا حال ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس نے لہو تو نہیں تھوکا تھا مگر کھانسنا شروع کر دیا تھا۔ نجمہ اُسے بڑی تسلیاں بڑے دلاسے دیا کرتی تھی۔ اس کے دل سے ایک ایسے مرد کی یاد کو نکالنے کی کوشش کیا کرتی تھی جو مطلبی تھا۔ جھوٹا تھا۔ ہرجائی تھا۔ دولت کے لالچ میں آ کر بڑے میاں نے انیس خاں کو اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ دے کر گوری پر بڑا ظلم کیا تھا۔ جس کے خیال سے نجمہ بہت حساس ہونے کی وجہ سے بڑی نادم تھی۔ گوری کے دل کی چوٹ اس کے دل کی چوٹ بن گئی تھی۔ وہ گوری کو اپنی بہن سمجھنے لگی تھی۔ گوری کے ساتھ اُسے بہنوں کا سا پیار ہو گیا تھا۔ کام کے سلسلے میں گوری اس کے پاس آتی تو دونوں مل کر کھانا کھاتیں۔ دنوں ہی میں ان میں بڑی گہری چھننے لگی تھی۔

مارکیٹ کو ہاتھ میں لینے کے لئے انیس خاں نے ہمارے ڈگمگاتے کاروبار پر ایک اور کاری ضرب لگائی۔ ہمارا کام بالکل ٹھپ کرنے کے لئے اُس نے اونی مال کے نرخ لاگت سے بھی نیچے گرا دیئے۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہو رہا تھا۔ وہ نقصان اٹھا کر ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اچھی خاصی رقم اس نے علیحدہ کر دی تھی۔ ایک طرف بستی کا ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس کے ملٹے کام کرنے والے آدمیوں کی ایک

جماعت بھی اس کے ساتھ۔ اور دوسری طرف فقط دو گھبرائے ہوئے، تھکے ہوئے، الجھنوں میں الجھے ہوئے کم سرمایہ انسان۔ مخالف ہواؤں کے اس ریلے کے آتے ہی ہمارا کام بالکل فلاپ ہو گیا۔ جوتے بنانے کا کام شروع کرنے کے لئے جو دو اڑھائی ہزار روپے کا سامان خریدا تھا وہ بھی بالکل خراب ہو گیا۔ اب اتنا سرمایہ نہ رہا تھا ہمارے پاس کہ اس کام کو شروع کیا جاتا میں نے اُسے فروخت کرنے کی کوشش بھی کی مگر کوئی معقول گاہک سامنے نہ آیا۔ چوڑوں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز والا معاملہ کرنے کو میں تیار نہ تھا۔ اور اُس سامان کو گر کر فروخت کرنے کی اس وقت چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ دو اڑھائی ہزار روپے کی رقم کھٹے پڑ گئی۔ کونے میں جا لگی۔ کاٹھ کباڑ بن گئی۔ پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے انسانوں کی مکتی و نروان کے راستے دھندلے ہو گئے۔ ان پر دھند چھا گئی۔ سوچا تھا یہ کام ہماری محنت و مشقت سے بڑا وسیع ہو جائے گا تو ایک ٹرسٹ قائم کر کے دق کے مریضوں کے لئے ہسپتال بنائیں گے۔

انیس خاں اینڈ کو ٹرسٹ تھا ان کارخانوں کے کاروباری منافع سے کرم دھرم کے کئی کام کرے گی۔ یتیموں اور بیواؤں کو پالا پوسا جائے گا۔ بستی کے نادار بچوں کو پڑھایا لکھایا جائے گا۔ ان کا مستقبل روشن کیا جائے گا۔ ڈھاروں اور چھپروں میں لہو تھوکتے انسانوں کی مناسب دیکھ بھال کی جائے گی۔ ان میں دوائیاں اور کھانے پینے کی ضروری چیزیں تقسیم ہوتی رہیں گی۔ دق کے خلاف جہاد کرنے والوں کو، محاذ قائم کرنے والوں کو اس بستی میں بھی محاذ قائم کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ میں اور نجمہ بہت خوش تھے۔ جس مہم میں ہم ناکام ہو گئے تھے

اُسے کامیاب بنانے کا بستی کے چوہدری نے بیڑہ اٹھالیا تھا۔ہم چاہتے تھے اگر پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے انسانوں کے لئے ہم کچھ نہ کرسکیں تو کم ازکم اس بستی کے پچیس فیصد لہو تھوکتے کھانستے انسانوں کے لئے تو کچھ کیا جائے۔ اپنی مدد آپ کرو کے جذبے کے تحت اس بستی میں بیداری پیدا کرنا ہمارا مقصد تھا۔ دق کے بخار سے تپتے ہوئے پچیس فیصد انسانوں کے اس ریگستان میں کوئی نخلستان پیدا کرنا ہمارا مقصد تھا۔ مگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے، مگر ہم خوش تھے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کی آوازیں دن رات ہمارے کانوں میں آرہی تھیں۔ اس بستی کے اندھیروں میں روشنی کا بندوبست کیا جائے گا۔ روشنی کا ایک مینارہ بنایا جائے گا ایک سوشیل ویلفیئر سوسائٹی قائم کی جائے گی۔ اس بستی کو جنت بنایا جائے گا۔ گندگی وغلاظت کے ڈھیروں کو ہٹایا جائے گا۔ آنے جانے کے لئے چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنائی جائیں گی۔ گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیوں کا انتظام کیا جائے گا۔ عنقریب ہی حکومت کے تعاون سے ڈھاروں اور جھونپڑوں کو خوشنما کوارٹروں میں بدل دیا جائے گا۔ یہ بستی سے لائٹ ٹاؤن بن جائے گی۔ مگر ایسا تو کچھ نہ ہوا البتہ انیس خاں نے اسی اثنا میں بستی میں اپنے چھ سات مکان اور بنا لئے۔ اپنے کارخانوں میں کام کرنے والی بے سہارا کئی عورتوں کو اپنی داشتہ بنالیں۔

میری ازدواجی زندگی کے ساتویں سال میں میری زندگی کی ایک بہت بڑی ٹریجڈی نے میرے سب سے چھوٹے بچے کامران کے ساتھ جنم لیا۔ اس کی

پیدائش سے چار دن بعد نجمہ کو بخار آنے لگا۔ مڈوائف نے سمجھا سوئیکی بخار ہے چند روز میں اتر جائے گا۔ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق علاج کرتی رہی۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ میں نے ایک قریبی ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ بخار کے ساتھ اب نجمہ کو کھانسی بھی آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو تشویش ظاہر کی۔ اس نے مشورہ دیا مریضہ کی سکرین کرائیے۔ لہذا اُسی دن سکرین کرائی گئی۔ رپورٹ ملی تو معلوم ہوا نجمہ کو دق ہوگئی ہے۔ اس کے بائیں پھیپھڑے میں چھوٹا سا داغ نکلا۔ بس خراش سی۔ مگر ڈاکٹر سکرین رپورٹ سے مطمئن نہ تھا۔ مشورہ دیا اب مریضہ کا ایکسرے کرائیے۔ ایکسرے رپورٹ میں بھی بائیں پھیپھڑے میں نقص نکلا۔ بس چھوٹا سا داغ۔ خراش سی۔ مگر وہ خراش سی مجھے ایک بہت بڑی خلیج نظر آئی جو میرے اور نجمہ کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔ ایک انمٹ خلا جو اس کے اور میرے درمیان آہستہ آہستہ پھیلنے لگا تھا۔ میری بے چینی و پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ طرح طرح کے وسوسوں اور کھٹکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے گیان دھیان کی دنیا میں لہو تھوکتی کھانستی پندرہ لاکھ زندہ لاشوں میں ایک اور لاش کا اضافہ ہوگیا تھا۔ کابوسی خواب میری نیندوں پہ شبخون مارنے لگے۔ میں وحشت کے بہت قریب تھا۔ لیکن دق کے متعدد ماہرین نے میری ڈھارس بندھائی۔ ان کی تسلیوں نے مجھے سنبھالا دیا۔ انھوں نے کہا

"اب یہ مرض لاعلاج نہیں رہا۔ موجودہ میڈیکل سائنس نے اس پہ کافی حد تک قابو پالیا ہے۔ مریضہ اچھی ہوجائے گی۔ اسے فوراً کسی ہسپتال میں داخل کرا دیجئے۔"

مگر نجمہ کسی ہسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بہت سی باتیں سن سنا کر وہ ہسپتالوں سے بہت خائف ہو چکی تھی۔ اور اس کی حالت بھی کچھ ایسی تشویشناک نہ تھی۔ لہٰذا میں نے گھر میں ہی اس کے علاج کا بندوبست کیا۔ دق کے ایک ماہر ڈاکٹر کی زیر ہدایت اس کا علاج ہونے لگا۔ پہلا کورس۔ دوسرا کورس۔ تیسرا کورس۔ علاج بدستور جاری رہا۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ ایلوپیتھی۔ ہومیوپیتھی۔ بائیوکیمک۔ آیورویدک۔ طب یونانی۔ کوئی طریقہ علاج ایسا نہ تھا جس سے رجوع نہ کیا گیا ہو۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ داغ جتنا تھا بدستور اتنا ہی رہا۔ اسی کشمکش میں تین سال گزر گئے۔

یہ بڑی شاہانہ بیماری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کو لگ جاتی ہے جو شہنشاہ نہیں ہوتے۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں نے نجمہ کی بیماری پہ لگا دیا جیسے ہارا ہوا جواری ادھر اُدھر سے مال لوٹ کھسوٹ کر داؤ پہ لگاتا چلا جاتا ہے کہ شاید پانسہ اس بار ہی ساتھ دے جائے اور وہ جیت جائے۔ مگر میری قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا اور وہ وقت آ گیا جسے ابھی نہ آنا چاہیئے تھا۔ نجمہ کی حالت یکدم بہت خراب ہو گئی۔ نکاہت و کمزوری اس کے جسم میں حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس کے چہرے پہ مدت کی پرچھائیاں سرسرانے لگیں۔ وہ لہو تھوکنے لگی۔ لہو۔ میری ڈریم لینڈ کی مونالزا کا لہو۔ میرے سپنوں کی بستی کی بیاطرس کا لہو۔

یہ بڑا کٹھن وقت تھا مجھ پہ۔ یہ زمانہ میری زندگی نے میرے جسم میں نہیں نجمہ کے سینے کے ہر داغ میں گزارہ۔ میرے اقتصادی حالات کچھ ٹھیک نہ تھے۔

کئی دنوں سے کوئی کہانی، کوئی ناول نہ بکا تھا، ریڈیو اور اخباروں، رسالوں کے لئے لکھ رہا تھا اور اسی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ کہانیوں کا بیوپاری۔ اس کی مدقوق بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے بڑی مشکل میں تھے۔ لوگ کہانیاں بہت کم خریدتے ہیں۔ کہانیاں بہت کم اور کبھی کبھی بکتی ہیں۔ کہانیوں سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ کہانیوں کو اوڑھا نہیں جا سکتا۔ اور اگر کسی داستان گو کی بیوی کو دق ہو جائے تو وہ اپنے شوہر کی لکھی ہوئی کہانیوں کو دوائیوں کے طور پر استعمال نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر کہانیاں لے کر مریضوں کا علاج نہیں کرتے۔ بڑی مشکل میں جان آگئی تھی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے نجمہ کو نہ تو مناسب غذا دی جا سکتی تھی اور نہ دوا۔ اور بیماری زور پکڑتی جا رہی تھی۔ داغ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ آخری سکریننگ رپورٹ نے تو ہمارے چھکے چھوڑا دیئے۔ نجمہ کا بایاں پھیپھڑا آدھے سے زیادہ ماوف ہو چکا تھا۔ اب وہاں ایک نہیں کئی داغ تھے۔

"کہیں کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے سلیم بابو؟" ایک دن نجمہ نے کہا۔

"ان کہانیوں میں کیا دھرا ہے۔ دن رات گردن جھکائے قلم چلائے جاتے ہو۔ مگر ان سے حاصل تو کچھ بھی نہیں ہوتا دو بچوں کی فیس۔ گھر کا خرچ۔ میری دوائیاں۔ کب تک کھینچ کھانچ کر وقت پورا کرتے رہو گے۔ ہر شخص اپنے مستقبل کو سامنے رکھ کر زندگی میں کوئی کام کرتا ہے۔ چھوڑو اس کام کو۔ کیا تمھیں اپنے مستقبل کی فکر نہیں۔ کیا تم نے اپنے آنے والے وقت کے متعلق بھی کبھی

کچھ سوچا ہے۔"
"میرا مستقبل بڑا درخشاں ہے نجمی۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے مستقبل کے متعلق اب رائٹرز گلڈ سوچے گی میں نہیں سوچوں گا۔ جب سے یہ گلڈ وجود میں آئی ہے میں نے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا بالکل بند کر دیا ہے۔ میں فقط لکھنا رہوں گا۔ لکھتا چلا جاؤں گا۔ کہانیاں۔ افسانے۔ اب مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں سوچنا۔"
"رائٹرز گلڈ کیا ہے؟" نجمہ نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔
"ملک کے قلمکاروں کی نمایندہ جماعت ہے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ان کے بنیادی حقوق کی محافظ جماعت ہے۔ ان کی کامریڈ جماعت۔ ان کے ہر مسئلہ کا حل سوچنے والی جماعت۔ ان کی ہر مصیبت میں کام آنے والی جماعت۔ نجمی۔"
"سلیم بابو۔"
"جب سے یہ جماعت وجود میں آئی ہے میرا بوجھل دل ہر وقت ہلکا پھلکا رہنے لگا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اب میں لاوارث نہیں رہا۔ میرا کوئی وارث۔ میرا کوئی مونس و غمخوار میرا کوئی ہم جلیس پیدا ہو گیا ہے۔ اب میری لاش لاوارث نہیں کہلائے گی۔ میرے مسودوں کے کاغذ سی پرو کر مجھے کاغذ کے

کفن میں نہیں کفنایا جائے گا۔ اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔ میرے لئے ۔ ہر قلم کار کے لیئے ۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے نجمی۔ یہ جماعت نہ صرف قلمکار بلکہ اس کے بچوں کے مستقبل کی بھی محافظ ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

"اس کے منصوبوں میں ہر قلمکار کے بچوں کو تعلیم دینے کا منصوبہ بھی ہے۔ ہر سال بہترین ذہنی کاوشوں کا یہ جماعت قلمکاروں کو ہزاروں روپے کا انعام بھی دیا کرے گی۔ جہاں تک اس جماعت کی افادیت کا تعلق ہے ہمارا ملک سب سے آگے بڑھ گیا ہے نجمی۔ اور کسی ملک میں ایسی کوئی جماعت نہیں جو ہر قلمکار کے ہر پیچیدہ مسئلہ پر غور و خوض کرے اور اس کا صحیح حل تلاش کرے۔ یہ اپنی قسم کی واحد نمایندہ جماعت ہے اور اسے ہمیشہ رہنا چاہئے۔ اس کی نمایندگی میں اس ملک کا قلمکار بڑی خوشحال زندگی بسر کرے گا۔"

"پھر تو یہ بڑی اچھی جماعت ہے۔ لیکن اسے چلانے کے لئے ایسے اچھے ورکروں کی ضرورت ہے جو نیک نیتی سے اس کے لئے کام کریں۔ اس کے نام اور نشان کے جھنڈے کو ہمیشہ اونچا رکھیں۔ جو بغیر کسی مطلب ، غرض ، جانبداری ، ناانصافی اور حق تلفی کے اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔ ایسی جماعت کو چلانے کے لئے ایسے ہی انسانوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ تو بتایا ہوتا یہ منصوبے کب عمل میں آئیں گے ؟"

"اس میں کچھ وقت لگے گا۔ ارتقا جاری ہے۔ ہر چیز میں جاری ہے۔ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بہت کچھ ہو جائے گا۔ تم اس کا کچھ خیال نہ کرو نجمی۔ اور مجھے ایک مشورہ دو۔"

"کیسا مشورہ؟"

"تمہاری اور تمہارے بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے سوچا ہے کہ وقت کے بدلنے تک اس بستی میں نائٹ اسکول کھول دوں۔ بچوں کو گیان دھیان کا پاٹھ دیا کروں گا۔ دیکھو نجمی میں تمہارے لئے۔ تمہاری طرح کے پندرہ لاکھ انسانوں کے لئے مکتی و نروان کا راستہ تلاش کر رہا ہوں۔ میرے پاس کسی کی نوکری کرنے کا وقت کہاں ہے۔ اور مکتی یکدم حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر میں تمھیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لئے تو میں نائٹ اسکول کھول رہا ہوں۔ صبح کو کہانیاں بیچوں گا اور رات کو بچوں کو پڑھاؤں گا۔"

"میں کہتی ہوں انیس خاں خبیث نے تمہارا اسکول کبھی نہیں چلنے دینا۔ چلتے چلاتے تمہارے کام اس نے بند کروا دیئے۔ اسکول کو بند کرانا اس کے لئے مشکل بات نہ ہوگی۔ اور پھر بستی کے سارے لوگ تو تم سے بدظن ہو رہے ہیں۔ تمھیں دہریہ کہتے ہیں۔ خدا کا دشمن۔ پیروں فقیروں کا دشمن کہتے ہیں۔ اپنے بچوں کو تمہارے اسکول میں پڑھنے کے لئے ضرور ہی بھیجیں گے۔ کسی وقت تو تم بالکل بچوں کی سی باتیں

کرنے لگتے ہو سلیم بابو۔"

"تم فکر نہ کرو نجمی۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس شہر کے بہت بڑے رئیس کو ایک سوشیل ویلفیئر سوسائٹی قائم کرنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ وہ میری کہانیوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ مجھ سے بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ میں نے اُسے ایک پلان بتایا تھا کہ سوسائٹی میں ایک کوآپریٹو سٹور بھی بنائیں گے جس کی آمدنی میں سے کام کرنے والوں کا معاوضہ نکال کر منافع کی آدھی رقم سرمایہ کار لے جائے اور آدھی رقم دق کے مریضوں پر صرف کی جائے۔"

"پھر اُس نے کیا کہا؟"

"وہ رضامند ہو گیا ہے۔ عنقریب ہی کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس نے دیہات میں دو بیگھے زمین خریدی ہے۔ فروٹ فارم بنائیگا۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ ادھر سے فارغ ہوتے ہی وہ اس کام کی طرف پوری پوری توجہ دے گا۔"

نجمہ یہ سن کر خوش ہو گئی۔ بڑے دنوں کے بعد میں نے اُسے پھر مسکراتے دیکھا تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مکتی کے اجالے کی سب سے پہلی کرن نے میرے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ یہ مجھے اس دن معلوم ہوا کہ نجمہ اور میں بالکل ایک طرح سوچتے تھے۔ لیکن اس بستی کا سب سے بڑا اسکنڈل ساز انیس خاں ہمارے متعلق اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ نجمہ کی تشویشناک علالت بھی اس کے لئے بڑی خوشی کا باعث

تھی۔ اور وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ وہ لڑکی جس نے اس کی بیوی بننا پسند نہ کیا تھا موت کے چنگل میں تھی۔ وہ نجمہ اب دن رات لہو تھوک رہی تھی جس نے اس کے دل کو ٹھیس لگائی تھی۔ اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ ہاں وہی نجمہ جو نکاح کے موقعہ پر گھر سے بھاگ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ جس نے عدالت میں کھڑے ہو کر میرے ساتھ شادی کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ اُس نجمہ کو زندگی اور موت کے درمیان سسکتا دیکھ کر اندر سے بہت خوش تھا۔ وہ اُس سے ایسی حالت میں بھی بیر لینا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی ساس کو اُکسایا۔

" بڑی بی نجمہ آخر تمہاری بیٹی ہے۔ اُس سے جو کچھ ہوا خاک ڈالو اس پر معاف کر دو اس کی غلطی۔ کسی وقت اس کے پاس جاؤ۔ اور اُسے بتاؤ کہ اس کی ساس نے اُسے مسان کھلا دیئے ہیں "

" مسان ـ " بڑھیا چونک گئی۔

" ہاں - میں آج مزار پر گیا تھا۔ سمندر سائیں استخارہ کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ انھوں نے استخارہ میں اس بستی پر ایک نظر ماری تو نجمہ کے روگ کی رام کہانی بھی اُن سے چھپی نہ رہی۔ بتاؤں سائیں جی کیا کہتے ہیں ؟"

" کیا کہتے ہیں ؟"

" وہ کہتے ہیں نجمہ کی ساس اپنے بیٹے کا بیاہ اپنے رشتے داروں میں کرنا چاہتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے یہ کارن کیا ہے "

"اچھا تو میں آج ہی نجمہ سے ملتی ہوں۔ اور اس بیوقوف لڑکی کو اس کے چھینتے کی اور اس کی ماں کی کرتوت بتاتی ہوں۔ خدا انہیں غارت کرے کیسا میٹھا پھیر لیا ہے میری بچی سے۔ چوہدری بیٹا سائیں جی سے کہا ہوتا وہ تمہاری سالی کے لئے کچھ کریں۔"

"وہ سب کچھ کریں گے۔ ابھی وقت ہے۔ نجمہ سے کہو وہ بچوں کو چھوڑ کر۔ اُس خبیث کو چھوڑ کر یہاں چلی آئے۔"

نجمہ کی ماں اپنی بیٹی رخسانہ کو ساتھ لے کر اُسی دن نجمہ کی خبر لینے آئی۔ ماں اور بہن کو دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی۔ اٹھ کر گلے ملی۔ بڑی عزت سے بٹھایا۔ بازار سے بہت کچھ منگوا کر ان کی خاطر تواضع کی۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کامران کو بستر پر لٹا کر ایک ضروری کام سے باہر چلا گیا۔ اور میری ساس کو کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ مل گیا۔ لہذا اس نے ایسے ایسے ڈھکوسلے گھڑے۔ ایسی ایسی ہوائیاں چھوڑیں۔ ایسے ایسے داؤ چلائے کہ نجمہ اس کی باتوں کو سچ سمجھنے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے مسان کھلائے گئے ہیں۔ ادھر انیس خاں نے گوندلی پیر کے مجاور سمندر سائیں کو سب کچھ سکھا پڑھا کر تیار کر چھوڑا تھا۔ وہ لوگ پہلے ہی میرے خلاف تھے۔ خوب موقعہ مل گیا تھا انہیں مجھے چھیلنے کا۔ مجھے اس کا علم بھی نہ ہوا اور میری ساس نجمہ کو پالکی میں بٹھا کر مزار پر لے گئی۔ جہاں سمندر سائیں نے ایک عجیب پاکھنڈ کیا۔ حجرے میں اگربتیاں لوبان جلایا۔ پھول بتاشے رکھے۔ مصلے بچھا کر اُس پر بیٹھ گیا۔ استخارہ کیا۔ یعنی ایک ڈرامہ کیا۔ نجمہ سے کہنے لگا۔

"تمھیں تمہاری ساس نے مسان کھلائے ہوئے ہیں۔ اور تمہارا خاوند تم سے دکھاوے کی محبت کرتا ہے۔ وہ تمہاری موت کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ بچوں کو چھوڑ دو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اپنی ماں کے پاس آ جاؤ۔ چالیس دن لگاتار بڑے پیر کی چونکی دو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ نہیں تو مر جاؤ گی۔ بڑے تھوڑے دنوں کی مہلت رہ گئی ہے۔ مسان اپنا کام کر جائیں گے۔"

ان جعل ساز انسانوں کی باتوں نے نجمہ کا دل میری طرف سے کچھ کھٹا کر دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ کھچی کھچی رہنے لگی۔ یہ کھچاوٹ دیکھ کر میں سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگا کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ نجمہ مجھ سے کھچی کھچی کیوں ہے؟ مجھ سے کیا قصور ہو گیا ہے؟ میں نے اُسے کریدا اور کامیاب ہو گیا۔ اُس نے مجھے ساری باتیں بتا دیں۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

"میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں نجمی۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب انیس خاں کی شرارت ہے۔ تمھیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گھر کو برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تم اگر چھوڑنا چاہتی ہو تو چھوڑ جاؤ میں تمھیں کسی حالت میں بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے قدموں میں دم

دوں گی۔ میں تمھیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر ایک دو چونکیاں دیکھے دیکھ لوں تو کیا ہرج ہے۔ شاید خدا شفا دے دے۔ تمھیں اس میں کیا اعتراض ہے بابو۔ علاج تو بہت ہو چکا۔ دوائیاں تو سب استعمال کر کے دیکھ لیں۔ دن بدن جان جواب دیتی جا رہی ہے۔ آخر تمھیں کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر ایسا کرنے سے پہلے تمھیں لیڈی ڈاکٹر فردوس سے ضرور مشورہ کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ تم اس کے زیر علاج ہو۔ اور پہلے سے تمہاری حالت کچھ سنبھلی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو میں لیڈی ڈاکٹر فردوس سے بات کر دوں گی۔" نجمہ نے جواب دیا اور لیٹ گئی۔ اس کی بائیں پسلی میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کی پسلی پر بام کی مالش کی۔ اور گرم پانی کی بوتل اُسے دے کر اپنے کام پر چلا گیا۔ ایک کہانی کا سودا ہو رہا تھا۔ میں مسودہ لے کر وہاں پہنچا۔ پبلشر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شکار کھیلنے جانا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پرندوں کا شکار کرنے سے پہلے ایک رائٹر کا شکار کرتا جائے۔ اس کے نزدیک شاید یہ کوئی اچھا شگون ہو۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور کاروباری بندوق لوڈ کر کے بیٹھ گیا۔

"آپ کے ناول کا کیا نام ہے؟" یہ پہلی کاروباری بات تھی۔

"گندم کی کہانی آدم کی زبانی۔" میں نے جواب دیا۔

"مائی گاڈ۔ اتنا لمبا نام۔"

" فٹ دو فٹ لمبا تو نہیں ۔ کل چھ الفاظ ہیں ۔"

" اجی نہیں ۔ چھوٹا نام چلے گا ۔"

" لیجئے چھوٹا کئے دیتے ہیں ۔ مگر اتنا جس سے ناول ننگا نہ ہو جائے ۔"

" مائی گاڈ ۔ ناول ہے یا پاجامہ ۔"

" اس کا اندازہ تو ناول پڑھنے سے ہو سکے گا ۔ سناؤں ایک دو باب ؟"

" اجی نہیں ۔ پہلے نام کا فیصلہ تو ہو جائے ۔" اس نے کہا ۔

" لیجئے ہو گیا ۔ ناول کا نام ہو گا گندم کی کہانی ۔" میں نے کہا ۔

" مائی گاڈ ۔ عجیب نام ہے ۔" اس نے کہا ۔

" اور گندم کیا کم عجیب چیز ہے ۔" میں نے کہا ۔

" آخر نام میں کیا جدت ہے ؟" اس نے پوچھا ۔

" جدت نہیں اس میں فقط عدت ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔

" کیا مطلب ؟" پبلشر نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا ۔

" مطلب بعد میں جناب پہلے اس مقصد کو دیکھئے جسے پورا کرنے کے لئے یہ ناول لکھا گیا ہے ۔"

" مقصد بتائیے ۔"

" اس ناول کو لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس غذائی بحران میں لکھنے والوں کو زراعت پر بھی لکھنا چاہیئے ۔"

" زراعت پر کیوں لکھا جائے ؟"

" اس لئے لکھا جائے کہ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے جس کی سب سے

بڑی صنعت زراعت ہے۔ اس کی ۸۵ فی صد آبادی دیہات میں بستی ہے۔ اور ۹۰ فیصد آمدنی کا دارومدار زراعت پر ہے۔ مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی بڑی آبادی کا زراعت سے تعلق ہونے کے باوجود یہاں زرعی پیداوار کی کمی ہے۔ غذائی بحران ہے۔ یہاں تک کہ غذائی پیداوار بڑی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ملک کے زرمبادلہ کی ایک بڑی رقم باہر سے گندم اور چاول منگوانے پر خرچ ہو جاتی ہے۔"

"گندم کی کہانی میں چاول کا ذکر کیوں آیا؟" پیلشر نے پوچھا۔

"اس لئے کہ ہم گندم بھی کھاتے ہیں اور چاول بھی کھاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"چلئے ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات؟"

"اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ اشیا کی قیمتوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور عوام کو زندگی کی ضروریات پر زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ اجناس خوردنی کی پیداوار بڑھائے بغیر آبادی میں اضافہ ملک میں خوراک کی کمی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اب تک ہم نے اجناس خوردنی کی پیداوار بڑھانے میں بہت کم کامیابی حاصل کی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آبادی بڑھ رہی ہے۔"

"بڑھتی ہوئی آبادی کا تدارک خاندانی منصوبہ بندی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"جی بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ملکی معاشیات میں توازن پیدا کرنے اور صنعتی ترقی کو بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجناس خوردنی میں اضافہ

کرنے کی منصوبہ بندی میں وہ تمام تجاویز اور ذرائع کام میں لائے جائیں جو ممکن ہیں۔
کاشتکاروں کو چاہیئے کہ حکومت کی مہیا کی ہوئی سہولتوں سے پورا پورا فائدہ
اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کریں۔ اس میں ان کا اپنا بھی فائدہ ہے
اور ملک کا بھی۔ زیادہ اناج پیدا کرنا اس وقت ملک کی سب سے اہم ضرورت
ہے۔ جس کی طرف کاشتکاروں کے علاوہ قلمکاروں کو بھی توجہ دینی چاہیئے"۔

"کاشتکار اور قلمکار میں کیا نسبت ہے؟" اس نے پوچھا

"کاشتکار ہل چلاتا ہے۔ قلمکار قلم چلاتا ہے۔ کاشتکار بیج بونے
کے لئے زمین کھود کر اُسے ہموار کرتا ہے۔ قلمکار اونچی قدروں کو فروغ دینے
کے لئے ذہن کو کرید کرید کر اُسے ہموار کرتا ہے۔ قلمکار اپنے معاشرے اپنے
ماحول کا عکاس ہے۔ کیا وہ موجودہ غذائی بحران میں تڑپتے بلکتے انسانوں کی
عکاسی نہیں کرے گا؟"

"بائی گاڈ۔ گندم کی کوئی کہانی ہی نہیں ہو سکتی"۔

"ہو کیوں نہیں سکتی۔ گندم کی کہانی دراصل تہذیب آدم کی داستاں ہے۔
گندم کی کاشت تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ گندم کی
کاشت سے کھیت کا تصور پیدا ہوا۔ کھیت کے تصور سے ذاتی ملکیت کا
تصور اُبھرا۔ گندم کی کاشت نے پہلے کھیت پیدا کئے۔ پھر شہر اور حکومتیں۔
بہت سے علوم و فنون گندم کی کاشت ہی سے وجود میں آئے۔ گندم کی داستان
ایک قدیم اور عظیم داستان ہے۔ گندم تخلیق آدم سے پہلے ہی جنت میں
موجود تھی۔ اس اعتبار سے گندم کی کہانی انسان کی ابتدائی کہانی سے بھی زیادہ دلچسپ

اور پرانی ہے۔"

"اس داستان کے کتنے باب ہیں؟" پبلشر نے پوچھا۔

"بیس باب۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے تیسرے باب میں کیا ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"کپاس کی کہانی۔"

"مائی گاڈ۔ کہانی میں ایک اور کہانی۔"

"اپنی اپنی تکنیک ہے۔"

"بائی گاڈ انسان کپاس تو نہیں کھاتا۔"

"انسان کپاس کھاتا نہیں پہنتا ہے۔ لباس بھی انسان کی تین بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ ہر انسان کو رہنے سہنے کے لئے مکان۔ کھانے کے لئے روٹی۔ اور تن ڈھانپنے کو کپڑے کی ضرورت ہے۔ اس تثلیث میں انسان کے ذہنی ارتقا کی پوری داستان سمٹ آتی ہے۔ خوراک کے بعد لباس انسان کی دوسری بنیادی ضرورت ہے۔ جو اسے حیوانی سطح سے بلند کرتی ہے۔ لباس انسان کی ذہنی ترقی کا مظہر ہے۔ اس کی مدد سے انسان نے اپنے تن کو نہ صرف ڈھانپنا سیکھا بلکہ موسمی تغیرات سے بھی محفوظ کیا۔ کپاس کی کاشت دراصل انسان کی اسی ضرورت کے پیش نظر دنیا کے ہر خطے میں ہو رہی ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی کپاس پیدا کرنے کی مہم دراصل ملک کے کروڑوں انسانوں کے لئے لباس مہیا کرنے کی مہم ہے۔ اور اسی لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔"

"بائی گاڈ - یہ باب تو بڑا ہی بور کرنے والا ہے - کیونکہ میں ریشمی کپڑا پہنتا ہوں۔"

"اس میں ریشم اور ریشم کے کیڑوں کی کہانی بھی ہے۔"

"مائی گاڈ - اس میں کیا کیا ہے؟"

"اس میں بہت کچھ ہے - بڑی ہی عجیب باتیں - بڑی ہی نرالی باتیں۔"

"اس کی کوئی بڑی ہی نرالی بات بتائیں۔"

"سنیے۔"

"سنائیے۔"

"پودے بھی آپس میں جنسی ملاپ کرتے ہیں۔"

"مائی گاڈ - یہ باب تو پودوں کے کوک شاستر کا باب ہوگا؟"

"جی نہیں - انسان کے سوا خدا کی کسی مخلوق کا خیال اس طرف نہیں گیا - یہ باب خدا کی قدرت کے کرشموں کا باب ہے۔"

"قدرت کا کوئی کرشمہ سنائیے۔" اس نے کہا۔

"سنائیے نہیں کہیئے دکھائیے۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت دیکھ نہیں رہا سن رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ سُن بھی نہیں رہے صرف سونگھ رہے ہیں - لیجئے آپ کو پھولوں کی دنیا میں لے چلتے ہیں - جنس کے اعتبار سے پھول بھی دو طرح کے ہوتے ہیں - نر اور مادہ - دنیا میں جس قدر پھل دیکھنے میں آتے ہیں نر و مادہ پھولوں کے جنسی ملاپ ہی سے پیدا ہوتے ہیں - زرعی سائنس

پھولوں کے اس جنسی ملاپ کو پالی نیشن یا عمل زیرگی کہتے ہیے۔ اور وہ مادہ پولن کہلاتا ہے جس کی بدولت نر و مادہ پھول جنسی ملاپ کے بعد بار آور ہوتے ہیں۔"

"پولن کیا چیز ؟" پبلشر نے پوچھا۔

"زیرہ گل۔ زردانہ۔ یہ سفید رنگ کا چمکدار اور ملائم مخملی سفوف سا ہوتا ہے۔ سنبل کی مانند۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر پودے میں نر و مادہ پھول موجود ہوں۔ بعض پودوں میں صرف نر پھول موجود ہوتے ہیں اور بعض میں مادہ پھول۔ اس کے علاوہ پودوں کی کئی اقسام ایسی بھی ہیں جن میں نر و مادہ پھول بالکل قریب قریب ایک ہی شاخ پر موجود ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایسے پھولوں کو عمل زیرگی کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔"

"پھولوں میں جنسی ملاپ کیسے ہوتا ہے ؟"

"پھولوں میں اس فطری فعل کی تکمیل کے لئے قدرت نے یہ کام ہوا کے جھونکوں، شہد کی مکھیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کے سپرد کر دیا ہے۔ جو مختلف طریقوں سے اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ خاص کر شہد کی مکھی تو اس کام میں بڑا ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

"کیا کرتی ہے شہد کی مکھی ؟" اس نے پوچھا۔

"شہد کی مکھی پھولوں سے نہ صرف شہد اکٹھا کرتی ہے بلکہ اپنی ٹانگوں اور جسم کے بالوں پر پھولوں کے نر حصے سے زردانہ یعنی پولن لے کر مادہ پھولوں کو زرخیز کرتی ہے۔ مکھی کے جسم کے مختلف حصوں پر جمع شدہ

پولن مکھی کی نقل وحرکت سے کچھ کچھ پھولوں کے مادہ حصوں پر گر جاتا ہے۔ اور اس طرح کئی پودوں میں جنسی ملاپ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔"

"پودوں کے متعلق آپ نے اس کہانی میں کیا کچھ لکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ پودے اور انسان میں بہت تھوڑا فرق ہے۔"

"مائی گاڈ۔ بڑا تھوڑا فرق۔"

"جی ہاں۔ پودہ بھی ہماری طرح ایک زندہ چیز ہے۔ زندہ رہنے کے لئے اسے بھی ہماری طرح روشنی، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہے۔ اس کی خوراک میں وہی کیمیائی اجزا پائے جاتے ہیں جو ہماری خوراک میں۔ جن کے نہ ہونے سے پودہ بھی ہماری طرح بیمار ہو جاتا ہے۔ اور وہ بیماری اس کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ پودے کا سوکھ جانا اس کی موت ہے۔"

"مائی گاڈ۔ پودوں کو بیماریاں بھی ہوتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ غذائی کمی، نامناسب اور ناموافق ماحول کی وجہ سے پودے بھی ہماری طرح کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہمیں ہماری غذا میں پروٹین۔ فیٹس۔ کاربوہائیڈریٹس نہ ملیں۔ تازہ ہوا اور روشنی میسر نہ آئے تو ہمیں دق ہو جائے۔ ایسے ہی یہ چیزیں نہ ملنے سے پودے سوکھ جاتے ہیں جیسے انسان دق سے سوکھ جاتے ہیں۔"

"مائی گاڈ۔ یہ تو ایک قیامت خیز غضب معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ حقیقت ہے ۔ ہمارے اور ایک پودے کے جسم کی کیمیادی ساخت میں کچھ فرق نہیں۔ انسان اور پودے کا جسم مختلف قسم کے مادوں سے مل کر بنا ہے جو کہ عناصر کہلاتے ہیں۔ اگر پودے کو جلا کر اس کا کیمیائی تجزیہ کیا جائے تو اس کی راکھ میں موجود مادہ سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان میں کون کون سے عناصر موجود ہیں۔ عناصر ان مادوں کو کہتے ہیں جو بالکل مفرد ہوں اور ان کا تجزیہ نہ کیا جا سکے ۔ جیسے کسی زبان میں ہزارہا الفاظ ہوتے ہیں جو کہ چند حروف تہجی سے مل کر ترکیب پاتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان ایک پودے میں مختلف قسم کے کئی کیمیادی مادے ہیں جو کہ عناصر کے مختلف طریقوں پر یکجا ہونے کا نتیجہ ہیں ۔ ہمارے جسم میں انہی عناصر کا حصہ ہے ۔ جو ہوا سمندر، مٹی، چٹانوں اور درختوں وغیرہ میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان عناصر میں کاربن ، ہائیڈروجن، آکسیجن، گندھک ، فاسفورس، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، میگنیشم ، فولاد، کلورین اور ان کے علاوہ باقی جس قدر عناصر موجود ہیں وہ کیمیادی مرکبات کی صورت میں ہی پائے جاتے ہیں۔"

"انسان کی طرح کیا پودے کے بھی اعضا ہوتے ہیں ؟"

"جی بالکل۔ وہ اعضا پودے کی زندگی میں وہی کام کرتے ہیں جو ہمارے جسم کے مختلف حصے ہماری زندگی میں مختلف کام کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے پودے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔"

"مثلاً ؟"

"جڑیں ــــ تنا ــــ شاخیں ــــ پتے ۔"

"انسان کی ابتدا تو ایک جرم سے ہوتی ہے۔"

"اور پودے کی ابتدا بھی ایک جرم سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ جرم نوعیت کے اعتبار سے حیوانات و نباتات میں بالکل مختلف شکل میں ہوتا ہے۔ پودے کی نوع میں یہ جرم بیج، قلم، گوٹی یا دابہ کہلاتا ہے۔"

"بائی گاڈ۔ کیلشیم نہ ملنے سے انسان کی ہڈیوں کی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کیا پودوں میں بھی یہ کیمیائی تاثر موجود ہے؟"

"موجود ہے۔ جیسے انسان کو نشوونما اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے متوازن غذا کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پودوں پر بھی غیر متوازن غذا کا ان کی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔"

"انسان سوتا ہے کیا پودا بھی سوتا ہے؟"

"ہاں۔ ہماری طرح پودے بھی سوتے ہیں۔ ہر پودہ ہر سال کچھ عرصہ کے لئے سوئی ہوئی حالت میں چلا جاتا ہے۔ سوئی ہوئی حالت سے مراد وہ حالت ہے جن میں ان کے پتے جھڑنے لگتے ہیں۔ پودوں کی اس حالت کا اندازہ پت جھڑ کے موسم میں لگایا جا سکتا ہے۔ عام طور پر پودوں کی سوئی ہوئی حالت، سردیوں کے ایام میں یکم دسمبر سے پندرہ فروری تک ہوا کرتی ہے۔ اور پھر پودے نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ اس وقت نئے شگوفے، نئی کونپلیں اور پھول نکلتے ہیں۔"

"یہ کونسا مسودہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ہے میرا ناول بہار بستیاں۔"

"مائی گاڈ۔ کیا بیماری ہے ان بستیوں کو؟"

"لہو تھوکنے اور کھانسنے کی بیماری۔ ان بستیوں میں انسان نہیں سوکھے ہوئے پودے بستے ہیں۔ جن کو نہ متوازن غذا میسر آتی ہے نہ تازہ ہوا اور نہ روشنی۔"

"بائی گاڈ۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے آپ اب کیا لکھنے لگے ہیں۔"

"وہی جو مجھے اب لکھنا ہی چاہیئے۔ قلمکار اپنے معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ میں جس معاشرے اور ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔ وہاں پندرہ لاکھ انسانوں کے سانس کو دیمک لگی ہوئی ہے۔ بستیاں بیمار ہیں۔ لہو تھوک رہی ہیں۔ کھانس رہی ہیں۔ لہو اور کھانسی میری ان کہانیوں کو وراثت میں ملی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ان بیمار بستیوں اور لہو تھوکتے انسانوں ہی سے جنم لیا ہے۔ یہ بستیاں بھی ٹنڈ منڈ پیڑوں کی طرح نہ جانے کب سے سو رہی ہیں۔ ان بستیوں میں سدا اپت جھڑ کی رُت ہی رہتی ہے۔ جس کی خنک ہواؤں میں خشک پتے۔ سوکھے ہوئے زرد پتے۔ لہو تھوکتے کھانستے انسان کھانستے اور کھڑکتے ہوئے پتے سسک رہے ہیں۔ دم توڑ رہے ہیں۔ چمن والو اہتمام بہار کرو۔ ایسا نہ ہو یہ خزاں اس چمن میں کوئی پھول ہی نہ کھلنے دے۔"

"بائی گاڈ۔ یہ ایڈی بینڈی کہانیاں نہیں چلیں گی۔ آپ عشقیہ ناول خوب لکھتے ہیں۔ اپنے رنگ میں کوئی ناول لکھ کر دیجئے۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہتے ہی میرا پبلشر بندوق کو کچھ اس انداز سے سنبھالتے ہوئے اٹھا کہ میں نے سمجھا فائر کرنے لگا ہے۔ مگر وہ فرار ہو گیا۔ اور میں مایوس و ناکام واپس لوٹا۔

مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اور پیسے عشقیہ کہانی لکھنے ہی سے مل سکتے تھے۔ مگر میرا تو عشق بھی اس وقت لہو تھوک رہا تھا۔ کھانس رہا تھا۔ میری محبت کا لہو دق کے جراثیم پی رہے تھے۔ میں گھر آیا تو نجمہ وہاں موجود نہ تھی۔ میری غیر موجودگی میں اس کی ماں آئی اور روحانی علاج کے لئے گوندی پیر کے تکیے میں لے گئی۔ وہاں اس نے چونکی دی۔ میراثنیں ساز بجاتی رہیں۔ نجمہ حال کھیلتی رہی۔ اور اس تکیے کا عامل روحانی سمندر رسائیں نہ جانے کیا کچھ پڑھ پڑھ کر نجمہ کو جھاڑتا پھونکتا رہا۔ اور گھر آتے ہی نجمہ کو لہو کی تھوک کے ساتھ گوشت کی بوٹیاں خارج ہونے لگیں۔ وہ اپنی اس حرکت پر سخت نادم تھی۔ دل کے دورے تیز ہو گئے تھے۔ ایکا ایکی اس پر غشی طاری ہوگئی۔ میں بھاگ کر ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے کارامین کا انجکشن کیا۔ جس کے ردعمل سے آدھے گھنٹے کے بعد نجمہ کو ہوش آیا۔ اسی اثنا میں اس کی ماں بھی آ گئی۔ میرا بڑا لڑکا پرویز اپنی ماں کی حالت خراب دیکھ کر جلدی سے اُسے بلا لایا تھا۔ مگر نجمہ نے اُسے سیڑھیوں ہی سے واپس کر دیا۔ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

"چلی جاؤ۔ بڑھیا چلی جاؤ۔ تم ماں نہیں ہو ڈائن ہو"

وہ اپنی ماں سے بدظن ہو چکی تھی۔ جھوٹ کے ڈھول کا پول کھل چکا تھا۔ اس کی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اور ایسی گئی کہ پھر کبھی نہ آئی۔ اور نجمہ کئی روز تک اپنی حماقت پر پچھتاتی رہی۔ مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ تھا۔ اس کی حالت تشویشناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ جہاں سے رقم کی امید تھی وہ بات تو بنتے بنتے بگڑ چکی تھی۔ میرے ناول کا سودا نہ ہو سکا تھا

بیڈی ڈاکٹر فردوس کا بل بھی اس مہینے میں کافی بوجھل ہو گیا تھا۔ جس کی ادائیگی کا مجھے بڑا فکر لگا ہوا تھا۔ وہ دو تین بار اپنی رقم کا مطالبہ کر چکی تھی۔ اس سے آگے وہ ادھار کرنے کو تیار نہ تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ بل کی عدم ادائیگی کی صورت میں وہ نجمہ کا علاج کرنے کو تیار نہ تھی۔ میری زندگی کا ہر سانس معمّا بنتا جا رہا تھا جس کا صحیح حل تلاش کرنے کے لئے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس پریشانی میں مجھے اپنے ایک دوست کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے میری مالی امداد بھی کی اور مجھے مشورہ بھی دیا۔ کہنے لگا۔

"اپنی بیوی کو فوراً کسی ہسپتال میں داخل کرا دو۔ تا خیر اور لاپرواہی اس کے حق میں اچھی نہیں۔"

میرے دوست نے مجھے بڑا مفید مشورہ دیا تھا۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ نجمہ وہاں ہسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے مر جانا منظور تھا لیکن اس ہسپتال میں داخل ہونا منظور نہ تھا۔ میں نے اُسے داخل ہو جانے پر مجبور کیا تو کہنے لگی۔

"وہ ہسپتال آسیب زدہ ہے۔ وہاں ہر چیز پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ میری سہیلی گوری۔ نے اسی ہسپتال میں دم دیا تھا۔ آسیبی سائے چند ہی دنوں میں اس کا سانس پی گئے تھے۔ جب اپنے گھر سے گئی تھی اتنی بری حالت تو نہ تھی اس کی۔ ایک ہفتہ بھی نہ کاٹ سکی بیچاری۔ بری طرح جھنجھوڑ دی گئی۔ نچوڑ دی گئی۔ اس ہسپتال کے آسیب اس کا جگر چبا گئے۔ پانی کی ایک بوند بھی اس کے پیٹ میں بھاری معلوم ہونے لگی۔ ہماری ہمسائی موسی رحموں اس کی خبر لینے گئی تو

گوری دونوں ہاتھ جوڑ کر زار زار رونے لگی۔ بولی۔ موسی اپنے میاں سے کہنا میرے باپ سے کہے وہ مجھے یہاں سے لے جائے۔ نہیں تو میں مرجاؤں گی۔ یہاں آکر تو میں اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوگئی ہوں۔ اور دوسرے ہی دن وہ مرگئی۔ مایوس محبت لڑکی مرگئی۔ سلیم بابو تم نے اگر مجھے وہاں داخل کرادیا تو میں بھی مرجاؤں گی۔"

پرائیویٹ ڈاکٹروں سے اپنی بیٹی کا علاج کرانے کی ہمت نہ تھی بندوگوانے میں۔ بڑی مشکل سے، بڑے جتن کرکے اس نے اپنی بیٹی کو وبائی ہسپتال میں داخل کرایا تو وہ آٹھویں دن مرگئی۔ نجمہ اُس ہسپتال سے بڑی خائف تھی۔

ہماری پڑوسن۔ فقیرو نانبائی کی بیوی موسی رحیموں جوکہ جگت موسی ہے۔ جسے بستی کے بڑے چھوٹے موسی ہی کہتے ہیں، گوری کی خبر لیکر آئی تو اس نے نہ صرف ہسپتال کے انتظامیہ عملے کے بارے میں بلکہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے متعلق بھی ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ نجمہ پر خوف و دہشت کا طاری ہوجانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن میرے لئے یقیناً ایک عجیب الجھن پیدا ہوگئی تھی۔ جسے سلجھانے کے لئے میں نے اپنے چند بہت ہی قریبی رشتہ داروں سے رجوع کیا۔ مگر وہ قریب ہوتے ہوئے بھی مجھے بہت دور نظر آئے۔ وہ میری الجھن میں الجھنے کو تیار نہ تھے۔ مصیبت میں اپنے بھی پرائے ہوگئے تھے۔

میں سوچوں کی صلیب پر کھچا ہوا تھا۔ سوچوں کی سنگینیں مجھے چبھ رہی تھیں۔ سوچوں کی میخیں مجھے چھید رہی تھیں۔ مجھے مصلوب کیا جارہا تھا۔ صرف ایک لڑکی سے محبت کرنے کے جرم میں مجھے مصلوب کیا جارہا تھا۔ اور ابن مریم کو

بھی مصلوب کیا گیا تھا۔ اس کے مقدس قدموں کو چومنے والے بھی مصیبت میں اُسے چھوڑ گئے تھے۔ اس کے پاکیزہ ہاتھوں کا بوسہ نہیں لیا گیا تھا شناخت کی مہر لگائی گئی تھی کہ وہ آسانی سے پہچانا جائے۔ پکڑا جائے۔ مصلوب کر دیا جائے۔

زندگی کے کسی کٹھن مرحلے میں جب قدم قدم پر صلیبیں گڑ جاتی ہیں تلواریں تن جاتی ہیں۔ نیزے ابھرنے لگتے ہیں تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت مصلوب ہونے والے کو ایک طوفان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طوفان کو بلانے کے لئے اپنے اندر آواز دی جائے یا آسمان کو پکارا جائے۔ طوفان آتا ہے۔ ضرور آتا ہے۔ بادل گرجنے لگتے ہیں۔ بجلیاں کوندتی ہیں۔ زمین لرزنے لگتی ہے۔ آندھیاں آتی ہیں۔ دھماکے ہوتے ہیں۔ میں نے اس طوفان کو بلانے کے لئے اپنے اندر آواز دی۔ آسمان کو نہیں پکارا تھا۔ میں ابن مریم نہیں تھا۔ بڑے زور کا ایک دھماکہ ہوا جسے ساری کائنات میں صرف میں نے سنا۔ بڑے زور کا ایک دھماکہ۔ پھر بڑی مہیب سی گونج سنائی دی اور طوفان آگیا۔ میرے اندر ایک طوفان چلنے لگا۔ جس کے سائے نجمہ انگیٹھی میں دہکتے کوئلوں کی شفق میں میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ میں بھی خاموش رہا۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتی رہی۔ میں چپ چاپ ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اُترتے ہوئے صحیفوں کو پڑھتا رہا۔ خدا۔ محبت اور اس کی عظمت کے اسرار مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ ان الوہی لمحوں کے سحر نے ہر چیز کو مسحور کر لیا تھا۔ میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان میں بھی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ نہیں ہو رہا۔

جیسے پوری کائنات دھماکے کے بعد سوگئی ہو۔ نہ کوئی چیز زمین سے آسمان کو جا رہی تھی۔ اور نہ کوئی چیز آسمان سے زمین پر آ رہی تھی۔ جو چیز جہاں جہاں تھی جامد و ساکت ہو کر رہ گئی۔ وقت ایک تھما ہوا دریا معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں گھڑی، پل، لمحہ، دن، سال اور صدیوں کی کوئی لہر کوئی بھنور نہیں اٹھ رہا تھا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم نجمہ کی آنکھوں میں اترتے ہوئے محبت کے صحیفوں کی تلاوت کرنے لگا۔ پریم وید کے منتروں کا پاٹھ کرنے لگا۔ دو چہروں اور چار آنکھوں کے درمیان انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی شفق کئی بار پھولی کئی بار کجلائی اور پھر بجھ گئی۔ وہ الوہی لمحے گزر گئے۔ وہ طلسم۔ وہ سحر ٹوٹ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو سلیم بابو؟" نجمہ نے گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"نجمی میں اس وقت بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سوچوں کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے میرے اندر۔"

"چھوڑ دو ان سوچوں کو۔ اتنا سوچنے سے کیا ہو گا۔ اب سو جاؤ۔ صبح سے شام تک بڑے کام کرتے ہو۔ میرے کام۔ اپنے کام۔ بچوں کے کام۔ تم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہو بابو۔" نجمہ نے کہا۔

"جب تک میرے پاس تمہاری محبت ہے میں تھک نہیں سکتا شکست نہیں کھا سکتا ان سوچوں سے۔ ان کاموں سے۔ میں نے ان کو جیت لیا ہے۔ میں نے ان چٹانوں میں ایک راستہ نکالا ہے۔ تمہارے لئے میں نے ایک راستہ نکالا ہے نجمی۔" میں نے کہا۔

"کیا راستہ نکالا ہے سلیم بابو؟" نجمہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔
"تمھیں بڑے ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیئے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس مرض کے ماہرین وہاں دن رات کام کر رہے ہیں۔ بڑا اچھا سٹاف ہے بڑا اچھا علاج کیا جاتا ہے۔ مریضوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی جاتی۔ کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا نے چاہا تو دنوں میں تم شفایاب ہو جاؤ گی۔"
"خدا ۔" نجمہ نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔
"خدا صرف زندہ رہنے اور سانس لینے میں ہے۔ اور شاید اس میں بھی نہیں ۔ کہیں بھی نہیں۔"
"نہیں نجمی نہیں۔ خدا ہر جگہ ہے۔ ہر چیز میں ہے۔ اور اسے ہونا ہی چاہیئے۔ وہ اگر نہ ہو گا تو پھر ہمارا کیا ہو گا؟ ہم کدھر جائیں گے؟ ہم کسے پکاریں گے؟ اتنا مایوس نہ ہو جاؤ نجمی۔ تمھیں مکتی مل کر رہے گی۔ پندرہ لاکھ لوکھو کتے کھا نستے انسانوں کو نروان مل کر ہی رہے گا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم دن رات سمادھی لگائے، عبادت، ریاضت، تپسیا کر رہا ہے۔ پندرہ لاکھ انسانوں کو لگے ہوئے گرہن کو، ان کلبلاتے داغوں کو مٹنا ہی ہو گا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم زندگی کے اس کورو کشتر میں، پندرہ لاکھ لوکھو کتے کھانستے انسانوں کی مہا بھارت کے اس یدھ میں، اس مہم میں اگر کامیاب نہ ہو سکا تو خود کشی کر ے گا۔ مگر تم بھی اس مہم میں اس کی مدد کرو۔"

"میں بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں؟" نجمہ نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا کر سکوں گی؟ مجھ سے کیا ہو سکے گا؟"

"بس تم میری مانو اور ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔"

"مگر میں نے تو لیڈی ڈاکٹر فردوس سے سنا تھا کہ بڑے ہسپتال میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ میں تمہیں اور زیادہ مشکلوں میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تمہیں اور زیادہ پریشان ہونا پڑے گا سلیم بابو۔ یہ سب کچھ کیسے کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔ تمہاری محبت کا میرے اندر اٹھتا ہوا طوفان ہی سب کچھ کرے گا۔ اب کچھ ہو کر رہے گا۔ اب کچھ ہو ہی جانا چاہیئے۔ میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان میں لہو تھوکتی کھانستی قلیلیں ملنے لگی ہیں۔ آسمان سے روشنی کے بادل نیچے اتر رہے ہیں۔ ہوا میں بیشمار پروں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پندرہ لاکھ کھانستی لہو تھوکتی لاشوں میں اپنا مقدس سانس پھونک کر انہیں زندہ کرنے والا مسیحا شاید آسمانوں سے آرہا ہے۔"

ہسپتال کا نام سن کر ڈر سے پسینے پسینے ہو جانے والی نجمہ رضامند ہو گئی۔ شاید اُس نے بھی آسمان سے دھرتی پر اترتی ہوئی الوہی آوازیں سن لی تھیں۔ اُسے شاید مکتی ورودان مل جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ گئی۔ لحاف کو اپنے جسم پر پھیلا لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں سو گئی۔ نیند اس کے لئے بہت ضروری

تھی۔ بہت اچھی تھی۔ پچھلی دو راتیں اس نے جاگ کر گزاری تھیں۔

میں چپکے سے اٹھا اور اس چارپائی کے پاس آگیا۔ جس پر میرے بچے میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان سے بے خبر سو رہے تھے۔ میں خاموش کھڑا کافی دیر تک لحاف سے باہر نکلے ہوئے تین معصوم چہروں کو دیکھتا رہا۔ جن میں نیند کی میٹھی لوریاں سپنوں کے کئی رنگ گھول رہی تھیں۔ ان کے ننھے ننھے خراٹوں کے ساتھ ساتھ ان رنگوں کی ایک دھنک بجھ جاتی تھی تو فوراً ہی دوسری دھنک کھل جاتی تھی۔ سپنوں کے رنگ ان کی نیند میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کتنے دلچسپ تھے ان رنگوں کے کھیل۔ کتنی دلفریب تھی ان رنگوں کی دنیا۔ مگر اس کی سیر کرنے کی مجھے فرصت کہاں تھی۔ میں نجمہ کے چہرے پر کھنڈے ہوئے پیلے پیلے، بجھے بجھے سرسراتے سایوں کے یخ سناٹوں میں آنے والی صبح کے داغ داغ اجالوں کی طرف تیز تیز چلا جا رہا تھا میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کے ریلے مجھے آگے ہی آگے دھکیلتے جا رہے تھے۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ سلگ سلگ کے بجھ گئی۔

صبح ہوئی۔ تیز و تند ہواؤں کا جھکڑ سا چل رہا تھا۔ ہر طرف گرد و غبار اڑ رہا تھا۔ جس سے ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کیروسین آئیل سٹوو جلایا۔ جلدی جلدی پانی گرم کیا۔ اتنے میں بچے بھی جاگ گئے۔ میں نے پہلے نجمہ کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ پھر گڈو اور کامران کا منہ ہاتھ صاف کر کے ان کے میلے کپڑے اتار کر انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنائے۔ پرویز ان بچوں سے دو سال بڑا ہے۔ وہ بستر سے اٹھتے ہی صابن دانی

اور تولیہ اٹھائے غسل خانے میں جا چکا تھا۔ وہ باتھ روم سنگر ہے۔ اس دن بھی اپنی عادت کے مطابق وہ اونچی آواز میں گاتے ہوئے مناجات پڑھ رہا تھا۔

سُن اے عرش بریں کے رہنے والے اپنی رحمت سے
مجھے حوروں کی عصمت دے ستاروں کی بلندی دے

حوروں کی عصمت۔ ستاروں کی بلندی۔ میں چائے جلدی جلدی تیار کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ پرویز عرش بریں کے رہنے والے سے کتنی عجیب چیزیں مانگ رہا ہے۔ مگر گڈو چائے مانگ رہی تھی۔ کامران پراٹھا مانگ رہا تھا۔ جب سے نجمہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تھی کامران کو ناشتے کے لئے پراٹھا نہیں مل رہا تھا۔ مکھن یا گھی میں تلے ہوئے توس اُسے پسند نہ تھے۔ وہ الماری سے باسی روٹی اٹھا لایا۔ وہ چاہتا تھا مکھن لگا کر روٹی کو سینک دیا جائے۔ لہذا میں نے نجمہ کے لئے انڈہ فرائی کرنے کے بعد مکھن لگا کر روٹی سینک دی۔ کامران بڑا خوش ہوا۔ ”آخاہ جی پراٹھا“ کا شور مچاتے ہوئے تھالی میں وھوا اں چھوڑتی روٹی کو پھونکیں مارنے لگا۔ اتنے میں پرویز بھی فارغ ہو کر آ گیا۔ ہم سب ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میں نے پرویز سے کہا۔

”آج تم اسکول نہیں جاؤ گے۔ گھر کا خیال رکھو گے۔ میں تمہاری امی کو داخل کرانے ہسپتال لے جا رہا ہوں۔“

”اب جو میں نے ناغہ کیا تو ماسٹر مارے گا۔ چھٹی کی عرضی لکھ دیں۔ میں بھاگ کر دے آتا ہوں۔“ پرویز نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ کل میں تمہارے ساتھ سکول چلوں گا۔ ماسٹر سے کہہ

دوں گا۔ عرضی لکھنے کا اب وقت نہیں ہے۔ ہمیں نو بجے ہسپتال پہنچنا ہے۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے گھڑی دیکھی تو نو بجنے میں پچیس منٹ باقی تھے۔ اور ہمیں ٹھیک نو بجے ہسپتال پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ میں جلدی سے تانگہ لے آیا۔ پرویز اور کامران کو ان کی اندھی دادی کے پاس گھر پر ہی چھوڑا۔ گڈو کو ساتھ لے لیا۔ پرویز اور کامران نے بھی ساتھ چلنے کے لئے ہنگامہ کیا۔ میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ نجمہ نے اپنے بیٹوں کی حمایت کی۔ کہنے لگی۔

"تو پھر گڈو کو بھی یہیں رہنے دو۔ اس کا ہمارے ساتھ جانا کیا ضروری ہے۔"

ضروری تو نہ تھا مگر میرا دل کہتا تھا گڈو اپنی ماں کے ساتھ چلے۔ اس کے چہرے پر سہمی سہمی معصومیت میرے دل سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہی تھی۔ ابا مجھے میری امی کے ساتھ لے چلیئے۔ مجھے میری امی کے ساتھ رہنے دیجئے۔ آپ کو معلوم ہے مجھے اپنی امی کے ساتھ کتنا پیار ہے۔ کون جانے کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہو جائے گا؟ یہ وقت پھر نہیں آئے گا ابا جانی۔

میں نے نجمہ کو کوئی جواب نہ دیا۔ گڈو کو اس کے پاس ہی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ تانگہ ہسپتال کو روانہ ہوا۔ تھوڑی دور تک راستہ بڑا خراب تھا۔ کہیں گڑھے، کہیں چھوٹی بڑی نالیاں، کیچڑ، موڑ۔ کوچبان گھوڑے کو قدم قدم چلاتے ہوئے یہ راستہ طے کرنے لگا۔ عقب کی ایک گلی سے ایک چرواہا

چھکڑا کھینچے چلا آرہا تھا۔ وہ اس بستی کو چھوڑ کر ایسی ہی کسی اور بستی کی طرف اپنے گھر کا سامان لئے جا رہا تھا۔ ایک اندھیرے سے نکل کر دوسرے اندھیرے میں۔ زندگی کے ایک ویرانے سے دوسرے ویرانے تک۔ ان کی ساری عمر زندگی کے اس سائبیریا میں بھٹکتے ہی گزر جاتی ہے۔ نگر نگر۔ ڈگر ڈگر۔ بھٹکتے رہیں گے بھٹکتے چلے جائیں گے ان کی قسمت میں یہی کالا پانی لکھا ہے۔ چھکڑا سامان سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ چرواہا اسے بڑی مشکل سے کھینچ رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ بوجھ تلے کانپ رہا تھا۔ اپنے جسم کی بوٹی بوٹی کا زور لگانے سے اس کی گردن، چہرے اور بازوؤں پر نیلی نیلی رگیں تن رہی تھیں۔ کنپٹیوں کی نسیں پھڑک رہی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں باہر نکل آئی تھیں۔ سر سے لے کر ایڑی تک پسینے سے شرابور۔ تیز تیز چلتے ہوئے چھکڑے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا بھی اس کے پسینہ اگلتے والے مساموں پہ کچھ اثر نہ ہو رہا تھا۔ گنجی کھوپڑی چپٹے تلوے۔ ننگے پاؤں ننگے سر۔ وہ کمر اور گردن جھکائے ہانپتے اور کانپتے ہوئے یوں چھکڑا کھینچ رہا تھا جیسے اس پر سامان نہیں اس بستی کے پچیس فیصد لہو تھوکتے کھانستے ڈھانچوں کا بوجھ لدا ہو۔ جیسے وہ اس بستی کے سارے اندھیرے، ساری غلاظتیں، سارے داغ، سارے جھونپڑے ڈھاسے اور ان میں لہو تھوکتے کھانستے پنجر اپنے چھکڑے میں لاد کر کسی ایسی ہی دوسری بستی میں منتقل کر رہا ہو۔ اور اکیلا۔ تن تنہا۔ ہانپتا کانپتا ہو نکتا۔ یہ گلیاں، یہ سڑکیں، یہ ٹیڑھی ترچھی لکیریں اس کی زندگی کا گورکھ دھندا ہیں۔ جب تک سڑکوں کی اونچ نیچ باقی ہے۔ جب تک دنیا میں اترائی چڑھائی موجود ہے۔ اس کی پیٹھ پہ یہ بوجھ لدا ہی رہے گا۔ اس کی کمر جھکی ہی

رہے گی۔ اس کے سارے جسم پر پسینا بہتا ہی رہے گا۔ اور وہ مریل بیل کی طرح اس بوجھ کو چپ چاپ کھینچے چلا جائے گا۔ ہانپتا، کانپتا، کبھی اوپر چڑھتا رہے گا کبھی نیچے اترتا رہے گا۔ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے، چھکڑا کھینچتے کھینچتے اس کے شانوں کا گوشت کوئی وقت آئے گا کہ سخت ہو کر سینگ بن جائے گا۔ وہ سینگ اس کے سینے میں چبھنے لگیں گے۔ اس کے پھیپھڑوں کو زخمی کر دیں گے۔ اور پھر یہ لہو تھوکنے لگے گا۔ کھانسنے لگے گا۔ اور زندگی کے سائبیریا کے برفانی جھکڑ اور تند و تیز ہو جائیں گے۔ اندھیروں کی چٹانیں ابھرنے لگیں گی۔ اور کوئی چٹان اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر بہت اونچا لے جائے گی۔ ایک اور بہت بڑے اندھیرے میں۔ اور پھر ایک بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہو گا۔ اور اندھیرے کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر جھونپڑوں پر گرنے لگیں گی۔ اور ہر شے ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ یہ کسی گہرے گڑھے میں چپ چاپ پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مٹی کے ڈھیروں کو دیکھ رہا ہو گا۔ تانگے کے ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا ہوا میں اس چہرہ والے کے متعلق سوچتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تانگہ اس بستی میں سے نہیں میرے خیالوں میں سے گزر رہا ہے۔ اور اس کے گھوڑے کے سموں کی آواز میں کوئی خواب دیکھتے ہوئے سن رہا ہوں۔

اس گلی سے آگے نکل کر اب تانگہ بستی کے اس حصے میں چلا جا رہا تھا۔ جہاں جلے ہوئے مکانوں کا ویران سلسلہ ہے۔ بغیر چھتوں اور بغیر دروازوں کے ڈھاروں میں مزدوروں نے اپنے گھر بنائے ہوئے ہیں۔ ان گھروں میں وہ اپنے پرانے لحافوں، گھاس پھوس کے بستروں، مٹی اور ٹین کے برتنوں، پھٹے پرانے

میلے کچیلے کپڑوں، بوسیدہ جوتوں، ننگے بھوکے بچوں اور بیویوں کے ساتھ گزر بسر کرتے ہیں۔ ٹاٹ کے پردے۔ گھاس پھوس یا ٹین کی زنگ آلود چادروں کے چھو لیتے چھا لیتے چھپر۔ کائی لگے مٹی کے مٹکے۔ مٹی کے گھڑے۔ لوٹے۔ آبخورے۔ پیالے۔ رکابیاں۔ پیوند لگے بدبودار ٹھنڈے لحاف۔ ٹھنڈے چولہے۔ ٹھنڈی زندگی۔ گھٹن گھٹن۔ دھواں دھواں۔ مکھیوں کی بھنکار۔ بچوں کے چیخنے رونے کی آوازیں۔ دیئوں میں تیل نہیں۔ مٹکوں میں پانی نہیں۔ خالی کنستر۔ خالی ہانڈیاں۔ خالی زندگی۔ مرد صبح کو اپنی عورتوں سے لڑ جھگڑ کر مزدوری کرنے چلے جاتے ہیں۔ اور رات کو تھک ٹوٹ کر گھر لوٹ آتے ہیں۔ اگر کوئی مزدوری مل گئی ہو تو چولہا گرم زندگی گرم اور اگر نہ ملی ہو تو پھر لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، دھول دھپہ، دھینگا مستی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک گھر۔ ایک جہنم۔ ایک کال کوٹھری۔ صبح و شام کی پھانسی کا ایک تختہ۔ ایک گلوٹین۔ صبح و شام جس سے کئی گردنیں کٹتی ہیں۔ ان آباد کھنڈروں کی شکستہ دیواروں سے تیز و تند ہوائیں ٹکراتے ہوئے پھنیر سانپ کی طرح پھنکارتی ہیں۔ چھو لیتے ہوئے چھپر سرسراتے ہیں۔ کھنڈرات سے شاں شاں کی آوازیں آتی ہیں جیسے ہوائیں چیختے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ بھاگو۔ دوڑو۔ دیواریں ہیں گر کھڑے ہوئے موت کے ان سایوں سے نکل جاؤ۔ جاگو۔ جاگو۔ میں تمھیں ہمیشہ جگاتی رہوں گی۔ یہ پھٹے پرانے لحاف جلا دو۔ ان ڈھاروں کو ڈھاہ دو۔ گندگی کے ان ڈھیروں سے باہر نکلو۔ میں تمھیں سونے نہ دوں گی۔ میں تمھیں جگاتی رہوں گی۔ تمھاری نیندوں کو اپنی پھنکاروں سے ڈراتی رہوں گی۔

لیکن یہ لوگ ان ہواؤں کی آواز نہیں سنتے۔ جاگ کر پھر سو جاتے ہیں۔ لڑتے ہوئے۔ مارتے پیٹتے ہوئے۔ گالیاں دے کر پھر سو جاتے ہیں۔ ان کے گھروں میں غنودگی طاری کرنے والی ایک عجیب سی بو پھیلی رہتی ہے۔ جیسے مردے کو نہلا کر اُسے مشک کافور لگایا جا رہا ہو۔ جھکڑ سے گرد و غبار اڑنے کی وجہ سے سورج کی روشنی پھیکی پھیکی معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے دن کافی چڑھ چکا تھا۔ مگر ان ڈھاروں میں ابھی تک رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک کنبہ۔ کئی کنبے۔ پھٹے ہوئے لحاف میں گھُسا ہوا پورا خاندان، ان ڈھاروں میں بستے ہوئے کئی گھرانے ابھی تک نیند کے سناٹے میں تھے۔ ہم ذرا اور آگے بڑھے تو ایک جگہ چند ڈھاروں میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ چند چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی۔ کہیں ٹین کی زنگ آلود بالٹی میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ کہیں ٹین کی چادر کو آگ پر رکھ کر توے کا کام لیا جا رہا تھا۔ روٹیاں پکائی جا رہی تھیں۔ کہیں بچوں بوڑھوں مردوں عورتوں کی ٹولی چولہے میں جھانکڑیں جھونکتے ہوئے شعلوں کی آنچ لے رہی تھی۔ کہیں آگ سلگانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر آگ نہیں سلگ رہی تھی۔ چولہے سے۔ ڈھارے سے۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پردوں کے سوراخوں سے دھوئیں کے دائرے نکل رہے تھے۔ دائرے پھیل رہے تھے۔ رینگ رہے تھے۔ ہر جگہ دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا۔ دھواں۔ کھانسی۔ لہو۔ موت۔ نیچے کی طرف جھکے ہوئے۔ مُڑے ہوئے۔ شکستہ مکانوں کے چھجوں کے سائے پھیکی پھیکی دھوپ میں لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ باہر دھول اُڑ رہی تھی۔ بنجر

زمینیں۔ ویران زمینیں۔ ہر طرف موت سی ویرانی۔ خاموشی۔ سناٹا۔
ان ڈھاروں سے آگے نکلے تو ایک جگہ مرغ لڑائے جا رہے تھے۔ پالی جمی ہوئی تھی۔ قہقہے۔ تالیاں۔ شور و شغب۔ تماشائیوں میں بڑے میاں اور انیس خاں بھی کھڑے تھے۔ تانگہ قریب سے گزرا تو بڑے میاں نے اپنی بیٹی کو پچھلی گدی پر سکڑے سمٹے بیٹھے دیکھا۔ نجمہ نے سلام کیا۔ مگر انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تانگہ اب بڑی سڑک پر آگیا تھا۔ کوچبان نے چابک لگا کر گھوڑے کو سرپٹ کر دیا۔ راستے میں کہیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ ٹھیک نو بجے ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ ٹی بی بلاک کے پاس پہنچ کر میرے کہنے پر کوچبان نے تانگہ روک لیا۔ گڈو اپنی ماں کی پلاسٹک کی ٹوکری پکڑے بڑے غور سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلے اسے نیچے اتارا اور پھر نجمہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اس طرح اٹھائے جانے سے ہڈیوں کی پوٹ نجمہ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ کرتی تھی۔ سامنے سے نرسوں کی ایک ٹولی آپس میں باتیں کرتی چلی آ رہی تھی۔ پاؤں میں باٹا کے سفید بوٹ۔ سفید شلواریں۔ سفید ایپرن۔ کوئی گوری کوئی کالی۔ کسی کے بال ہیلن کٹ، کسی کے قلوپطرہ کٹ۔ چہرے پر میکس فیکٹر کے کوس میٹک شیڈ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہالی وڈ کے کسی سٹوڈیو میں ہوں۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ہیوی ویٹ بوکسر نے یک وقت کئی مکے میرے دل پر جما دیئے ہیں۔ جیسے میرے گیان دھیان کے گوتم کو دنیا کے مہلک ترین زہر پوٹاشیم سائی نائیڈ کا انجکشن لگا کر پتھر کا بت بنا دیا گیا ہے۔

بڑی بے حجاب، بیباک اور بیہودہ تھیں وہ۔ ایک نے دوسری کی تنی ہوئی چھاتیوں کو چھیڑتے ہوئے بازاری لہجہ میں کہا۔ "بلے بی" اور وہ سب پھر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ میرا اور نجمہ کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ پھبتی کسی گئی تھی۔ میں نے نجمہ کو بلے بی کی طرح سے اٹھایا ہوا تھا۔

"کیا یہ پاگل ہو گئی ہیں۔ بے تحاشا ہنس رہی ہیں" نجمہ نے مجھ سے کہا۔ مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہمارے قریب سے گزریں تو یارڈلے، کُشن، کیپرے کے مختلف لونڈروں کی مہک سے ٹی بی بلاک کی کلوروفارم اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی بُو سے اونگھتی ہوئی فضائیں چونک گئیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی لونڈر پانڈ میں ڈبکی لگا کر نکلی ہیں۔ بڑے ہسپتال کی ٹیکنی کلر سینما سکوپ پکچریں۔ سلولائیڈ، بیکولائٹ اور پلاسٹک کی بنی ہوئی گوری کالی گڑیاں۔ جن کے ساتھ کھیلنے والے سامنے ٹک شاپ کے دروازے میں آ گئے تھے۔ کوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کوئی ہاتھ میں پکڑے پھول کو سونگھ رہا تھا۔ کوئی ہوا میں رومال ہلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ ان کے چہروں کے فریم میں ٹکی ہوئی میکانیکی آنکھیں ایکٹنگ کر رہی تھیں۔ ادھر سے بڑے ہسپتال کی چلتی پھرتی ٹک شاپوں نے بھی ایکٹنگ شروع کر دی۔ ایک نے ایپرن کی جیب سے پورٹ ایبل شیشہ اور نائی لون کی کنگھی نکال کر بال درست کرنے شروع کر دیئے۔ دوسری نے ایپرن کی جیب سے رومال نکال لیا۔ تھرا میٹروں اور سرنجوں کے علاوہ بڑے ہسپتال کی ان نرسوں کی جیب میں میک اپ کا سامان بھی تھا۔ برآمدے کی چوٹیں ہو رہی تھیں اور میرے دھیان کے گوتم کی چیخ نکل گئی۔ یہ چوٹیں اس کے سینے پر پڑ رہی تھیں۔

وہ ان نرسوں میں فلورنس نائٹ انگیل کو ڈھونڈھنے لگا۔ فلورنس نائٹ انگیل۔ جس نے بیماروں کی تیمارداری میں اپنا سکھ چین لٹا دیا تھا۔ جس نے زخمی انسانوں کے زخموں پر اپنی پلکوں کے پھاہے رکھے تھے۔ کتنی عظیم ترین عورت تھی۔ مگر یہ تو سفید ایپرنوں میں لپٹی ہوئی نائٹ کلبیں تھیں۔ کسی پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی۔ یارڈلے، کولبری اور کشن کے سینٹوں کی خوش نما شیشیاں۔ میرے گیان دھیان کے گوتم نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ فلورنس نائٹ انگیل کی ایبسٹرکشن دیکھنے کو تیار نہ تھا۔ ایبسٹرکٹ آرٹ کے یہ نمونے ہسپتال میں نہیں کسی کیبرے اور ڈانس ہال میں۔ کوکٹیل پارٹی میں، کسی آرٹ گیلری میں سجائے جا سکتے ہیں۔

کوریڈر سے گزر کر میں نجمہ کو ٹی بی بلاک کے میڈیکل آفیسر کے کمرے کے پاس لے آیا۔ لمبی سی پورچ میں پانچ چھ بنچ بچھے ہوئے تھے۔ جن پر مدقوق مریض چپ چاپ بیٹھے تھے۔ عورتیں۔ مرد۔ بچے۔ ان کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے نجمہ اور گڈو کو ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ اسی اثنا میں میڈیکل آفیسر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے چپڑاسی نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب ہو کر اس سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب اندر ہیں؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور وہ اپنی ٹوپی جھاڑنے لگا۔ میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور میرا بھی مستک پھر گیا۔ اس کے کندھے کو جھٹکاتے ہوئے میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور

اس نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے ابھی کھا ہی جائے گا۔ مگر اس کے دانت باہر نکلنے سے پہلے ہی کھٹے ہو گئے تھے اس نے میری آنکھوں میں بھی کچھ دیکھ لیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب وارڈ کا دورہ کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک آئیں گے۔" وہ یوں بولا۔ جیسے بولنا تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً بول رہا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا روکھا پن، بڑی بیزاری، بڑی اجنبیت تھی۔

میں پلٹ کر تجمہ کے پاس ہی بنچ پہ بیٹھ گیا۔ پورچ کے دو رویہ رکھے ہوئے گملوں میں کھلے ہوئے سرمائی پھول اداس اداس نظر آ رہے تھے۔ ٹی بی وارڈ کی دیواروں اور دروازوں پہ تھرتھراتی ہوئی بجھی بجھی دھوپ بھی اداس اداس معلوم ہوتی تھی۔ بڑی کھڑکیوں پہ لگی ہوئی جالیوں کے اندر دق کے مریض مختلف حالتوں میں نظر آ رہے تھے۔ کوئی کمبل تانے چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا مگر یوں جیسے وہ لیٹا ہوا نہیں پھانسی کے تختے پہ لٹک رہا ہے۔ کسی کو دوائی پلائی جا رہی تھی مگر ایسے جیسے دوائی نہیں اُسے تیزاب پلایا جا رہا ہے۔ کوئی مریض کچھ کھا رہا تھا جیسے زہر کھا رہا ہو۔ کسی مریض کا بستر اور کپڑے بدلے جا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے بعد وہ مریض اپنی جُون بدل جائے گا۔

اِدھر اُدھر آتی جاتی نرسیں بڑی مصروف نظر آ رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا کام کر رہی ہیں۔ بڑے ہسپتال سے بھی بڑا کام۔ مگر وقت ان کے پاس بہت تھوڑا ہے۔ کوئی مریض دریچے کی جالی سے سر لگائے باہر کی دُنیا کو حسرتناک

نظروں سے یوں جھانک رہا تھا۔ جیسے اس دنیا سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے مگر اپنے آپ کو زندہ نہیں سمجھتا۔ اور اپنے ہر سانس کو ٹٹولتا ہے کہ آ رہا ہے یا نہیں۔ وہ سانس لے رہا ہے۔ مگر اُسے یقین نہیں آتا کہ سانس لے رہا ہے۔ اتنے فاصلے سے میں نے جتنے بھی مدقوق مریض دیکھے ان میں کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن بھی نظر نہ آئی۔

بظاہر بڑی ہماہمی نظر آ رہی تھی وارڈ میں لیکن اس کی تہ میں ایک بیکراں خاموشی اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی۔ جیسے موت شبخون مارنے کے لئے ان دیواروں اور جالیوں میں کوئی راستہ دیکھ رہی ہو۔

"کیا آپ نے پرچی بنوالی ہے ؟" یہ ایک اور چپڑاسی کی آواز تھی۔ جو ڈاکٹر صاحب کے دروازے پر کھڑے ہوئے چپڑاسی سے مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تو پتھر کا بنا ہوا تھا لیکن اس کی آواز کہہ رہی تھی یہ موم کا بنا ہوا ہے۔ اور پگھل رہا ہے۔

"کیسی پرچی ؟" میں نے پوچھا۔

"معائنہ کی پرچی۔"

"بھیا ایسی تو کوئی پرچی نہیں بنوائی میں نے۔"

"جلدی سے بنوائیے۔ اس کے بغیر تو ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو نہیں دیکھتے۔"

"وہ پرچی کہاں بنے گی ؟"

"ادھر آؤ بابوجی میں بتاتا ہوں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس کے بعد ایک دو تین کمروں سے گزر کر ہم ایک بڑے کمرے میں آ گئے۔ جس کے ایک کونے میں ایک نوجوان نسواری لوئیڈ کا سوٹ پہنے، بھڑک دار ٹائی میں تیر کی شکل کی سنہری پن لگائے بیٹھا تھا۔ وہ بشرے سے بڑا مکار، مغرور، ضدی اور بٹری معلوم ہوتا تھا۔ اس کی میز سے لے کر کمرے کے دروازے تک پرچیاں لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ رہ رہ کر مریضوں کو ڈانٹ ڈپٹ رہا تھا۔ خشکی چھانٹ رہا تھا۔ قطار بناؤ۔ قطار میں آؤ۔ قطار میں جاؤ۔ قطار میں زندہ رہو۔ قطار میں کھڑے کھڑے سوکھ کر مر جاؤ۔ میں بھی قطار کے سرے پر سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ قطار بڑی آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ کافی وقت گزرنے پر قطار میں ذرا سی جنبش پیدا ہوتی اور ایک، دوسرے کے آگے پیچھے کھڑے ہوئے مرد عورتیں ایک قدم آگے اٹھا کر پھر رک جاتے۔ پتھر بن جاتے۔ پرچیاں بنانے والے صاحب شاید ہر مریض کی بڑی چھان بین کر کے، تصدیق کر کے زندگی اور موت کے پاسپورٹ تیار رہے تھے۔ میں کھڑا کھڑا بور ہو گیا تو کھڑکی کی طرف رخ کر کے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُدھر نرسوں کے کوارٹر تھے۔ تین لڑکیاں جو اس وقت نرس کے لباس میں نہ تھیں ناشپاتی کے ننگی شاخوں والے درخت کے پاس کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ اتنے میں موٹا سا ایک خانساماں تپائی پر چائے کا سامان چُننے لگا۔ ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی۔ ناشپاتی کی ننگی ٹہنیاں بے معلوم سی جھُول رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک لڑکی جس نے

ساٹن کی ہلکی نیلی شلوار، ہلکی نیلی قمیض اور گلے میں شنون کا ہلکا نیلا دوپٹہ ڈال رکھا تھا گود میں ہلکے نیلے رنگ کی اون کا گولا لئے سلائیوں سے سوئیٹر بُن رہی تھی۔ اس کے بھورے بالوں کی جھالریں گول گول شانوں کو چھو رہی تھیں۔ دوسری لڑکی کا رنگ سرخ و سفید۔ قد لمبا، کتابی چہرہ، ستواں ناک، آنکھیں موٹی موٹی اور مخمور اور بال آبنوس کی طرح گہرے سیاہ جنہیں اس نے بڑے عجیب انداز سے گوندھ کر گردن پہ ایک بڑا ہی دلکش دائرہ سا بنایا ہوا تھا۔ یہ لڑکی سنہری بارڈر کی سرخ رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی اور آرام کرسی پہ نیم دراز فلمی رسالے پہ کچھ اس انداز سے چہرہ جھکائے ہوئے تھی جیسے وہ اُسے پڑھ نہیں رہی چائے کے ساتھ گھونٹ گھونٹ پی رہی ہے۔ ذرپ اِن ایوری سپ۔ تیسری لڑکی خوب موٹی تازی تھی۔ دھان پان۔ اس کا رنگ لپٹن چائے کی طرح تھا۔ اور اسی رنگ کا دوپٹہ، قمیض اور غرارہ اس کے رنگ کے ساتھ خوب میچ کر رہا تھا۔ کالے کالے بالوں کی دو لٹیں اس کے کندھوں سے ہوتی ہوئیں، چھاتیوں پہ پڑ رہی تھیں۔ ماتھے پہ بالوں کے دو لیف اس نے سانپ کی کُنڈلی کی طرح بنا رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں پہ لپ سٹک کا سرخ شیڈ دور سے انار کی کلی کی طرح دمک رہا تھا۔ اور وہ اداس اداس نظروں سے کبھی کلائی سے لپٹی ہوئی ننھی سی گھڑی کو دیکھ رہی تھی کبھی ناشپاتی کی ننگی ٹہنیوں کو۔ اتنے میں خانساماں ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے ٹرے میں پھل لے آیا۔ مالٹے۔ کینو۔ موسمی۔ ہری چھال کے کیلے۔ سیب۔ گریپ فروٹ۔ وٹامن اے۔ وٹامن بی۔ وٹامن ڈی۔ ملٹی وٹامن۔ زندہ رہنے کے لئے۔ صحت مند رہنے

کے لئے حیاتین نہایت ضروری ہیں۔ اور پھر لان کے اُس سرے پر ایک کاٹیج میں پیانو کی آواز سنائی دی۔ دھیمے دھیمے ہلکے ہلکے ہوا کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے نغمے۔ زمزمے۔ جیسے پھولوں کی پنکھڑیاں اڑ رہی ہوں۔ کھڑکی میں ایک اور کھڑکی کھلی۔ وہیں قطار میں کھڑے کھڑے میں نے کاٹج میں پیانو کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر ناچتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھا۔ ناشپاتی کے پیڑ کے اُس پار زندگی کے پیڑ کی ایک ننگی شاخ ناچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک نوکیلا۔ لمبا۔ وحشی ناخن میرے دل میں اتر گیا ہے۔ کتنا بے مزہ تھا اس کا ناچ۔ جس میں کوئی قوس، کوئی دائرہ، کوئی پیچ و خم نہ تھا۔ بے رس، بے آواز، بے مزہ۔ ناشپاتی کے درخت کی ننگی شاخیں جھول رہی تھیں۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے سرسرا رہے تھے۔ میں ایک قدم آگے کو سرک گیا۔ زمین میں گڑے ہوئے کیلوں کی قطار میں پھر ذرا سی جنبش ہوئی تھی۔

"آپ ابھی تک وہیں کھڑے ہیں؟" یہ اسی چپڑاسی کی آواز تھی۔

"ہاں بھیا وہیں کھڑا ہوں۔ دیکھئے کب باری آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ آیئے۔" اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر آگے لے گیا۔

"جلدی سے ان کی پرچی بنا دیجئے فخری صاحب۔" چپڑاسی نے پرچی لکھنے والے کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کے آدمی ہیں۔"

آنکھ کا اشارہ ہوتے ہی پرچی تیار ہو گئی۔

"لاؤ بابو جی اب یہ پرچی مجھے دے دیں۔ آپ کا کام ختم ہوا آگے میرا کام ہے۔"

میں نے پرچی چپڑاسی کو دے دی۔ اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے پرچی کے ساتھ کچھ اور بھی طلب کیا ہے اس نے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی مٹھی میں دے دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ ہم دونوں پھر وہیں آ گئے جہاں سے گئے تھے۔ گڈو اپنی ماں کے ساتھ توتلی زبان میں نہ جانے چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر پہلے وہ مسکرائی، پھر شرمائی اور خاموش ہو گئی۔ اس کی ماں بنچ سے پیٹھ لگائے اسی حالت میں اکڑوں بیٹھی تھی جس حالت میں میں اُسے چھوڑ گیا تھا، وہ خاموش تھی۔ اس کی ہر چیز بدستور خاموش خاموش معلوم ہو رہی تھی۔ خاموشی لمحہ بہ لمحہ اور زیادہ گہری اور پر اسرار ہوتی جا رہی تھی۔ چپڑاسی پرچی لے کر کمرے میں جا چکا تھا۔ ٹی بی مردانہ وارڈ کی تمام کھڑکیوں کے پٹ اب کھلے ہوئے تھے۔ صحن کے باغ میں چند ایک مریض کندھوں پر سرخ کمبل ڈالے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ایک نرس ناک تک چہرے کو کپڑے کے سفید ماسک میں چھپائے ان کے قریب ہی درختوں کے درمیان تنی ہوئی الگنی پر سفید گیلے رومال پھیلا رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ ساتھ والے بنچ پر بیٹھے ہوئے دو شخص آپس میں کسی سینے ٹوریم کی باتیں کر رہے تھے۔ کوہستانی آب و ہوا کا ذکر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر اگنے والے پر اسرار جنگل۔ چنار، دیودار، صنوبر، چیڑ ھ کے سایوں میں سے گزرنے والی ہوائیں۔

چشمے۔ جھرنے۔ آبشار۔ مرغزار۔ سرخ، گلابی، نارنجی، سبز، سپید، زرد، ہلکے گلابی پھولوں، شگوفوں اور غنچوں سے لدے پھندے آلوچے، سیب، ناشپاتی لوکاٹ اور بادام کے درخت۔ ہرے بھرے میدان۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر منڈلاتے ہوئے بادل۔ سپید سپید کلیوں کی طرح گرتی ہوئی برف کی سرگوشیاں۔ پرندوں کے چہچہے۔ مریض کا ساتھی اسے کسی سینے ٹوریم میں داخل ہونے کا مشورہ دے رہا تھا۔ مریض کوئی متمول دیہاتی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کسی گاؤں سے بڑے ہسپتال میں اپنا معائنہ کرانے آیا تھا۔ پندرہ بیس آدمی اس کی دیکھ بھال کے لیئے اس کے ساتھ تھے۔ وہ بڑے مزے سے کوہستانی آب وہوا کی باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی وارڈ کا معائنہ کر کے آگئے۔ دو تین چھوٹے ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اور اچھے موڈ میں تھے۔ اور سب اچھا تھا۔ مگر ادھر سب اچھا نہیں تھا۔ کئی مریض بیٹھے بیٹھے بور ہو گئے تھے اور بوریت بڑھ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے نجمہ بھی بور ہو چکی تھی۔ اسی اثنا میں چپڑاسی نے دروازے سے گردن باہر نکالتے ہوئے نجمہ کا نام پکارا۔

"گڈو تم یہیں بیٹھو۔ ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ تمہاری امی کو دیکھیں گے۔ دوائی دیں گے۔ ہم ابھی آتے ہیں" میں نے کہا۔

گڈو نے جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھا کر ماں کی صورت کو بڑے پیار سے دیکھا۔ جیسے اس کا پلایا ہوا سارا دودھ اس وقت گڈو کے اندر پیار بن کر کھول اٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپے چھپے آنسو تھے۔

"گڈو - میری بیٹی بیٹھ جاؤ - چند ا بیٹھ جاؤ ۔" میں نے کہا
مگر گڈو نہ بیٹھی اور نہ ہی منہ سے کچھ بولی - جیسے اس نے میری آواز ہی نہ سُنی
تھی - جیسے وہ اس وقت وہاں نہیں تھی - وہ گردن جھکائے اپنی نظروں سے
دھرتی کو گھور رہی تھی - معلوم ہوتا تھا وہ دونوں ہاتھ یوں بھینچ کر سینے پر رکھے
ہوئے موت کے ہیبت ناک دیوتا کے حضور میں فریاد کر رہی تھی -
"دیوتا میری ماں کو صرف اس عرصہ تک زندہ رہنے دے جب تک
میں جوان نہیں ہو جاتی - پرویز جوان نہیں ہو جاتا - کامران جوان نہیں ہو
جاتا ۔"
میں نے نجمہ کو پھر گود میں اٹھایا اور کمرے میں لے گیا - چند دنوں سے اس کی یہ
حالت ہو گئی تھی کہ وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی -
"مریضہ کو یہاں لٹا دیں ۔" ڈاکٹر نے آٹو میٹک سکریننگ پلانٹ کے تختے
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا - میں نے نجمہ کو اس پر لٹا دیا - اور پھر ڈاکٹر
کے اشارے پر ایک نرس نے دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا - کمرے میں گونج
سی سنائی دی - سکریننگ پلانٹ بجلی کی رو سے حرکت میں آ چکا تھا - تختے کی
بائیں جانب سے گنبد نما ایک بڑا سا برقی آلہ لٹو کی طرح گھومتے ہوئے نجمہ کے
سینے پر آ کر رک گیا - نرس نے فوراً ہی دوسرا بٹن دبایا - اور گنبد نما برقی آلہ میں ایک
جھروکہ سا بن گیا - اس میں مختلف ملے جلے رنگوں کی روشنیوں کی ایک قوس قزح
سی چمکی ، دھندلا گئی - دھند سی پھیل گئی - پھر روشنی ہوئی اور جھروکے میں ایک تصویر
ابھر آئی - نجمہ کے دونوں پھیپھڑوں کا عکس - جیسے ڈاکٹر نے اپنی عینک چہرے

پہ درست کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا۔ اور پھر اس نے ایک طرف جاتے ہوئے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"مریضہ کا بایاں پھیپھڑا بالکل بیکار ہو چکا ہے۔" اس نے آہستہ آواز میں مجھ سے کہا۔

"اور دائیں پھیپھڑے میں بھی یہ بیماری موجود ہے۔ بایاں پھیپھڑا لاعلاج ہو چکا ہے۔ ایسے مریض کی کسی وقت بھی موت واقع ہو سکتی ہے۔ مگر خدا کی قدرت کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ایسا مریض ایسی حالت میں پانچ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اور جی سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ عورت صرف پانچ سال اور زندہ رہے۔ اس کے بچے ذرا اور اونچے ہو جائیں۔ وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر یہ بیشک مر جائے۔" میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

"مرنا سب نے ہے ڈاکٹر صاحب۔ پر اس وقت تو اس کی موت اک قیامت ہو گی۔ میرے لئے۔ اس کے بچوں کے لئے۔ اس کے لئے۔ اس کی بے چین روح گلی گلی کوچے کوچے اپنے بچوں کے پیچھے بھٹکتی پھرے گی۔ ڈاکٹر صاحب۔ اس کی جدائی جیسے ہو گا میں تو برداشت کر لوں گا مگر یہ بچے کیسے برداشت کریں گے۔ پہاڑ سا یہ غم اتنے چھوٹے چھوٹے دل کیونکہ سہہ سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرے دونوں پھیپھڑے نکال کر اس کے پھیپھڑوں سے بدل دیئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب میرا دل

اب بھی اس کا ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کا ہوگا۔ یہ اس کی امانت ہے میرے پاس۔ آپ اسے نکال کر کسی طرح اس کے کمزور اور تھکے ہوئے دل کے ساتھ ملا دیں۔ اس کا دل اور اُس کی ہر دھڑکن میرے لئے بڑی مقدس ہے۔ میری ساری زندگی کی عبادت اس کی ایک دھڑکن کے برابر بھی نہیں۔ اس کا دل میرا تیرتھ ہے۔ میرا شوالہ ہے۔ یہ میرے پیار کی مورتی ہے۔ میری ڈریم لینڈ کی مونالزا ہے۔ میرے سپنوں کی بستی کی بیاٹرس ہے۔ زندگی کے یہ دس سال جو ہم نے مل جل کر گزارے ہیں اس کی پوجا کے لئے بہت تھوڑے تھے۔ دس صدیاں بھی تھوڑی ہیں۔ دس جنم بھی بہت تھوڑے ہیں۔ اس کی پوجا میں گزارے ہوئے دس سال مجھے اپنے پیار کا وہ پہلا لمحہ معلوم ہوتے ہیں جس کی ابھی ابتدا ہوئی ہے۔"

میری آواز میں جذبات کا ایک طوفان امڈ آیا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر ڈاکٹر جذباتی نہیں تھا۔ میری باتیں سن کر اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی، کہنے لگا۔

"میں دوائیں لکھے دیتا ہوں۔ مریضہ کو استعمال کرائیں۔ ایک ہفتہ کے بعد اسے پھر یہاں لائیں۔ میں پھر معائنہ کروں گا۔"

"میں اِسے یہاں داخل کرانے کے لئے لایا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ اسے داخل کرلیں۔ اب اس کا گھر پر علاج نہیں ہو سکتا۔ مرض بڑی شدید صورت اختیار کر چکا ہے۔"

"فی الحال کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ کم سے کم دو مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔

"مگر اس کی حالت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔"

"آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔"

"مجھے افسوس ہے میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"میں آپ کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔"

"مریض بہت ہیں۔ بیڈ کم ہیں۔ پانچسو مریض ویٹنگ لسٹ میں پڑے ہیں۔ بتائیے کیا کیا جائے میں مجبور ہوں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"اگر آپ عنایت کریں تو گنجائش نکل سکتی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جو مریض مدت سے داخلے کے منتظر ہیں ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جا سکتی۔ کیا آپ اس ناانصافی کو پسند کریں گے؟"

"جی نہیں۔ میں یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی مریض کو محروم کر کے اس کا بیڈ میری بیوی کو دے دیا جائے۔ یہ انسانی شعور کی بات نہیں۔ میں تو گنجائش کی بات کر رہا تھا۔ کہ اگر گنجائش ہو تو—"

"جی گنجائش بالکل نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مگر گنجائش تھی اور ہر وقت ہوتی ہے۔ یہ سب مجھے اُس دن معلوم ہوا۔ جن کو داخل کرنا ہو ان کے لئے گنجائش ہی گنجائش ہے۔ میں نجمہ کو لے کر باہر آیا تو کوریڈر میں ایک شخص دوسرے شخص سے گنجائش کی باتیں ہی کر رہا تھا۔ وہ کہہ

رہا تھا۔

"بڑی مشکل سے بیڈ ملا تھا ہمارے مریض کو۔ ڈاکٹر نے ہاں کر لی تھی۔
پرچی پہ تاریخ پڑنے کی دیر تھی۔ پر اوپر سے ایک اور آفت پڑ گئی۔ ایک
سفارشی مریض آ گیا۔ لہذا بیڈ اُسے اور جواب ہمارے مریض کو مل گیا۔
تاریخ لمبی ہو گئی۔ کیلنڈر بدل گئے۔ ایک منٹ پہلے جہاں گنجائش تھی
گنجائش نہ رہی۔ ہسپتالوں میں بھی سفارش ہی چلتی ہے۔ یہ سفارش
کا زمانہ ہے۔ زر کا زمانہ ہے۔ زر ہو جی چاہے سو کر۔"

اور معاً مجھے خیال آیا ڈاکٹر صاحب کا انصاف اس وقت شاید سو گیا ہو گا۔ اور
انصاف کی ایک توپ سی درغ گئی میرے دماغ میں۔ بڑے زور کا ایک دھماکہ
ہوا۔ میرے گیان دھیان کے گوتم پر فالج گر گیا۔ مکتی اندھی ہو گئی۔ نروان لنگڑا
ہو گیا۔ مگر نہیں وہ تو میرا اپنا ہی اک احساس تھا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم اپنے
گیان دھیان میں مگن تھا۔ اجالا ایسے تو نہیں ہو گا۔ لاکھوں تاروں کا بلیدان دیا جائیگا۔
کئی چراغ بجھیں گے سحر ہونے تک۔

پرویز اور کامران جیسے شوخ و شریر بچے جنہیں میں نے اس سے پہلے کبھی
سنجیدہ نہ دیکھا تھا اس دن انتہا سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ ہسپتال سے
واپس آ کر میں نے ان میں ایک عجیب انقلاب دیکھا۔ دونوں بھائی دروازے
میں دہلیز پہ ایک دوسرے سے بہت قریب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اور کچھ سوچ
رہے تھے۔ ان کے چہرے اترے اترے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں

آنسو تو نہ تھے مگر بھیگی بھیگی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہروں پہ خوشی کا ایک سایہ سا سرک گیا۔ کامران اُچھل اُچھل کر شور مچانے لگا۔

"امی آئی۔ ابا آیا۔ گڈو آئی۔"

اور اس کی امی نے اُسے بجھی بجھی نظروں سے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"بیٹے میں آئی نہیں جا رہی ہوں۔ چلی جاؤں گی۔ پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔"

کامران بھاگتا ہوا آیا اور اپنی امی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس کی امی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے پیار کیا۔ پرویز اور گڈو نہ جانے کیا کھُسر پھُسر کرتے ہم سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔

"سلیم بابو جلدی سے کھانا منگواؤ میرے بچوں کو بھوک لگ رہی ہے۔"

نجمہ نے کہا۔ اور بستر پہ لیٹ گئی۔

میں نے پرویز کو ہوٹل سے کھانا لانے کے لئے پیسے دیئے۔ اور جلدی آنے کی تاکید کی۔ پرویز ٹیفن کیریئر لے کر کھانا لینے چلا گیا۔ گڈو اپنی گڑیا کے ہیلن کٹ بال سنوارنے لگ گئی۔ کامران اچھل کر میرے پاس چارپائی پہ آ گیا۔ اور میری جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس میں اپنے چہرے کا عکس دیکھنے لگا۔ سگریٹ کیس کا اوپر کا حصہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ روارَوی میں بالوں کو سنوارتے ہوئے کبھی کبھی میں بھی اُس سے آئینے کا کام لیا کرتا تھا۔

ایکا ایکی نجمہ کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے اپنے بچوں کی عمر کے اندازے لگانے شروع کر دیئے۔ اور اس کے اندازے بالکل ٹھیک نکلے۔

میں نے اپنے ہر بچے کی تاریخ پیدائش ڈائیری میں لکھی ہوئی ہے۔ مگر ماں کا سینہ کتنی عجیب ڈائیری ہے۔ جس پر بظاہر کچھ نہیں لکھا۔ مگر اپنے بچوں کے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ وہ اپنے بچوں کا ہر دکھ، ہر سکھ، ہر واقعہ اپنے سینے میں محفوظ رکھتی ہے۔ پرویز کی عمر اس وقت نو سال کی ہے۔ گڈو کو ساتواں برس جا رہا ہے۔ اور کامران ابھی تین سال کا ہے۔ نجمہ نے اندازے سے اپنے ہر بچے کی جتنی عمر بتائی اتنی ہی نکلی۔ اتنے میں پرویز کھانا لے آیا۔ ہم سب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ نجمہ تو دو تین نوالے لے کر ایک طرف ہو گئی۔ چند دنوں سے اسے نہ تو بھوک لگ رہی تھی اور نہ رات کو نیند آ رہی تھی۔ اور مجھے بھی اس دن کوئی خاص بھوک نہ تھی۔ چند نوالے لئے اور بس پیٹ بھر گیا۔ روغن جوش گڈو بڑے جوش و خروش سے کھایا کرتی ہے مگر اس دن اس نے سالن کو ہاتھ ہی نہ لگایا۔ تھوڑے سے سادہ چاول کھائے اور بس۔ مگر پرویز اور کامران حسب معمول ڈٹے رہے۔

سردی ہو یا گرمی دوپہر کا کھانا کھا کر میں قیلولہ کیا کرتا ہوں۔ مگر اس دن میری آنکھ ہی نہ لگ رہی تھی۔ بظاہر آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ رات جو طوفان میرے اندر اٹھا تھا ابھی گزرا نہ تھا۔ سطح خاموش تھی مگر عمق میں کچھ ہو رہا تھا۔ بڑی تیزی سے کچھ ہو رہا تھا۔ وہ آواز جو گذشتہ رات میرے اندر گونجی تھی اب بھی گونج رہی تھی۔ مگر اب بڑی مدھم ہو گئی تھی۔ پھر بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے دلاسے دے رہی تھی۔

"جو کچھ ہونا ہے ہو ہی جانا ہے۔ تم ہمت نہ ہارنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہارے بہت قریب ہوں۔ میں تمہارے اور قریب آ رہی ہوں۔ کیا تمہیں میرے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی؟ دروازہ کھولو۔ مجھے اندر آنے دو۔ دروازہ کھولو۔"

اور میں چونک گیا۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اتنے میں پرویز بھاگا بھاگا آیا۔ کہنے لگا۔

"ابا آپ کو باہر دو آدمی بلا رہے ہیں۔"

میں جلدی سے باہر گیا۔ رسمی جملوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحب اس سامان کا سودا کرنے آئے ہیں جو کہ بوٹ بنانے کا کارخانہ بند ہو جانے سے بڑی دیر سے گودام میں بیکار پڑا تھا۔ میں نے اُسے فروخت کرنے کے لئے بستی کے ایک بروکر سے کہا ہوا تھا۔ وہ کمیشن پر ایسی چیزوں کا سودا کرنا کراتا تھا۔ وہ اس دن ایک ضرورت مند گاہک کو گھیر گھار لایا تھا۔ میں نے مال دکھایا۔ اور اس کا اخیری جو کچھ لینا تھا بتا دیا۔ وہ مال میں نے دو ہزار روپے میں خریدا تھا۔ مگر سات سو روپے میں بیچ رہا تھا اور وہیں کھڑے کھڑے بک گیا۔ جو بند ہو جائے سو موتی۔ مال کی مجھے ضرورت تھی مال بل گیا۔ میں نے یہ خوشخبری نجمہ کو سنائی تو بہت خوش ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے آتے ہی میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کے ریلے پھر تیز ہو گئے۔ اور تیز۔ اور تیز۔ طوفان ایک چٹان سے ٹکرا رہا تھا۔ چٹان سامنے کرسی پر تنی بیٹھی تھی۔ میں ٹی بی بلاک کے ایڈمنسٹریٹر کا پتہ معلوم کر کے اس کی کوٹھی پہنچا اور اُس سے بات کی۔ اور بات بن گئی۔ میں نے

دو کاغذ اُدھر سرکائے تو اُدھر سے بھی ایک کاغذ سرک کر ادھر آیا۔ یہ نجمہ کے داخلے کی چٹ تھی۔ انصاف پسند ڈاکٹر کے نام تاکیدی حکمنامہ۔

"کل ٹھیک نو بجے اپنی بیوی کو لے کر ہسپتال پہنچ جائیں۔ اسے داخل کر لیا جائے گا"۔ ایڈمنسٹریٹر نے مجھ سے کہا۔

میں نے چٹ لے کر جیب میں ڈالی۔ سلام کیا اور چل نکلا۔ لیڈی ڈاکٹر فردوس کی ڈسپنسری میں آیا۔ بل ادا کیا۔ بوجھ ہلکا کیا۔ وہاں سے بازار کی طرف نکل گیا۔ سرسوں کا ساگ اور گوشت خریدا۔ میں گھر سے چلا تو نجمہ نے مجھ سے کہا تھا۔

"سلیم بابو میرا جی چاہتا ہے سرسوں کا ساگ گوشت کھاؤں۔ آتے ہوئے لیتے آنا۔ کل سے بازار سے کھانا آ رہا ہے۔ بے مزہ۔ باسی۔ بہت مہنگا"

جب سے نجمہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تھی میں خود ہی کھانا پکایا کرتا تھا۔ اور یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کے آنے سے پہلے بھی یہ سب چیزیں میرے گھریلو مشاغل میں شامل تھیں۔ والدہ کی بینائی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کے سارے کام کاج کرنے پڑتے تھے۔

ساگ دھو کر میں نے کروسین آئیل سٹوو جلایا۔ ہنڈیا دھر دی۔ تینوں بچے اس وقت محلے کے بچوں کے ساتھ گھر کے دروازے کے قریب کھیل رہے تھے۔ سرسوں کا ساگ پکتے ہوئے بڑا پانی چھوڑتا ہے۔ تیل کی تین بوتلیں پھک چکی تھیں مگر پانی تھا کہ ابھی تک ہنڈیا میں پھتر پھتر کر رہا تھا۔ میں نے سٹوو کین میں تیل کی ایک اور بوتل ڈالی۔ تو مدھم ہوتا ہوا شعلہ یکدم پھر ابھرا۔ اور باہر چلتا ہوا

جھکڑ اور تیز ہوگیا۔ کالے کالے بادل آسمان میں گھرے ہونے لگے۔ کمرے میں اندھیرا ہوتا جارہا تھا۔ میں نے لمپ جلا دیا۔ نجمہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھی تھی۔ بولی۔

"اب کیا بجا ہوگا؟"

میں نے گھڑی دیکھی تو پانچ بج رہے تھے۔ "پانچ بج گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سلیم بابو یہاں آؤ میرے پاس۔" نجمہ نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے نجمی؟" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔

"بچوں کی آواز نہیں آرہی۔ کیا سو گئے ہیں؟"

"ہاں سو گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"آہ۔ میرے بچے بھوکے ہی سو گئے۔" نجمہ بولی۔ "سلیم بابو انہیں کچھ کھلا پلا تو دیا ہوتا۔"

"ساگ کا پانی ہی سوکھنے میں نہیں آتا۔ تیل کی چوتھی بوتل پھک رہی ہے۔ یہ ہو جائے تو انہیں جگا دوں۔ کھا پی لیں۔"

"سلیم بابو ہر چیز مجھے دھندلی دھندلی اور دور کیوں نظر آنے لگی ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"رات ہوگئی ہے نجمی۔ اور باہر بڑے زور سے جھکڑ چل رہا ہے۔ ہر طرف

دھول ہی دھول اڑ رہی ہے۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں بھی آ رہی ہے۔ میں اسے بند کئے دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور جلدی سے بتی بھی جلا دو بابو۔ میرا دل گھبرانے لگا ہے، دھند اور اندھیرے میں۔"

میں نے جلدی سے بتی جلائی۔ کھڑکی بند کر دی۔ اور پھر نجمہ کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

"سلیم بابو! ایک بات کہوں تم سے۔" نجمہ نے کہا۔

"کہو نجمی۔" میں نے کہا۔

"میرے بعد میرے بچوں کو اچھی طرح رکھنا۔ انہیں رنجیدہ نہ ہونے دینا۔ یہ میرے پیار کی نشانیاں ہیں۔ انہیں اپنے دل سے لگا کر رکھنا۔ میں تو اب تمہارے پاس گھڑی پل کی مہمان ہوں۔" نجمہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایسا نہ کہو نجمی۔ ایسا نہ کہو۔ خدا تمہیں تمہارے بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔ تم ان کی خوشیاں دیکھو۔ میرا ہر سانس، میرے دل کی ہر دھڑکن تمہارے لئے ہر وقت یہی دعا کرتی ہے۔"

"اب دعائیں اور دوائیں بیکار ہیں بابو۔ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ آنے والے اجالے کو میں نہ دیکھوں گی۔" نجمہ نے خوابناک آواز میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کالی بیرن رات بچھوڑے کا سندیسہ لیکے آئی ہے۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ یہی ہونا تھا۔ ان بچوں کی کوئی خوشی دیکھنا میرے نصیب میں

نہ تھا۔ میں اپنے دل میں یہ حسرت لیے جا رہی ہوں۔ خدا انھیں ان کے سر پر سلامت رکھے۔ تمھیں ان کی خوشیاں دکھائے۔ تم کہانیاں لکھتے ہو بابو۔ سمجھنا مجھ سے پیار نہیں کیا تھا تم نے ایک کہانی لکھی تھی۔ اس کہانی میں اب تمھیں باپ کا ہی نہیں ماں کا کردار بھی ادا کرنا ہوگا۔ اور تم کرو گے۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم میرے بچوں کو پھول کی طرح رکھو گے۔ یہ کون ہے؟ کون ہے یہ؟ میرے سرہانے یہ کون کھڑا ہے؟"

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ یونہی میرا خیال ہے۔ اچھا خیال ہی سہی۔ سلیم بابو۔۔"

"نجمی۔"

"مجھے بی بی جان کے پاس لے چلو۔"

"نہیں نجمی نہیں۔ تمھیں آرام کرنا چاہیئے تمھیں بڑے آرام کی ضرورت ہے۔"

"اچھا تو پھر ان کو میرے پاس لے آؤ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے ان سے ملنے نہ دو گے؟ یہ وقت پھر نہیں آئے گا بابو۔"

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑا
ابکے بچھڑے کب ملیں گے دور پڑینگے جا

نجمہ کی آنکھیں ساون کے بادل بن گئیں۔ ان سے آنسو برسنے لگے۔ وہ میری والدہ کو بی بی جان کہتی تھی۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا۔ اور اپنی والدہ

کو لے آیا۔ نجمہ ان کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور دبی آواز میں نہ جانے اُس نے کیا کہا کہ میری والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ کامل سکوت کے چند لمحے یونہی گزر گئے۔ اور پھر ایکا ایکی نجمہ کو کھانسی اٹھی۔ وہ کھانستے کھانستے دوہری ہوگئی۔ اور اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی۔

"سلیم بابو میں جارہی ہوں۔ میں جارہی ہوں۔ میری نبض۔ میرا دل۔"

میں نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی، جو چل رہی تھی مگر ایسے جیسے نہیں چل رہی۔ میں نے اُسے لیکوئڈ کورامین دی۔ چند منٹ دوائی کے ردعمل کا انتظار کیا۔ نتائج تسلی بخش نہ تھے۔ نجمہ کی حالت انتہائی طور پر تشویشناک ہورہی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی تھی۔ میں چھاتا لے کر قریب ہی کی ایک ڈسپنسری سے ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے پہلے نجمہ کی نبض دیکھی پھر اسٹیتھسکوپ سے اس کے دل کا معائنہ کیا۔ جلدی جلدی بیگ کھول کر ضروری سامان نکالا۔ نجمہ کو کارامین کا انجکشن کیا۔ وہ کوما کی حالت میں تھی اس وقت۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"ویری سیریس کیس۔ اکیوٹ ہارٹ اٹیک۔ نو ہوپ۔ بٹ دی مسٹ فائٹ ودآ در بروکن دے پنز۔ چلیے میں آپ کو ڈسپنسری سے ایک دوائی دیتا ہوں۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ڈوز دیتے جائیں۔ اور دوسرے ڈوز کے دومنٹ بعد ایک کیپسول۔"

گرج چمک کے ساتھ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ ہوائیں پھنکارنے لگی تھیں۔ چھاتا میں نے ڈاکٹر کے اوپر کردیا۔ اور خود بارش میں بھیگتے ہوئے اس کے

ساتھ ہو گیا۔ بادلوں سے ٹپکتی ہر بوند مجھ پہ آنسو بن کر گر رہی تھی۔ ویری سیریئس کیس۔ پھنکارتی ہواؤں کی رفتار اور تیز ہوتی چلی گئی۔ اور تیز۔ اور تیز۔ میری کہانیوں کے کاغذی گُدے پھڑپھڑانے لگے۔ بھیگ بھیگ کر پھٹنے لگے۔ ہر چیز مجھے کانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے بھونچال کے جھٹکے آ رہے ہوں۔ ایک بڑی ہی مہیب سی گونج۔ سرسراہٹ۔ ویری سیریئس کیس۔ ڈاکٹر کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں متحرک تھی۔ ڈاکٹر کی آواز۔ اور کئی آوازیں۔ ہلکا ہلکا شور۔ جیسے کسی کو ٹکٹکی سے باندھ کر سر سراتے ہوئے کوڑے لگائے جا رہے ہوں۔ جیسے کسی کو تپتی ہوئی سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔ جیسے ڈائنامیٹ کی ہوئی دھرتی میں چھپی ہوئی چٹانیں اُڑ رہی ہوں۔ ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں۔ دھواں ہی دھواں۔۔ دھند ہی دھند۔ دبلے دبلے دھماکے۔ میری کہانیوں کے تاج محل گر رہے تھے۔ میری محبت کے مینا بازار اجڑ رہے تھے۔ میری داستانوں کے شبستانوں میں صورِ اسرافیل پھونکا جا رہا تھا۔ میری کہانیوں کے کاغذی کردار اپنے کاغذی پیرہن پھاڑ رہے تھے، انہیں نوچ کر ہواؤں میں اڑا رہے تھے۔ وہ سب پاگل ہو گئے تھے۔ میرے سپنوں کی بستی میں۔ میری ڈریم لینڈ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ میرے سپنے، میری سوچیں سوکھے پتوں کی طرح طوفان میں اڑی جا رہی تھیں۔ نو ہوپ۔ اکیوٹ ہارٹ اٹیک۔ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کی سربفلک چوٹیوں پر گرنے والے برف میرے دل پر گرنے لگی۔ ماؤنٹ ایورسٹ، کنچن جنگا، دھولاگری، کیلو، کوہ ایلپس کے برفانی تودے بادل بن کر میرے دل پر جھکنے لگے۔ زلزلہ۔ آندھی۔ برفباری۔ بیک وقت ایک

طوفان میں کئی طوفان تھے۔ اور میں تھا۔ شدید ترین برفباری۔ جس میں تن تنہا، اکیلا، تھکا ہارا ایک جلا وطن ڈگمگاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جلا وطن۔ جسے فقط ایک لڑکی سے پیار کرنے کے جرم میں دھرتی اور آسمان کے دیوتاؤں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ ڈسپنسری سے جھونپڑے تک پہنچتے ہوئے میں نے سائبیریا کے بھیانک برفانی ویرانوں کو عبور کیا تھا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میرے کپڑے پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ میں ٹھٹھرتا، کانپتا، ہانپتا کمرے میں آیا۔ نجمہ میری والدہ کے آغوش میں تھی۔ وہ رک رک کے سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں نے اُسے دوائی کا پہلا ڈوز دیا۔ اور اس کی نبض تھام کر بیٹھ گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے دیئے کی لو بجھنے سے پہلے ایک بار ابھرتی ہے۔ اس کی نبض دوائی دینے سے چند منٹ بعد ابھری اور میری انگلیوں میں لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی گئی اور پھر گم ہو گئی۔ نجمہ رُک رُک کے سانسوں کی بھول بھلیاں میں کھو گئی۔ ڈوبتی نبض کی محسوس نہ ہوتی ہوئی دھڑکنوں کی گتھیوں میں گم ہو گئی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا انقلاب آ گیا۔ زمین و آسمان کے دیوتاؤں نے مجھ سے میرے سپنوں کی بستی کی بیاٹرس کو چھین لیا۔ میری ڈریم لینڈ کی مونالزا مر گئی۔ نجمہ مر گئی ۔ میری محبت کی کہانی ختم ہو گئی ۔ میری محبت کی کہانی۔ جسے میں نے مولسری کی مہک سے اپنے دل کی ہر دھڑکن پر لکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پتھر میں ڈھل گیا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں سن رہا تھا مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ موت کے جادو نے ہر چیز کو مسحور کر لیا تھا۔ اور

پھر ایکا ایکی ایک بھیانک دہماکہ سا ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔ بجلی چمکی اور یوں چمکی جیسے نجمہ کی لاش کو چھو کر کمرے سے باہر نکل گئی ہو۔ موت کا طلسم ٹوٹتے ہی خاموشی میں رونے اور چیخنے کی دردناک آوازیں ایک کے بعد ایک بلند ہوتی چلی گئیں۔ میری ماں کے بین سن کر بچے بھی جاگ گئے تھے۔ اور اپنی ماں کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے کھولتے ہوئے آنسوؤں کے دجلہ و فرات بہہ رہے تھے، اور ان کی لہریں اُس پتھر سے بھی ٹکرا گئیں ہیں جس میں ڈھل گیا تھا۔ پتھر موم ہوگیا۔ پتھر پگھل گیا۔ پتھر پانی ہوگیا۔ کتنی آگ تھی ننھے ننھے آنسوؤں میں۔ میری زندگی کے سائبیریا کے برفانی میدان سلگ اٹھے۔ میرے یرقاتے ہوئے جسم میں حرارت آگئی۔ میں اُس جگہ سے اُٹھا۔ بچوں کو باری باری سینے سے لگا کر پیار کیا۔ انہیں تسلی دی۔ دلاسے دیئے۔ نجمہ کے ہاتھ کو آخری بوسہ دیا۔ اپنی بیتی ہوئی بہار کا آخری پھول اس کی لاش پر دھر دیا۔ ٹکٹکی لگائے اس کے چہرے کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ میری محبت کی دیوی — میری حوا — میری جواں مرگ حسرتوں کے ریوا کنڈ کی روپ متی۔ میری پدمنی —— میری دیول دیوی۔ میری گیت مالا کی کدامبری —— میری چتر لیکھا —— میری ہیلن —— میرے سپنوں کی بستی کا سنہری سپنا سی شیا —— میری ڈریم لینڈ کی پری فانگ ین —— میرے دل کے شوالے کی راہبہ اور شاعرہ یُوسو آنچی —— میری آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کے دریائے نیل کی بیٹی —— نجمہ —— میری قلوپطرہ —— جسے موت کے افعی نے ڈس لیا تھا۔ جو مرنے کے بعد شکسپیئر

کی جیولیٹ سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ جس کے چہرے کی معصومیت اور بھولا پن پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو لحاف سے ڈھانپ دیا۔

میری رگوں میں خون کی گردش اچانک تیز ہوگئی۔ میری آنکھوں کے سامنے خون کے دھبے سے ناچنے لگے۔ لہو کے داغ ایک خونیں دائرے میں وحشیانہ رقص کرنے لگے۔ میرے اندر بھی ایک لہو ترنگ اٹھی۔ جس سے میرا ذہنی توازن قائم نہ رہا۔ میں پاگل ہوگیا۔ میں چیخنے لگا ـــ مکتی ـــ نروان ـــ بھگوان ـــ کہاں ہے؟ کدھر ہے؟ سامنے آؤ ـــ پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے ڈھانچوں کے پیدا کرنے والے سامنے آؤ۔ اندھیروں کے جنگل میں سسکتے ہوئے سوکھے سڑے گوشت کے ان لوتھڑوں کے خدا سامنے آؤ۔ میں تجھے تیرے انسان دکھاؤں۔ تیرے شاہکار دکھاؤں۔ تجھے تیری دیمک لگی ہوئی، گرہن لگی ہوئی مخلوق دکھاؤں۔ تجھے تیری صناعی کے نادر نمونے دکھاؤں۔ ان کے پھیپھڑوں کے ناسور دکھاؤں۔ سوراخ دکھاؤں۔ کیا تم ان کے لئے کچھ نہیں کروگے؟ کیا یہ لہو تھوکتے کھانستے ہوئے ہی مٹی میں مل جائیں گے؟ آب و گل کے یہ کھلونے کیا تو نے اسی لئے بنائے ہیں؟ یہ دیکھو میری محبت کی لاش۔ تین کم سن بچوں کی ماں کی لاش۔ نجمہ کی لاش ـــ مولسری کے پھول کی لاش۔ کیا یہ اپنے بچوں کو بلکتے سسکتے ہی چھوڑ جائے گی؟ اس بکھرائے ہوئے جسم میں کیا اب کبھی کوئی جنبش نہ ہوگی؟ میں نے تم سے نروان اور مکتی مانگی تھی اس کی موت نہیں مانگی تھی۔ میں نے

ان اندھیروں میں سویرا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُجالا کرنا چاہا تھا۔ رات دن شعلوں میں جلتی ہوئی ان سولہ لاکھ جُھلسی ہوئی روحوں کے جہنم کو جنت بنانا چاہا تھا۔ میری نیکی کا کیا یہی اجر ہے؟ میری انسان دوستی کا کیا یہی صلہ ہے؟ کہاں ہو؟ زمین و آسماں کے خدا تم کہاں ہو؟ آواز دو مجھے آواز دو۔ مگر کوئی آواز نہ آئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میری چیخیں میرے نالے چمکتی بجلیوں اور گرجتے بادلوں کے شور میں سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ اور میں نے اپنے گیان دھیان کے گوتم کے بولتے چالتے بت کو توڑ دینے کی ٹھان لی۔ اس نے مجھے بڑے غلط راستے پر لگایا تھا۔ اس کے کہنے پر میں نے اپنے ساتھ اپنی محبت کو بھی موت کے جراثیم کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ دق کی بیماری اسے خدمتِ خلق کرتے ہوئے اس بستی کی کسی مدقوق عورت ہی سے لگی تھی۔ نجمہ اتنی ہمدرد عورت تھی کہ کسی حد تک محتاط رہتے ہوئے دق کے لاوارث و نادار مریضوں کے کپڑے خود اپنے ہاتھ سے دھونے میں بھی گریز نہ کرتی تھی۔ اس نے ضرورت مند مریضوں کے لئے مجھ سے چوری چوری ایک دوبارہ اپنا خون بھی دیا تھا۔ پھر نہ جانے کب، کیسے، کہاں یہ حادثہ، یہ المیہ، یہ جانکاہ سانحہ رونما ہوا کہ اس نے اپنے پھیپھڑے کو بھی داغی کر لیا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم بھی مجھے اس وقت سازشی اور سکینڈل ساز معلوم ہوا۔ مجھے اس میں اور انیس خاں میں کچھ فرق نظر نہ آیا۔ پہلے اپنے گیان دھیان کے گوتم اور اس کے بعد اس بستی کے شیطان انیس خاں کو ختم کرنے کا، ہلاک کرنے کا میں نے اسی وقت منصوبہ بنا لیا۔ میری آنکھوں سے نکلتے ہوئے شرارے اور تیز ہو گئے۔ میری رگوں میں

کھولتے ہوئے خون کی گردش اور تیز ہوگئی۔ غم و غصہ کا ایک بگولہ سا میرے اندر اٹھا اور میں گھوم گیا۔ عین اسی وقت بادل گرجا۔ بجلی چمکی اور میں نے اپنے آپ کو مولسری کے پیڑ تلے پایا۔ اور ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرے گرد و پیش کی ہر چیز میرے سپنوں کا ایک طلسم سی بن گئی۔ مولسری کے پیڑ کے پتے پتے، ٹہنی ٹہنی سے گلابی نور پھوٹ رہا تھا۔ جس میں میرے گیان دھیان کا گوتم پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھا ابوالہول کی طرح میرے سپنوں کی بربادبستی کے ویرانے کو دیکھ رہا تھا۔ ریگستان کو دیکھ رہا تھا۔ طوفان نے میرے سپنوں کی دنیا کو ریزہ ریزہ کر کے ریگستان بنا دیا تھا۔ اب وہاں ریت ہی ریت تھی۔ بگولے تھے۔ غول بیابانی تھے۔ صحرا میں اٹھی ہوئی چٹانیں تھیں اور ان کے لمبے لمبے پھیلے پھیلے سائے تھے۔ جن میں ایک جگہ میرے سپنے نجمہ کی لاش کو حنوط کرنے میں مصروف تھے۔ مومیائی مسالے، کیمیائی مرکب، مردے کو صدیوں تک محفوظ رکھنے والے دارنش لاش کو لگائے جا رہے تھے۔ مولسری کے پھولوں کا لباس، کفن اور کوفن تیار کئے جا رہے تھے۔ دو اونچی اونچی، ہیکل کی سی شکل کی چٹانوں کے درمیان میری کہانیوں کا ایک مخروطی مینار، یعنی میری قلوپطرہ کا مقبرہ بالکل مکمل ہو چکا تھا۔ اب اس میں میری سوچوں کی کافوری شمعیں جلائی جا رہی تھیں۔ میری جواں مرگ حسرتوں کی قندیلیں آویزاں کی جا رہی تھیں۔ میرے سپنے میری محبت کی ملکہ کی آخری آرامگاہ کی آرائش و زیبائش میں مصروف تھے۔ عود و لوبان سلگایا جا رہا تھا۔ عنبر، مروارید، مشک اور صندل کے ڈھیر لگائے

جا رہے تھے۔ اور جب یہ سب کام ایک مختصر سی ساعت میں ہو چکے تو میرے سپنے نجمہ کی لاش کو لے کر چلے۔ جس شان سے فراعنہ مصر کی لاشیں ان کے مقبروں تک پہنچائی جاتی تھیں اسی شان سے نجمہ کی لاش اُس مقبرے تک پہنچائی گئی۔ اسے دفن کر دیا گیا۔ اور پھر ریت کا طوفان اٹھا۔ اور میرے سپنوں کا طلسم اس میں چھپ گیا۔ مگر میرے گیان دھیان کا گوتم ابھی تک میری نظر کے سامنے مولسری کے پیڑ تلے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ جگر۔ شعبدہ باز ــــــ مداری ــــــ مگر اب میں اس کی شعبدہ بازی دیکھنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ قریب ہی کے کسی ڈھارے سے کتوں کے رونے کی مہیب آوازیں آنے لگی تھیں۔ تیز تیز چلتی ہواؤں سے برگد کے پتے کھڑ کھڑا رہے تھے۔ اور یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے بستی کا قوی ہیکل دیو بھوکا ہے۔ وہ اپنے دانت کٹکٹا رہا ہے۔ آتے جاتے اکیلے دُکیلے راہگیروں کو گھور رہا ہے۔

"میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ جان سے مار دوں گا۔"

میں نے اپنے گیان دھیان کے گوتم کی گردن کو زور سے دباتے ہوئے کڑک کر کہا۔

"میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ جان سے مار دوں گا۔"

مگر وہ بالکل نروس نہ ہوا۔ اس کے ہونٹوں پہ الوہی مسکراہٹ تھی اور چہرے پہ سکون و طمانیت۔

"تم مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے آسمانی آواز میں کہا۔

"میں امر ہوں۔ جاوداں ہوں۔ میں مر نہیں سکتا۔ بجمہ بھی نہیں مر سکتی۔ موت تو ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانے کا نام ہے۔ روح ایک چولے کو چھوڑ کر دوسرے چولے میں چلی جاتی ہے۔ موت تو ایک بڑی ہی میٹھی نیند ہے جو تھکی ہاری اس زندگی میں آنی ہی چاہیئے۔ آکر ہی رہتی ہے۔ موت کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ اس سے زندگی اور اس کی بہت سی چیزوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے قالب کو اختیار کرنے سے پہلے بڑی ضروری ہیں۔ بجمہ زندہ ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جب تک اس دھرتی پر مولسری کا ایک پھول بھی کھلتا رہے گا وہ زندہ رہے گی۔ اپنے بچوں میں زندہ رہے گی۔ تمہاری کہانیوں میں زندہ رہے گی۔ تمہارے سپنوں اور سوچوں میں زندہ رہے گی۔ اس عظیم کارنامے میں زندہ رہے گی جس کی خاطر اُس نے جان دی۔ وہ وقت کے بہتے ہوئے سیلاب میں موجود رہے گی۔ ان اندھیروں کو ہمیشہ تو نہیں رہنا ہے۔ اجالا ہوگا ضرور ہوگا۔ سحر جاگے گی ضرور جاگے گی۔ اسے جگانے کے لئے کئی دیئوں کو بجھنا ہی پڑے گا۔ مکتی و نروان ایسے تو نہیں مل جائے گا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ دینا ہوگا۔ بہت کچھ سہنا ہوگا۔ بہت کچھ تمھیں دیکھنا پڑے گا۔ تمھیں

بہت کچھ تیاگنا ہوگا۔ تیاگ ہی میں مکتی ہے۔ اور مکتی تمھیں مل کر ہی رہیگی۔ یہ اندھیرے، یہ طوفان اُسے آنے سے نہیں روک سکتے مکتی کے راستوں کو دھندلا نہیں سکتے۔ مکتی ونروان کا راستہ ہمیشہ سے صاف اور سیدھا ہے۔ ہمیشہ صاف اور سیدھا رہے گا۔ بڑھے چلو۔ بڑھے چلو۔ مکتی و نروان کی منزل عزم و ہمت کے سامنے دور نہیں۔ تمہاری منزل بہت قریب ہے۔ صاف اور سیدھے اس راستے کو نہ چھوڑو۔ زخم پر زخم کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے چلے جاؤ۔ اس راستے کے راہیوں پر پتھر بھی برسائے جاتے ہیں۔ زنجیریں اور طوق بھی پہنائے جاتے ہیں۔ انہیں زندان کی دلیواروں میں محبوس کیا جاتا ہے۔ مصلوب کیا جاتا ہے۔ قدم قدم پہ دار و رسن ہے ان کے لئے۔ مگر مکتی ونروان کے متلاشی متفکر نہیں ہوتے۔ اپنے لٹ جانے کا غم نہیں کرتے۔ رکنا اور الجھنوں پہ سوچنا ان کا کام نہیں۔ مکتی ونروان کے لئے تو وہ اپنا بلیدان بھی دے دیتے ہیں۔ دوسروں کے سکھ چین کے لئے اپنا سکھ چین گنوانا پڑتا ہے۔ مایوس ہو جانا پاپ ہے۔ گناہ ہے۔ مایوس نہ ہو جانا۔ مولسری کے پھولوں کی مہک پھیلے گی۔ ضرور پھیلے گی۔ اس بستی کے ہر انسان کے لہو کی ہر بوند میں رچ جائے گی۔ اس کی مہک سے یہ ماحول بدل جائے گا۔ اس ماحول کا ہر انسان بدل جائے گا۔ وہ زمانہ ضرور آئے گا۔ تمہارے گیان دھیان کی روشنی

گھر گھر میں پھیل جائے گی۔ لہو ٹھو کتے کھانستے پندرہ لاکھ انسانوں کے لئے تم مکتی ونروان حاصل کرو گے۔ ضرور کرو گے۔ نجمہ کی موت نے تمھیں مکتی ونروان کا دیوتا بنا دیا ہے۔ مکتی ونروان کا نور آج میں نے پہلی بار تمہاری پیشانی پر چمکتے دیکھا ہے۔ تمہارے چہرے کے چاروں طرف نور کا ایک ہالہ بنتا جا رہا ہے۔ اس نور نے نجمہ کی محبت سے جنم لیا ہے۔ نجمہ کی زندگی کی جوت بجھتے ہی تمہاری زندگی کی جوت جاگ گئی ہے۔ اس نور سے، اس جوت سے اس بستی کے چاند ستارے جنم لیں گے۔ آج سے نجمہ ان چاند ستاروں میں چمکے گی۔ کیا تم سمجھتے ہو مجھے نجمہ کی موت کا غم نہیں ہے؟ ضرور ہے۔ اور تم سے زیادہ ہے۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ جو کچھ ہونا ہے ہو کر ہی رہے گا۔ اُسے روکا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہونا ہی تھا۔ تمہارا دل بھی غم سے پاش پاش ہو رہا ہے۔ میرا دل بھی غم سے پارہ پارہ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کے سمندر اچھلنے کو بے چین ہو رہے ہیں۔ میں بھی آنکھوں میں ساون کی کالی گھٹائیں چھپائے ہوئے ہوں۔ آؤ دونوں مل کر نجمہ کا سوگ منائیں۔ دونوں مل کر پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے انسانوں کی مکتی ونروان کی پجارن کا ماتم کریں۔ ہم دونوں ابھی تک اس کی لاش پر نہیں روئے۔ آؤ دونوں مل کر آنسوؤں کی گنگا بہا دیں۔ مکتی ونروان کی پجارن پر اس کا پوتر جل چھڑکیں۔"

میرے ہاتھ خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔ میں مولسری کے تنے سے لپٹ گیا۔ اپنے گیان دھیان کے گوتم سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں ڈھائیں مار مار کر رونے لگے۔ ہماری آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ بجلی چمکی۔ ایک دہشت ناک دھماکہ ہوا۔ اور رُکے ہوئے بادل بھی ہمارے ساتھ مل کر رونے لگے۔

# ڈرامے

۱۔ بربط

۲۔ جادو

۳۔ چھ فنکار

یہ ڈرامے ریڈیائی ٹکنیک پر ریڈیو کے لئے لکھے گئے۔
ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئے اور بشکریہ ریڈیو
پاکستان کتابی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

# حرف اوّل

آغا اشرف ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان لاہور کے ڈراما کے شعبے میں بہت شہرت پا چکے ہیں۔ میں اُسی زمانے سے انہیں جانتا اور اُن کے کمال فن کا معترف ہوں۔

ریڈیو ڈراموں میں پارٹ بہت سلیقے سے کرنے کے علاوہ وہ ریڈیو ڈراما لکھنے سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے ایک تجربہ کار اور خوش مذاق ایکٹر کے لکھے ہوئے ڈرامے میں کئی ایسی قابل قدر ٹکنیکی خصوصیات آپ سے آپ راہ پا جاتی ہیں جو ڈراما کے حسن کو دوبالا کرتی اور ایسے لوگوں کو عموماً نہیں سوجھتی ہیں جنہوں نے ڈراما کی پیشکش میں کبھی حصہ نہ لیا ہو۔

مجھے دلی خوشی ہے کہ آغا صاحب اپنے اُن ڈراموں کا جو ریڈیو پر کامیابی سے پیش ہو چکے ہیں، ایک مجموعہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ اُن کے مطالعے سے وہ لوگ تو محفوظ ہوں گے ہی جو اُنھیں ریڈیو پر سن چکے ہیں، کئی ایسے لوگ بھی مستفید ہو سکیں گے جو ریڈیو ڈراما لکھنے کے مشتاق ہیں لیکن کامیاب ڈراموں کے

نمونے سامنے نہ ہونے کے باعث اِس جدید ذریعہ اظہار میں طبع آزمائی کرنے میں تساہل برتتے ہیں۔

مجھے امید ہے یہ ڈرامے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور اپنے ڈراموں کے دوسرے مجموعے چھاپنے میں مصنف کی حوصلہ افزائی کا موجب بنیں گے۔

سید امتیاز علی تاج

۸ر دسمبر ۶۳ء

# بربط

[نوٹ :۔ یہ کھیل کسی زبان کے کسی کھیل کا ترجمہ یا چربہ نہیں ہے۔ اس کی تھیم
گریک مائیتھالوجی سے ماخوذ ہے۔ اور وہ صرف اتنی ہے کہ یونان کے بے مثال
بربط نواز آرفیوسس نے اپنی محبوبہ یورشیا کی محبت میں جہنم کا سفر کیا۔]

## کردار

آرفیوسس ......... سرزمین یونان کا بے مثال بربط نواز

یورشیا .......... ربہ بہار کے ہیکل کی نرتکی

مائیکل .......... ربہ بہار فلورا کے ہیکل کا بڑا راہب

ہرمس .......... گڈریوں کے سردار کا بیٹا

زیئوس ........ یونانی دیومالا میں سب دیوی دیوتاؤں سے بڑا دیوتا۔

اپولو .......... شعر و موسیقی کا دیوتا

پلوطو .......... دیوتائے جہنم

اگرون .......... جہنم کے دو دریاؤں کا ملاح

جہنمی روحیں ...... ہرکارے اور دوسری آوازیں

---

## پہلا منظر

ربہ بہار فلورا کا ہیکل

[مائیکل ربہ بہار فلورا کے بت کے سامنے سر جھکائے مقدس منتر پڑھ رہا ہے۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ عود و عنبر سُلگ رہا ہے۔ ہر طرف پھولوں اور پھلوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فضائیں مختلف سازوں کے الوہی نغموں سے لبریز ہیں۔ دیوی کے آتشکدے سے تیز تیز شعلے اٹھ رہے ہیں۔ جن کی روشنی آرفیوس اور یورشیا کے چہروں پر بھڑک رہی ہے۔ یہ دونوں عروسی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ ان کی گردنیں دیوی کے حضور میں جھکی ہوئی ہیں۔]

**مائیکل**:۔ (خطیبانہ آواز میں) ربہ بہار۔ مقدس فلورا۔ تیرے ہیکل کا راہب۔ تیرا ایک ناچیز پجاری۔ مائیکل۔ بڑے عجز و انکسار کے ساتھ تیرے حضور میں سرنگوں ہے۔ اور التجا کرتا ہے کہ اس جوڑے پر اپنی رحمت و برکت نازل کر۔ ان کی زندگی کے دامن کو میٹھی مرادوں اور خوشیوں سے بھر دے معزز دیوی۔ تیرے ہیکل کی نرتکی۔ تیری ایک حقیر پجارن۔ یورشیا۔ میری بیٹی۔ سوئمبر رچا کر اپنے رفیق حیات کا انتخاب کر چکی ہے۔ بے شمار امیدواروں کے ہجوم میں اس کی نظر انتخاب صرف آرفیوس پر پڑی ہے۔ آرفیوس۔ سرزمین یونان

کا بے مثال بربط نواز۔ لازوال مغنی۔ تیرے ہیکل کا زندہ جاوید موسیقار جس کے بربط کی آواز کے اثر سے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ بہتے ہوئے دریا تھم جاتے ہیں۔ پرندوں میں طاقت پرواز نہیں رہتی۔ اپنی بیوی یوریشیا کا ہاتھ تھامے تیرے حضور میں سر بسجود ہے۔ یہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی قسم کھاتے ہیں ———

مقدس دیوی — میں ان کا بزرگ اور تیرے ہیکل کا راہب تیرے حضور میں ان کی خوشحالی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ مقدس دیوی۔ ہم تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تیری پجارن پنڈورا کا مقدس لہو اور یہ پھول تیری مورتی پر نچھاور کرتے ہیں۔

[سازوں پر طربیہ]

[ربہ بہار کے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے آرفیوس اور یوریشیا جھک جاتے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم ادب اور قاعدے سے آہستہ آہستہ منتشر ہوتا ہے۔]

# دوسرا منظر

## ہیکل کا پائیں باغ

[آرفیوسس اور یورشیا یاسمینی کنج میں ایک مرمری حوض کے
کنارے محو راز و نیاز ہیں۔]

آرفیوسس :۔ ایسا رقص میں نے آجتک نہ دیکھا تھا یورشیا۔ مقدس فلورا کے
جشن سالگرہ میں تم نے اپنے فن و کمال کی انتہا کر دی تھی۔ میرے بربط کے
سب تار سلگ اٹھے تھے۔ اچھوتے نغمے خود بخود سامنے آنے لگے تھے۔
اس دن میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

یورشیا :۔ تم موسیقی کے دیوتا ہو آرفیڈس۔ میں تمہارے ساز کی آواز کا سہارا
لے کر ناچ رہی تھی۔ تمہارے بربط کی آواز مجھے نئے نئے نرت بھاؤ بتا رہی
تھی۔ نئے نئے انداز سکھا رہی تھی۔ ورنہ افسانہ **الفت کا مضمون** بڑا
مشکل تھا۔

آرفیوسس :۔ میں بہت حیران ہو رہا تھا کہ اتنا مشکل مضمون تم نے کیوں چھیڑ دیا۔

یورشیا :۔ نہ جانے کس ترنگ میں۔ نہ جانے کس اُمنگ میں۔ میرے قدم الجھے
الجھے راستوں پر چلنے لگے۔ سنبھلنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تم اگر مجھے سہارا
نہ دیتے تو بھری محفل میں میرا بھرم کھل جاتا۔

آرفیوسس :۔ (ہنستے ہوئے) لوگ تمھیں عطائی کہتے۔

یورشیا :۔ اور گیا۔ بڑی کٹھن منزل تھی۔ میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں گرنے کو تھی لیکن تمہارے ساز کی آواز نے مجھے سنبھال لیا۔ اس سے پہلے میں نے تمھیں کبھی نہ دیکھا تھا۔

آرفیوسس :۔ اور میں نے بھی تمھیں کبھی نہ دیکھا تھا۔

یورشیا :۔ تم نے یہ ساز بجانا کس سے سیکھا تھا؟

آرفیوسس :۔ یہ ایک بڑی عجیب وغریب داستان ہے۔

یورشیا :۔ میں اس داستان کو سننا چاہتی ہوں۔

آرفیوسس :۔ اچھا تو سنو۔ میرا باپ ایراس ایک بے نظیر بت تراش تھا۔ میڈیا فن بت گری میں اس کا ایک لازوال شاہکار ہے۔

یورشیا :۔ میڈیا کون؟

آرفیوسس :۔ وہ تھسلی کی ایک بڑی حسین عورت تھی۔ بڑی خودسر و مغرور۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا۔ مرد کی ذات سے اسے بڑی نفرت تھی۔

یورشیا :۔ عجیب عورت تھی۔

آرفیوسس :۔ واقعی وہ بڑی عجیب عورت تھی۔ اس کا غرور اتنا بڑھا۔ اتنا بڑھا کہ اس نے دیوتاؤں کا بھی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اور دیوتا اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ اُس پہ عذاب نازل ہوا۔

یورشیا :۔ کیسا عذاب؟

آرفیوسس :۔ وہ ایک دن جھیل کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ اچانک اسے بڑی پیاس لگی۔ جھک کر جھیل سے پانی پینے لگی تو اپنا عکس دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگئی۔

یورشیا :۔ پھر کیا ہوا ؟
آرفیوسس :۔ اس کی فریفتگی اتنی بڑھی۔ اتنی بڑھی کہ اپنا عکس دیکھتے دیکھتے اُسے کئی دن گزر گئے۔ وہ کھانا پینا بھی بھول گئی۔ اور اسی حالت میں جھیل کے کنارے مر گئی۔
یورشیا :۔ بزرگ ایراسس نے اپنے شاہکار میں اس کے چہرے پر غرور کو اجاگر کیا یا محویت کو ؟
آرفیوسس :۔ دونوں چیزوں کو۔ غرور اور محویت کے ملے جُلے اثرات کو۔ اور یہ امتزاج ہی اس شاہکار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس بت کو فن بت گری کا ایک معجزہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس میں ایک اور بھی خوبی ہے۔
یورشیا :۔ اور کیا خوبی ہے ؟
آرفیوسس :۔ اس بت میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ ہوا کے جھونکے ان میں گزرتے ہیں تو بڑی سریلی آوازیں نکلتی ہیں۔
یورشیا :۔ ان سوراخوں میں کیا ہے ؟ ان سے ایسی آوازیں کیوں نکلتی ہیں ؟
آرفیوسس :۔ یہ ایک بھید ہے۔ جسے اُس بت کے بنانے والے کے سوا کوئی بھی نہ پا سکا۔ صرف سات سوراخ۔ سات مختلف آوازیں۔ میں بہار کی ایک مہکی مہکی شام کو میڈیا کے بت کے پاس بیٹھا ایک شعر گنگنا رہا تھا۔ تو ایکا ایکی بت کے سوراخ بھی گنگنانے لگے۔ اور اس گنگناہٹ کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں بہت سی تصویریں ابھرنے لگیں۔ سادہ اور

رنگین تصویریں۔ اور پھر وہ سب مل کر صرف ایک تصویر بن گئیں۔ صرف ایک تصویر۔ ایک نقش۔ ایک ساز۔

یوریشیا :۔ ابتدا میں ہر فنکار کے ذہن میں ایسی ہی تصویریں کھچا کرتی ہیں۔

آرفیوسس :۔ یہ میرے شوق کا وہ دور تھا کہ میں نے ہر ساز کو بجا کر دیکھا۔ اور اُسے نامکمل پایا۔ ہر ساز میرے شوق کے مقابلے میں ادھورا نکلا۔ اگر کوئی ساز مجھے مکمل نظر آیا تو بس وہی ایک ساز تھا۔ جس کا نقش میرے ذہن میں موجود تھا۔

یوریشیا :۔ اس زمانے میں تمہاری راتیں — تمہارے دن عجیب الجھن میں گزرتے ہوں گے۔

آرفیوسس :۔ واقعی عجیب الجھن تھی۔ جو اچانک ایک دن خود بخود سلجھ گئی۔

یوریشیا :۔ وہ کیسے ؟

آرفیوسس :۔ میں سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں آسمان سے سات ستارے ٹوٹے اور سمندر کے کنارے تنہا کھڑے ہوئے صنوبر کے درخت پر گر پڑے۔ درخت میں آگ لگ گئی۔ آندھی چلنے لگی۔

یوریشیا :۔ میں آندھی سے بہت ڈرتی ہوں۔

آرفیوسس :۔ اس طوفان میں ایک اور طوفان بھی اٹھ رہا تھا۔ سویا ہوا سمندر بھی جاگ اٹھا تھا۔ بڑی بڑی لہروں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو آندھی تھم چکی تھی۔ درخت وہاں موجود نہ تھا۔ سمندر گرج رہا تھا۔ لیکن اس کی لہروں میں وہ پہلا سا زور نہ تھا۔ چاند کی روشنی میں ریت پر

میں نے کوئی چیز چمکتی دیکھی۔

یورشیا :۔ وہ کیا چیز تھی ؟

آرفیوسس :۔ یہ بربط ۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ ایک چٹان پر بیٹھ کر اسے بجانے لگا۔ لہریں سمٹتی چلی گئیں۔ ریت اور جھاگ میں پڑے ہوئے سیپ کھلنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس ساز کی آواز میرے کانوں کے لئے اجنبی نہیں۔ میں نے سارا بھید پا لیا، اور چل نکلا۔ ٹرائے میں ایک ہولناک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ اس ساز نے اُس جنگ میں بڑے معجزے دکھائے۔

یورشیا :۔ کیا معجزے دکھائے ؟

آرفیوسس :۔ اگر میرے بربط کی آواز میدان جنگ میں نہ گونجتی تو سپارٹا والے شکست کھا جاتے۔ ہرکولیس اور یولیسس ایسے بہادروں کا نام دنیا میں مشہور نہ ہوتا۔ اس کی آواز نے اِن کو ایسی چٹان بنا دیا جس پر دشمن کے ہتھیار کارگر نہ ہوتے تھے۔ تیروں اور نیزوں کی بارش میں بھی وہ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔

یورشیا :۔ کیا تم نے ہیلن کو دیکھا ہے ؟

آرفیوسس :۔ دیکھا ہے۔ اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔

یورشیا :۔ کہتے ہیں وہ دنیا کی سب سے حسین عورت ہے۔

آرفیوسس :۔ اس کا جواب دیتے ہوئے میں کچھ حجاب سا محسوس کرتا ہوں۔

یورشیا :۔ پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔
آرفیوسس :۔ ہیلن تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ وہ اگر زمین کا شاہکار ہے
تو تم چاند کا شاہکار ہو۔
یورشیا :۔ کتنی سہانی شام ہے۔ کتنی پیاری ہوا چل رہی ہے۔ میرا پیارا ہرن
بروکس بھی مست ہو رہا ہے۔ اب یہ ناچے گا۔ بروکس ناچو گے؟ میں زنجیر
اتار دوں؟ یہ لو اُتار دی۔ ناچو۔ بروکس ناچو۔
آرفیوسس :۔ آؤ اُس جھیل پر چلیں۔ اس وادی کا آئینہ ہے
یہ جھیل۔
یورشیا :۔ اس کی نیلی نیلی گہرائیوں میں تھرکتے ہوئے صنوبر کے سائے تو
بڑے ہی دلفریب ہیں۔

(وقفہ)

یورشیا :۔ (کچھ فاصلے سے) آرفیوسس۔ آرفیوسس۔
آرفیوسس :۔ یورشیا۔
یورشیا :۔ ان جھاڑیوں میں کچھ ہے۔ کچھ ہے۔ جس سے ڈر کر بروکس
بھاگ نکلا ہے۔
آرفیوسس :۔ کدھر بھاگا ہے؟
یورشیا :۔ وہ دیکھو چوکڑیاں بھر رہا ہے۔
آرفیوسس :۔ میں اُسے پکڑ کر لاتا ہوں۔
[آرفیوسس ہرن کے پیچھے بھاگتا ہے]

[وقفہ]

[ہرمس ایک جھاڑی سے نمودار ہوتا ہے]

ہرمس :۔ (سرگوشی میں) یورشیا۔

یورشیا :۔ کون ؟

ہرمس :۔ جس کی محبت کو کھلونا سمجھ کر تم نے توڑ دیا۔ سوئمبر میں آرفیوسس کو اپنا شوہر منتخب کر کے جس کے دل پر تم نے کبھی نہ اچھا ہونے والا زخم لگایا۔

یورشیا :۔ (گھبراہٹ میں) ہرمس ۔ ہرمس۔

ہرمس :۔ ہرمس نہیں اب مجھے میری مرحوم محبت کا مزار کہو۔ زندگی کی اجڑی ہوئی بہار کہو۔ تم نے مجھے برباد کر دیا۔ تم میری جواں مرگ محبت کی قاتلہ ہو۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے تم میں۔ اب بھی میرا دل تم پر مٹا جاتا ہے۔ میں تمھیں اب بھی بڑا پیار کرتا ہوں۔

یورشیا :۔ دور ہو شیطان ۔ میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کرو۔

ہرمس :۔ (ہلکا سا قہقہہ مارتے ہوئے) محبت کا جواب نفرت سے نہیں دیا کرتے ۔ مانا کہ تم بڑی حسین ہو مگر میرا پیار بھی کوئی چیز ہے۔ چھوڑو اس مفلس بھانڈ کو جس کے پاس بربط کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے ساتھ تم سموطرس کے سبزہ زاروں میں چلو۔ تم جانتی ہو میں گڈریوں کے سردار کا بیٹا ہوں گڈریئے میرے باپ کو اپنا بے تاج بادشاہ سمجھتے ہیں۔ تم ان کی شہزادی کہلاؤ گی۔ گھوڑا تیار کھڑا ہے۔

یورشیا :۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ نفرت ہے۔ چلے جاؤ۔ دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے۔ میں تمہاری منحوس صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم بڑے ذلیل ہو۔

ہرمس :۔ کیا کہا میں ذلیل ہوں ؟

یورشیا :۔ ہاں۔ یہی کہا ہے میں نے۔

ہرمس :۔ (دانت پیستے ہوئے) اچھا تو آج میں تمھیں ایسا ذلیل کر کے جاؤں گا کہ کسی کو منہ نہ دکھا سکو گی۔ میرے اندر چھپا ہوا بھوت بھڑک اٹھا ہے۔ دیکھنا اب یہ کتنا کہرام مچاتا ہے۔

یورشیا :۔ (گھبراہٹ میں) آرفیوسس ۔ آرفیوسس ۔ آرفیوسس ۔

ہرمس :۔ بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ میں تم سے تیز بھاگ سکتا ہوں۔ باز اور چڑیا کا کیا مقابلہ ۔ ہاہاہا۔

[وحشیانہ قہقہہ مارتا ہے]

[یورشیا ڈر کر ایک طرف بھاگتی ہے۔ لیکن تھوڑی دور جاکر ایک دلدوز چیخ مار کر زمین پر گر جاتی ہے۔ ہرمس جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگاتا ہے۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ آرفیوسس آتا ہے۔]

آرفیوسس :۔ (بے چین سانس لیتے ہوئے) یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری محبت۔ میری زندگی۔ میری یورشیا زمین پر تڑپ رہی ہے۔ سسک رہی ہے۔

یورشیا — یورشیا — تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

یورشیا :۔ (اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے) مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔

آرفیوسس :۔ کہاں؟

یورشیا :۔ یہاں پنڈلی پر۔

آرفیوسس :۔ کہاں ہے؟ کدھر ہے سانپ؟

یورشیا :۔ کس سانپ کا پوچھتے ہو؟

آرفیوسس :۔ جس نے تمھیں کاٹا ہے۔

یورشیا :۔ ایک تو اپنے بل میں گھس گیا ہے۔ اور دوسرا اپنے گھوڑے پہ سوار ہو کر فرار ہو گیا ہے۔

آرفیوسس :۔ دوسرا کون؟

یورشیا :۔ ہرمس۔ نابکار ہرمس۔ وہ مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ میں ڈر کر بھاگی۔ گھاس میں سانپ چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے ڈس لیا۔ جلدی سے مجھے گھر لے چلو۔ زہر میرے جسم میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔

[آرفیوسس یورشیا کو اٹھا کر لے جاتا ہے]

## تیسرا منظر

[آرفیوسس کی خواب گاہ]

آرفیوسس :۔ (روتے ہوئے) مر گئی۔ یورشیا مر گئی۔ میری محبت مر گئی۔

اب مجھے بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ زندگی اس کے بغیر ایک رستا ہوا ناسور ہے جو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس خنجر سے مجھے اپنا خاتمہ کرلینا چاہئے۔

[ خنجر اٹھاتا ہے ]

[ مائیکل آتا ہے ]

مائیکل :۔ ٹھہرو۔

آرفیوسس :۔ کون ۔ معزز مائیکل ۔

مائیکل :۔ خودکشی نہ کرو آرفیوسس ۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے ۔

آرفیوسس :۔ میں اپنے ارادے کو بدل نہیں سکتا ۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے میں اس کی محبت میں مرجاؤں گا ۔ آپ مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے ۔

مائیکل :۔ اگر تم مرنا چاہتے ہو تو ایک بہت بڑا کام کرتے ہوئے مرجاؤ۔ اگر کامیاب ہو گئے تو موت کو بھی جیت لو گے ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم یوریشیا کو موت سے چھین کر دوبارہ اس زندگی میں لے آؤ۔

آرفیوسس :۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو میں وہ کام کرنے کو تیار ہوں ۔

مائیکل :۔ مگر وہ بڑا مشکل کام ہے ۔

آرفیوسس :۔ محبت ہر مشکل پر مسکرایا کرتی ہے ۔

مائیکل :۔ اتنا حوصلہ ۔

آرفیوسس :۔ آپ میرے حوصلے کا اندازہ نہیں کر سکتے ۔

مائیکل :۔ دل کو مضبوط کر لو۔

آرفیوسس :۔ فولاد سے زیادہ مضبوط ہے۔
مائیکل :۔ تو جاؤ پھر کوہ الپس کو تسخیر کرو۔
آرفیوسس :۔ میں تسخیر کروں گا۔ ضرور تسخیر کروں گا۔
مائیکل :۔ پھر اُس سے آگے نکل کر تمھیں زیتوس دیوتا کے دربار میں جانا ہوگا۔
آرفیوسس :۔ وہاں جاکر مجھے کیا کرنا ہے؟
مائیکل :۔ مقدس دیوتا موسیقی کا دلدادہ ہے۔ انسانوں کے دلوں کو جیتنے کے بعد اب تمھیں دیوتاؤں کے دلوں کو بھی اپنے بربط کی آواز سے جیتنا ہے۔
آرفیوسس :۔ میں جیتوں گا۔ ضرور جیتوں۔
مائیکل :۔ تو پھر تم یقیناً یوریشیا کو موت کی دنیا سے نکال لاؤ گے۔
آرفیوسس :۔ وہ کیسے؟
مائیکل :۔ دیوتا جب تمہاری موسیقی سے مسحور ہو جائے تو اس سے یوریشیا کے لئے نئی زندگی طلب کرنا۔
آرفیوسس :۔ مجھے اپنے بربط پر پورا بھروسہ ہے۔ میں دیوتا کو اپنی موسیقی سے مسحور کردوں گا۔
مائیکل :۔ پھر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ جاؤ دیوتا کوہ اولمپس پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔
آرفیوسس :۔ میں جا رہا ہوں۔ الوداع۔ معزز مائیکل الوداع۔

[جاتا ہے]

## چوتھا منظر

[وادیٔ ڈورس کا ایک بارونق بازار]

ایک شخص :- کتنی دردناک آواز ہے۔

دوسرا شخص :- کوئی بین کر رہا ہے۔

تیسرا شخص :- یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟

پہلا شخص :- وہ دیکھو آرفیوسس بربط بجاتا آرہا ہے۔ یہ اس کے ساز کی آواز ہے۔

دوسرا شخص :- آرفیوسس۔

پہلا شخص :- ہاں وہی۔ غور سے دیکھو۔ اچھی طرح پہچانو۔

دوسرا شخص :- وہی ہے۔ وہی ہے۔ ننگے پاؤں ننگے سر۔ بال بکھرے ہوئے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔ لباس تار تار ہو رہا ہے۔ اپنے ساز کی آواز کے ساتھ ساتھ رو رہا ہے۔

پہلا شخص :- یوریشیا کی موت نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اک افسانہ بنا دیا ہے۔

تیسرا شخص :- آؤ اس کی دلجوئی کریں۔ اشک شوئی کریں۔ اتنے بڑے فنکار کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ بیچارا بالکل برباد ہو گیا ہے۔

پہلا شخص :- اس کی بربادی کا باعث ہرمس ہے۔ گڈریوں کے سردار کا بیٹا۔

جو کالی مٹریا کے ویرانوں میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ یوریشیا پر مجرمانہ حملہ کرنے کے جرم میں عدالت نے اُسے پندرہ سال کے لئے جلا وطن کر دیا ہے۔

دوسرا شخص :۔ آواز دو۔ آرفیوسس کو آواز دو۔ اب وہ بہت قریب آگیا ہے۔

پہلا شخص :۔ آرفیوسس۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :۔ مجھے کس نے پکارا ہے؟

پہلا شخص :۔ رک جاؤ۔ ذرا رک جاؤ۔

آرفیوسس :۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

پہلا شخص :۔ ایک بات بتاتے جاؤ۔

آرفیوسس :۔ اب مجھے کوئی بات یاد نہیں۔

دوسرا شخص :۔ کدھر جا رہے ہو؟

آرفیوسس :۔ کوہ المپس کو تسخیر کرنے۔

دوسرا شخص :۔ وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔

آرفیوسس :۔ میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔

دوسرا شخص :۔ (قہقہہ مارتے ہوئے) پاگل ہو گیا۔ آرفیوسس پاگل ہو گیا۔ وہاں جانا چاہتا ہے جہاں کوئی نہیں جا سکتا۔

[قہقہہ مارتا ہے]

پہلا شخص :۔ تقدیر کے ماروں پہ ہنسا نہیں کرتے۔ آدمیت سے کام لو۔

دوسرا شخص :- میں ہنسا کرتا ہوں۔ خوب ہنسا کرتا ہوں۔ ایسے انسانوں پر۔ ایسی باتوں پر:- میں خوب ہنسا کرتا ہوں۔

[ہنستا ہے]

[آرفیوسس اپنی دُھن میں مگن ربط بجاتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔]

## پانچواں منظر

[کوہ المپس کی دشوار گذار برفانی بلندیاں]

[چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکنے کی آوازیں]

آرفیوسس :- میں دھرتی سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ میں چاند تاروں کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ گلیشروں کے طویل سلسلے اوپر ہی اوپر اٹھتے جا رہے ہیں۔ ہوا کس قدر ٹھنڈی ہے۔ اچھا تو ہوا کرے۔ اب میں سردی گرمی کے احساس سے بھی بہت آگے نکل آیا ہوں۔ مجھے اپنی منزل صاف صاف اور بہت قریب نظر آ رہی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے جہاں آج تک کوئی انسان نہیں پہنچا۔ میرا عزم کوہ المپس سے زیادہ بلند ہے۔

[پتھر لڑھکنے کی آوازیں]

آرفیوسس :- یہ کیا ہے؟ اندھیرے کی یہ دیوار سی کیا ہے جو اوپر سے نیچے بھاگتی چلی آ رہی ہے۔ بڑی تیز رفتار ہے اس کی۔ یہ دبی دبی گونج سی کیوں

سنائی دینے لگی ہے؟ برفانی آندھی آرہی ہے۔ برفانی آندھی آرہی ہے۔
برف کا طوفان۔ تودے ریزہ ریزہ ہوکر اڑنے لگے ہیں۔ مجھے کہیں چھپ
جانا چاہیئے۔

[برفانی آندھی کا شور]

[کوہستانی بلندیوں سے لڑھک لڑھک کر گرتے
ہوئے پتھروں کے ہولناک دھماکے]

آرفیوسس :- یہ کیسا عجیب غار ہے۔ اس میں چھپ جاؤں تو اچھا ہے۔
اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کتنی عجیب گرماہٹ ہے یہاں۔ دل
چاہتا ہے لیٹ جاؤں اور سو جاؤں۔ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد اب میری
ٹانگیں بھی میرا ساتھ نہیں دے رہیں۔

[جمائی لیتا ہے]

[آندھی کا ہلکا ہلکا شور اور لڑھکتے ہوئے پتھروں
کے دھماکے بدستور سنائی دے رہے ہیں۔ آرفیوسس
سو جاتا ہے۔ لمبے لمبے اونچے اونچے خراٹے ملتا
ہے۔ اور ایک بڑا ہی سہانا خواب دیکھنے لگتا ہے۔
جیسے وہ زیوس دیوتا کے دربار میں پہنچ گیا ہے۔
دیوتا اپنے تخت پر براجمان ہے۔ اس کے تخت
کے دو رویہ اور کئی تخت بچھے ہیں۔ جن پر یونانی
دیومالا کے دیوی دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں۔ دربار میں

سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اور پھر ایکا ایکی ناقوس کی
آواز دربار میں گونجتی ہے۔

ہرکارہ :۔ (بآواز بلند) خداوند۔ ایک اجنبی انسان محل کے دروازے کے
قریب مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔ اجازت ہو تو
اُسے پیش کیا جائے۔

زیئوس :۔ اجازت ہے۔

ہرکارہ :۔ نگاہ ادب روبرو۔ آداب بجالاؤ۔ دیوتاؤں کے دیوتا کو سجدہ
کرو۔ خدائے زیئوس کے حضور میں کورنش کرو۔

آرفیوسس (گڑگڑاکر) ذی مرتبت دیوتا۔ مقدس زیئوس۔

زیئوس :۔ تم کون ہو؟

آرفیوسس :۔ ایک بدنصیب کلاکار۔

زیئوس :۔ تمہارا نام؟

آرفیوسس :۔ آرفیوسس ہے میرا نام۔

زیئوس :۔ کہاں سے آئے ہو؟

آرفیوسس :۔ میں وادی ڈورس سے آرہا ہوں۔

زیئوس :۔ جہاں ہم ہیں وہاں انسان نہیں آسکتے۔ یہ ہمارا مسکن ہے۔
جہاں تمام دیوی دیوتا ہمارے دربار میں حاضر ہونے کے لئے ترستا یا کرتے
ہیں۔ تمھیں کون یہاں لایا ہے؟

آرفیوسس :۔ میرا عزم۔ میرا فن۔

زیئوس :- کیا مطلب ؟

آرفیوسس :- میں دیوتاؤں کے دیوتا کو اپنی درد بھری داستان سنانے آیا ہوں۔ اجازت چاہتا ہوں۔

زیئوس :- اجازت ہے۔

آرفیوسس :- میری داستان میرا بربط اپنی زبان میں بیان کرے گا۔

زیئوس :- ہم بڑے غور سے سنیں گے۔ اس سنگھاسن پر بیٹھ جاؤ۔ اور بڑے اطمینان سے اپنی داستان بیان کرو۔ اپولو دیوتا۔

اپولو :- خداوند۔

زیئوس :- کلاکار کو نکٹار کا ایک جام دو۔

اپولو :- جو حکم۔ خوش نصیب انسان نکٹار دیوتاؤں کی شراب ہے۔ تم پہلے انسان ہو جسے یہ پینے کو دی جا رہی ہے۔

آرفیوسس :- اس عزت افزائی کا شکریہ۔

زیئوس :- شروع کرو۔ کلاکار اپنی داستان شروع کرو۔

[ آرفیوسس بربط بجاتا ہے۔ چند ہی لمحوں میں اس کے بربط کی آواز تمام دیوی دیوتاؤں کو مسحور کر لیتی ہے۔ اور زیئوس دیوتا کی گرجدار آواز گونجتی ہے ۔ ]

زیئوس :- ہو!! کتنی پر درد داستان ہے۔ اپولو۔

اپولو :- خداوند۔

زیئوس :- ہماری پلکوں پر تھرکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند کے قرابے میں

محفوظ کر لو۔ تاکہ جب کبھی اس کلاکار کی یہ داستان محبت لکھی جائے تو اس میں یہ بھی نمایاں طور پر لکھا جائے کہ اس کے بربط کے ساتھ ساتھ کوہ اولمپس کے دیوتا بھی روئے تھے۔

اپولو :۔ خداوند یہ کلاکار تو کوئی بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے جس نے اپنے جادو سے دیوتاؤں کو بھی مسحور کر لیا ہے۔

زیوس :۔ محبت زمین و آسمان کا سب سے بڑا جادو ہے۔ اس سے تو دیوتا بھی ڈرتے ہیں۔

اپولو :۔ خداوند بجا فرماتے ہیں۔

زیوس :۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :۔ معزز دیوتا۔

زیوس :۔ موسیقی ہماری زبان ہے۔ جو بات ہماری زبان میں کی جاتی ہے ہم اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم نے بڑے پسندیدہ انداز میں اپنی داستان کو بیان کیا ہے۔ تمہارے جادو سے بہتے ہوئے دریا رک گئے ہیں۔ کوہ اولمپس کی چوٹیاں پگھل کر موم ہو گئی ہیں۔ اڑتے ہوئے پرند مست ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

آرفیوسس :۔ اس داستان کا آخری باب ابھی باقی ہے معزز دیوتا۔

زیوس :۔ ہم اُسے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساز کی آواز ہمارے دربار میں آگ لگا دے۔

آرفیوسس :۔ تو پھر میری داستان ادھوری رہ جائے گی معزز دیوتا۔

زیٹوس :۔ تمہاری ہر چیز مکمل ہو چکی ہے آرفیوس۔ محبت معراج کا دوسرا نام ہے۔ دیوی دیوتا بھی محبت کرتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں سے۔ فانی انسانوں سے۔ مگر یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ دیوی دیوتا آج تک محبت میں وہ معجزے نہیں دکھا سکے جو کہ انسانوں نے دکھائے ہیں۔ تمہارا بربط بھی محبت ہی کا ایک معجزہ ہے۔ اپولو۔

اپولو :۔ خداوند۔

زیٹوس :۔ تم نے بھی میڈیا سے محبت کی تھی۔

اپولو :۔ خداوند۔

زیٹوس :۔ اس کی محبت میں تم نے بے شمار شعر کہے۔ بے شمار گیتوں کو جنم دیا۔ تم نے اپنے ہر سانس کو اس کی محبت میں سنگیت بنا لیا۔

اپولو :۔ میں میڈیا کی محبت میں بالکل دیوانہ ہو گیا تھا خداوند۔

زیٹوس :۔ اور آرفیوس بھی محبت میں دیوانہ ہو چکا ہے۔

اپولو :۔ خداوند۔

زیٹوس :۔ کیا تم نے بھی محبت میں کبھی کوئی معجزہ دکھایا ہے؟ تمہارا کوئی شعر۔ کوئی گیت۔ کوئی نغمہ جسے تمہارا معجزہ کہا جا سکے؟

اپولو :۔ میڈیا کی محبت نے مجھے اتنا بیخود بنا دیا کہ میں اپنا کوئی شاہکار نہ پیش کر سکا۔ جو اُس افسانہ محبت کا عنوان ہوتا۔

زیٹوس :۔ آرفیڈس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

اپولو :۔ سنگیت اور شعر و سخن کا دیوتا ہے آرفیوس۔

زیئوس :۔ مگر یہ مرتبہ تو ہم نے تمھیں عطا کیا تھا؟

اپولو :۔ افسوس، محبت میں تساہل سے کام لیتے ہوئے میں نے وہ مرتبہ کھو دیا اور آرفیوسس نے اُسے پالیا۔

زیئوس :۔ جانتے ہو یہ بربط کیا ہے؟

اپولو :۔ وہ سات ستارے جو کبھی خداوند کے تاج سے ٹوٹ کر سمندر کے کنارے گرے تھے۔ میں آرفیوسس سے التجا کروں گا کہ وہ اپنا بربط مجھے دے دے۔

زیئوس :۔ (کسی قدر تند لہجہ میں) ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اولمپس کے دیوتاؤں کی توہین نہ کرو اپالو۔ دیوتا انسانوں کو دان دیا کرتے ہیں ان سے کچھ لیا نہیں کرتے۔

اپولو :۔ تو پھر مجھے اس فنکار کی شایان شان کوئی تحفہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں اس کی گیتوں بھری کہانی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کہانی کو گیت مالا کہوں گا۔

زیئوس :۔ آرفیوسس تمہارا نہیں ہمارا مہمان ہے۔ ہمارے پاس آیا ہے۔ ہم خود اپنے مہمان کی عزت افزائی کریں گے۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :۔ معزز دیوتا۔

زیئوس :۔ ہمارے قریب آؤ۔ اور قریب۔ اور قریب۔ دل میں احساس کمتری پیدا نہ کرو۔ محبت تمھیں اُس مقام پہ لے آئی ہے جہاں ہماری ذات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہماری ذات صرف جوش و جلال

ہی نہیں جمال بھی ہے۔ مانگو کیا مانگو گے؟

آرفیوسس :۔ معزز دیوتا میں اپنی بیوی یورشیا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

زیئوسس :۔ یورشیا۔ فلورا دیوی کے ہیکل کی رقاصہ۔ مائیکل کی بیٹی۔

آرفیوسس :۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟

زیئوسس :۔ ہاڈس میں۔

آرفیوسس :۔ ہاڈس کونسی جگہ ہے اور کہاں ہے؟

زیئوسس :۔ ہاڈس وہ جگہ ہے جہاں ہم خطاکاروں کو ان کی خطاؤں کی سزا دیتے ہیں۔ جہاں گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔

آرفیوسس :۔ مگر وہ تو بڑی پاکیزہ عورت تھی۔

زیئوسس :۔ بیشک وہ پاکیزہ عورت تھی۔

آرفیوسس :۔ پھر اُسے یہ سزا کیوں دی گئی؟

زیئوسس :۔ اُس نے ہماری محبت کا مذاق اڑایا تھا۔

آرفیوسس :۔ میں دیوتا کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

زیئوسس :۔ یورشیا نے اپنی خوبصورتی کے گھمنڈ میں حسن کی دیوی وینس کا مذاق اڑایا تھا۔ وینس نے ہم سے شکایت کی۔ ہم وینس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہمیں غصہ آگیا۔ ہم نے یورشیا کو موت کے بعد پانچ سال تک ہاڈس میں کوڑے کھانے کی سزا دی۔

آرفیوسس :۔ یہ آپ نے بڑا ظلم کیا۔

زیئوس :۔ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے ۔ انسان خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

آرفیوسس :۔ لیکن میری آرزو کا اب کیا ہو گا؟

زیئوس :۔ گھبراؤ نہیں ۔ تمہاری آرزو کو پورا کیا جائے گا۔ تم پہلے انسان ہو جس نے محبت اور موسیقی کا سہارا لے کر کوہ اولمپس کو عبور کیا ہے ہمیں مسحور کیا ہے ۔ تم چاہو تو ہم تمھیں اپنے دربار کا رتن بنا لیں ۔ کیا تم ہمارے ساتھ اس نور میں رہنا پسند نہ کرو گے ۔ ؟

آرفیوسس :۔ نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ مجھے وہاں جانا ہے جہاں میری محبت ہے ۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے یورشیا کے پاس پہنچا دیجئے ۔

زیئوس :۔ اتنی بیقراری ۔

آرفیوسس :۔ یورشیا کے لئے میری بیقراری ایک ایسا بے پایاں سمندر ہے ۔ جس میں کوہ اولمپس سے بھی اونچے جوار بھاٹے اٹھتے رہتے ہیں۔

زیئوس :۔ یورشیا تک پہنچنے سے پہلے تمھیں کرہ ظلمت میں بڑا لمبا سفر کرنا ہو گا ۔

آرفیوسس :۔ میں تیار ہوں ۔

زیئوس :۔ تو پھر تم یقیناً اس سے ملاقات کر سکو گے ۔ ہمارے خاص ہرکارے تمہارے متعلق ہمارا پیغام ہاڈس کے دیوتا پلوطو تک پہنچا دیں گے ۔ اپولو ۔

اپولو :۔ خداوند ۔

زیئوس :۔ ہرکاروں کو حکم دو وہ آرفیوسس کو کرۂ ظلمت میں اتار آئیں

اپولو :۔ جو حکم ۔

ہرکارے آرفیوسس کو لے کر جاتے ہیں

# چھٹا منظر

## کرۂ ظلمت

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہوائیں
تیز تیز چل رہی ہیں اور سانپ کی طرح پھنکار رہی ہیں

آرفیوسس :۔ کتنا گہرا اندھیرا ہے یہاں۔ ہوائیں پھنکار رہی ہیں۔ دور کہیں دور
دھیما دھیما شور سنائی دے رہا ہے۔ مجھے اسی سمت چلنا چاہئے۔

وقفہ

آرفیوسس :۔ اندھیرا پھیکا پڑتا جا رہا ہے۔ وہ سامنے چاندی کی ایک لکیر
سی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ بل کھاتی ہوئی ایک لمبی سی لکیر۔
یہ دریا ہے۔ اور اس کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔ جس کے
کنارے پر ٹنڈ منڈ درخت بھوت بنے کھڑے ہیں۔ اور ان کے زمین
پر بکھرے ہوئے زرد پتوں کے ڈھیروں میں روحیں سسک رہی ہیں۔
مجھے ان کے قریب چلنا چاہیئے۔

وقفہ

آرفیوسس :۔ (ایک روح کے قریب آتے ہوئے) یہ کونسی جگہ ہے؟
روح :۔ (بے اعتنائی سے) کیا کہا تم نے؟
آرفیوسس :۔ یہ کونسا مقام ہے؟

روح :- یہ کرۂ ظلمت کے دو دریاؤں کا سنگھم ہے۔
آرفیوسس :- یہ کن لوگوں کی روحیں ہیں؟
روح :- یہ ان گناہگاروں کی روحیں ہیں جنہیں کفنایا اور دفنایا نہ گیا۔
آرفیوسس :- یہ ان سوکھے ہوئے پتوں کے ڈھیروں میں کیوں سسک رہی ہیں؟
روح :- یہ سب اکرون کا انتظار کر رہی ہیں۔
آرفیوس :- وہ کون ہے؟
روح :- ایک ملاح کا نام ہے۔ جو ان روحوں کو اپنی کشتی میں لاد کر ان کی جگہ پہ پہنچائے گا۔
آرفیوسس :- تمھیں اس حال میں دیکھ کر میرا دل غم سے بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔
روح :- تم کس شخص کی روح ہو؟
آرفیوسس :- میں ابھی زندہ ہوں۔
روح :- عجیب بات ہے۔
آرفیوسس :- اور یہ سب کچھ ایک عجیب حادثے کی وجہ سے ہوا ہے۔
روح :- تم یہاں کیوں آئے ہو؟
آرفیوسس :- میں اپنی بیوی یوریشیا سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ تم نے یہاں کبھی کوئی ایسی روح دیکھی ہے جس کے بال سونے کی طرح چمکتے

ہوں اور آنکھیں نیلم کی طرح۔ جیسے نیلے نیلے دو جگنو۔

روح :- ہاں دیکھی ہے۔

آرفیوسس :- کب؟

روح :- اب سے ایک سال پہلے ایک روح ان اندھیروں سے گذری تھی۔ اس کے بال سونے کی طرح تھے۔ آنکھیں دو جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کی ایک پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا۔ جس کی بوندیں جہاں جہاں گرتی تھیں گھنگھرو سے چھنک جاتے تھے۔ اور ایک بڑی ہی سریلی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

آرفیوسس :- وہ میرے بربط کی آواز تھی۔

روح :- یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟

آرفیوسس :- بربط۔

روح :- کوئی ہتھیار ہے؟

آرفیوسس :- نہیں۔ یہ ایک ساز ہے

روح :- ذرا اسے بجاؤ تو سہی۔

آرفیوسس :- یہ اس وقت سو رہا ہے۔

روح :- عجیب مسخرے ہو تم۔ یہ بھی کوئی زندہ چیز ہے۔

آرفیوسس :- یہ زندہ ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

روح :- یہ کب جاگے گا؟

آرفیوسس :- اسے یورشیا کی آواز جگائے گی۔

روح :۔ تم مجھے پاگل معلوم ہوتے ہو۔
آرفیوسس :۔ یہ میرے لئے نیا نام نہیں۔ اس سے پہلے بھی مجھے ڈورکس کے بازاروں میں اسی نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ کون آ رہا ہے؟
روح :۔ اسی کا نام تو اکرون ہے۔ اس دریا کا ملاح۔

پانی سے ٹکراتے ہوئے چپوؤں کی آواز۔ کشتی کنارے سے آ کر لگتی ہے۔

اکرون :۔ اجنبی تمہارا نام کیا ہے؟
آرفیوسس :۔ آرفیوسس
اکرون :۔ کوہ اولمپس سے آئے ہو نا؟
آرفیوسس :۔ ہاں۔ وہیں سے۔
اکرون :۔ خوش آمدید معزز مہمان۔ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ میرے آقا معزز پلوطو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔
آرفیوسس :۔ یوریشیا کہاں ہے؟
اکرون :۔ یوریشیا کون؟
آرفیوسس :۔ میری بیوی۔
اکرون :۔ مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔ میں اس دریا کے کناروں سے کبھی باہر نہیں نکلا۔
آرفیوسس :۔ تو پھر تم بھی ان روحوں کی طرح ایک بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو۔

اکرون :۔ نجومی تو نہیں ہو تم ؟

آرفیوسس :۔ میں موسیقار ہوں۔

اکرون :۔ کیا روحوں کو گانا سکھانے آئے ہو ؟

آرفیوسس :۔ تم مجھے کہاں لئے جارہے ہو ؟

اکرون :۔ اپنے آقا کے پاس۔ ان کے محل میں۔

آرفیوسس :۔ ان کا محل کہاں ہے اور کتنی دور ہے ؟

اکرون :۔ تم اس کے بالکل قریب آگئے ہو۔ میں تمہیں اس چٹان پہ کشتی سے اتار دوں گا۔

آرفیوسس :۔ کس چٹان پہ ؟

اکرون :۔ ادھر دیکھو۔ وہ۔ جہاں شعلے اٹھ رہے ہیں۔ اب تمہیں ان شعلوں میں تھوڑا سا سفر کرنا ہے۔ تھوڑی دور جاکر تمہیں ایک محل نظر آئے گا۔ وہی تمہاری منزل ہے۔

[ دبی دبی چیخیں۔ دبا دبا شور۔ کراہنے کی دھیمی دھیمی آوازیں۔ گناہگار روحوں کو سزائیں دی جارہی ہیں ]

آرفیوسس :۔ شعلے۔ بھڑکتے ہوئے شعلے۔ چاروں طرف شعلے ہی شعلے لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے ان شعلوں کی آنچ نہیں آرہی۔ یہ کس کی روح ہے ؟ اس کے شانے پہ عقاب بیٹھا ہے۔ اور اس کے دل کو اپنی چونچ سے کُرید رہا ہے۔

[ چیخیں۔ شور۔ کراہنے کی آوازیں ]

آرفیوسس :۔ کتنا خوفناک نشیب ہے۔ اس میں انگاروں پر روحیں رینگ رہی ہیں۔ چیخ رہی ہیں۔ انہیں بچھو اور سانپ ڈس رہے ہیں۔ میں یہاں کیوں چلا آیا؟ یورشیا کہاں ہے؟

[کہیں قریب ہی سے کراہنے کی آواز آتی ہے]

آرفیوسس :۔ یہ کس کے کراہنے کی آواز ہے؟ یہ تو میری محبت ہی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس آواز کو پہچاننے میں مَیں کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ کس کی روح چٹان کے ساتھ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے؟ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ یورشیا۔ میری اپنی یورشیا۔

یورشیا :۔ (کراہتے ہوئے، زندگی کے کناروں سے۔ مجھے کون بلا رہا ہے؟ کہاں ہے؟ کدھر ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟ کیوں آرہا ہے؟ یہ ہوائیں میرے کانوں میں چپکے چپکے کیا کہہ رہی ہیں؟

آرفیوسس :۔ یورشیا۔ یورشیا۔

یورشیا :۔ آرفیوسس۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :۔ (گلوگیر آواز میں) زندگی کے ویرانے میں تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی آئی ہو؟

یورشیا :۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ منحوس ستاروں نے ایک کھیل کھیلا تھا۔

آرفیوسس :۔ (روتے ہوئے) یورشیا۔ میری اپنی یورشیا۔

یورشیا :۔ تمھیں یہاں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں اس عذاب کو

بھول گئی ہوں۔ ان بھڑکتے ہوئے شعلوں میں اب مجھے ٹھنڈک محسوس
ہونے لگی ہے ۔ مجھے نیند آرہی ہے ۔ اس سے پہلے کہ تم چلے جاؤ مجھے
اپنے آغوش میں سو لینے دو۔

آرفیوسس :۔ گھبراؤ نہیں یورشیا میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ میں تمھیں اپنے
ساتھ اُسی دنیا میں لے جاؤں گا جسے تم چھوڑ کر آئی ہو۔

یورشیا :۔ وہ کیسے ؟

آرفیوسس :۔ میں نے تمہاری محبت میں زندگی اور موت کے دیوتاؤں کو
بھی تسخیر کرلیا ہے ۔ اب میں ان شعلوں کو تسخیر کر دوں گا۔

یورشیا :۔ کیا تم ابھی زندہ ہو؟

آرفیوس :۔ ہاں میں زندہ ہوں ۔

یورشیا :۔ زندہ انسان تو یہاں نہیں آسکتے ۔

آرفیوس :۔ یہ سب تمہاری محبت کا کرشمہ ہے ۔ جو مجھے کوہ اولمپس پر
لے گئی ۔ زیئوس دیوتا کے دربار میں لے گئی ۔ اور اب یہاں لے آئی
ہے ۔ میرے بربط کا آخری گیت آج ان شعلوں سے جنم لے گا۔ اور یہ
شعلے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گے ۔ آج میں جہنم کی آگ کو سرد
کر دوں گا۔

[ بربط کے تاروں کو چھیڑتا ہے ۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ
دیوتائے جہنم پلوطو کی آواز بھڑکتے ہوئے شعلوں
میں گونجتی ہے ۔ ]

پلوطو :- آرفیوسس - ہمارے معزز مہمان - اولمپس کے جادواثر بربط نواز۔
بند کرو - اپنے ساز کی آواز کو بند کرو - جہنم کی آگ ٹھنڈی ہوتی جارہی ہے -
شعلے خاموش ہوتے جاتے ہیں -

آرفیوسس :- یہ کس کی آواز ہے ؟

پلوطو :- تم ہاڈس کے دیوتا سے ہمکلام ہو -

آرفیوسس :- میں آپ کو کیسے مل سکتا ہوں ؟

پلوطو :- تمھیں ہم سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے - ہم مقدس زیئوس کے
حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تمہاری خواہش کو پورا کرتے ہیں - تم یورشیا کو
لے جا سکتے ہو - لیکن ایک شرط پر -

آرفیوسس :- وہ شرط کیا ہے ؟

پلوطو :- کرہ ظلمت میں سفر کرتے ہوئے تم یورشیا کے ساتھ کوئی بات
نہیں کروگے - اور نہ پیچھے گھوم کر اُسے دیکھو گے - وہ اس سفر میں تم سے
علیحدہ رہے گی - یہ پابندی صرف کرہ ظلمت کے کنارے تک ہے -

آرفیوسس :- مجھے منظور ہے یہ شرط -

پلوطو :- ایک بار پھر سوچ لو -

آرفیوسس :- میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے -

پلوطو :- تم یورشیا کو لے جا سکتے ہو -

آرفیوسس :- ہمارے جانے کا راستہ کونسا ہوگا ؟

پلوطو :- تم جہاں قدم رکھو گے وہیں راستہ بن جائے گا - یہ اعزاز فقط

تمہاری ذات کے لئے ہے۔

[ وقفہ ]

آرفیوسس :- پھر وہی گرہ ظلمت کے اندھیرے۔ سناٹے۔ کوئی آواز نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے صبح ہونے والی ہے۔ اور دھرتی کا کنارہ بھی قریب آگیا ہے۔ جہاں پہنچ کر میں یورشیا کے ساتھ بول سکوں گا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔ مگر میرا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے؟ یہ کس کی منحوس آواز میرے کانوں میں آرہی ہے؟ یہ کون ہے جو مجھے کہہ رہا ہے آرفیوسس تمھیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ اولمپس اور ہاڈس کے دیوتاؤں نے تمہارا مذاق اڑایا ہے۔ یورشیا تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اب اس کے قدموں کی چاپ بھی تو سنائی نہیں دیتی۔ یورشیا سی خوبصورت عورت کے لئے مجھے دھوکہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ ایک بار مجھے پیچھے گھوم کر ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔ تاکہ دیوتاؤں کی سچائی کا پول کھل جائے۔ اب مجھے دیر نہ کرنی چاہیئے

[ پیچھے گھوم کر اندھیروں میں جھانکتا ہے۔ چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھنکارتی ہوئی ہواؤں کی سرسراہٹ۔ ]

یورشیا :- یہ تم نے کیا کر دیا۔ آرفیوسس یہ تم نے کیا کر دیا۔ دیوتاؤں کی شرط کا تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ اب ہم آپس میں کبھی نہ مل سکیں گے۔ منزل کے قریب آکر منزل سے بہت دور ہو گئے ہو تم۔ تمہاری بے چینی و بے صبری نے

اس چیز کو گنوا دیا جسے تم نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔
(یوریشیا کی آواز دور ہٹتی چلی جاتی ہے) الوداع۔ آرفیوسس الوداع۔

[کرہ ظلمت کے اندھیروں میں سریلی آوازوں کا طوفان سا اٹھتا ہے۔ جس میں آرفیوسس کی آوازیں گونجتی ہیں۔]

آرفیوسس :۔ یوریشیا۔ یوریشیا۔ یوریشیا

[آرفیوسس کی آوازیں رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جاتی ہیں۔ کرہ ظلمت کے اندھیرے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔]

## ساتواں منظر

[کوہ اولمپس کی برفانی بلندیاں]

[برفانی آندھی بدستور چل رہی ہے۔ بلندیوں سے لڑھکتے ہوئے برفانی تودوں اور پتھروں کے دھماکے۔ غار کے دہانے پر ایک پتھر آکر گرتا ہے۔ جس کے دھماکے سے آرفیوسس چونک جاتا ہے۔]

آرفیوسس :۔ کتنا بھیانک خواب دیکھا ہے میں نے۔ اور جو کچھ دیکھا ہے حقیقت سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تو وہی غار ہے جہاں کہ میں یہ خواب دیکھنے سے پہلے تھا۔ طوفان اپنی زندگی کی ساری قوتیں صرف کر رہا ہے۔ زیئوس دیوتا کا دربار۔ کرہ ظلمت۔ جہنم۔ بھڑکتے ہوئے شعلے اور ان میں مبتلائے عذاب روحیں ایک خواب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور زندگی بھی سب سے بڑا دھوکہ ہے۔
اب میں کوئی دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔ مجھے کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میری
منزل میرے سامنے ہے۔ طوفان چلتا ہے تو چلتا رہے مجھے اس کی کچھ
پرواہ نہیں۔ محبت کے مسلک میں طوفان کے گذر جانے کا انتظار کرنا
روا نہیں۔ اس میں کود جانے کا وقت تو وہ ہے جبکہ طوفان اپنے
عروج پر ہو۔

[بربط بجاتے ہوئے غار سے باہر نکل جاتا ہے۔
آندھی کا شور۔ دھماکے۔]

# جادُو

## اداکار

سریش
رتنا
منگو دادا
فلمساز
پتوارڑی
کمپاؤڈر
ہدایت کار
مکالمہ نویس
عکاس
ایکسٹرا لڑکیاں اور دوسری آوازیں۔

ایکسٹرا لڑکی عـ۱ :- اسے ہے بس اب جانے بھی دو۔ جمائیاں ہی لیتی جاؤگی۔
ایکسٹرا لڑکی عـ۲ :- میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔
عـ۱ :- جبھی تمہارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔
عـ۲ :- میں نے آج میک اپ نہیں کیا۔
عـ۱ :- کر لیتیں۔
عـ۲ :- فرصت ہی نہیں ملی۔
عـ۱ :- اتنا مصروف رہتی ہو تم۔
عـ۲ :- اور جب بیکار دن بیکار راتیں شروع ہوتی ہیں تو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔
عـ۱ :- دادا اسے معلوم تو کیا ہوتا سیٹھ جی کیا کر رہے ہیں؟
عـ۲ :- کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔
عـ۱ :- اور ہمیں کب پڑھیں گے؟
عـ۲ :- وہ پرانی کتابیں نہیں پڑھا کرتے۔
عـ۱ :- (تھکا ہوا سانس لیتے ہوئے) صبح سے شام ہو جاتی ہے اور سیٹھ جی کو ایکسٹرا لڑکیوں کے چناؤ کی فرصت ہی نہیں ملتی۔
عـ۲ :- بڑے آدمی جو ہوئے۔ چھوٹی باتوں کی طرف کم دھیان دیتے ہیں۔

عا :- مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ صبح ایک پیالی چائے پی کر آئی تھی۔

مٹ :- کچھ کھالیا ہوتا۔

بل :- یہاں تو توس بھی دو آنے میں ملتا ہے۔

عٹ :- اور چائے کی پیالی چار آنے میں۔

عا :- میری جیب میں تو چھ آنے ہیں۔ صرف بس کا کرایہ۔

عٹ :- ٹرام میں تو چھ پیسے لگیں گے۔

عا :- سیٹھ جی نہ جانے کب دفتر سے باہر آئیں گے۔ نہ جانے کب چناؤ ہوگا۔ نہ جانے کب ختم ہونگیں انتظار کی یہ لمبی گھڑیاں۔

عٹ :- بس ختم ہوگئی۔ سیٹھ جی دفتر سے نکل آئے ہیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ اچھے موڈ میں ہیں۔

عا :- لپک کر چلو دادا نے اشارے سے بلایا ہے۔

[ فلمساز سیٹھ ایکسٹرا اسپلائر منگو دادا کے ساتھ باتیں کرتا آرہا ہے۔ ]

فلمساز :- کالے چہرے۔ پیلے چہرے۔ چتکبرے چہرے۔ کوبرا لوبٹ پالش۔ سوکھے ہوئے پتے۔ دھوپ چھاؤں۔ اندھیرا اجالا۔ ان چہروں کے یہی نام رکھے جا سکتے ہیں منگو دادا۔

منگو :- جی سیٹھ جی۔

فلمساز :- جب سے ایکسٹرا اسپلائر بنے ہو کبھی کوئی سکرین فیس نہیں

دکھایا تم نے۔ جس میں زندگی ناچ رہی ہو۔ گنگنا رہی ہو۔
جوانی کے شوخ رنگوں سے کھیل رہی ہو۔

منگو :۔ اچھا سیٹھ جی دکھاؤں گا۔

فلمساز :۔ ہے کوئی ایسا ماڈل تمہارے پاس ؟

منگو :۔ ہاں ہے۔

فلمساز :۔ کیا نام ہے اس کا ؟

منگو :۔ رتنا

فلمساز :۔ کیا عمر ہے اس کی ؟

منگو :۔ یہی سولہ سترہ سال۔

فلمساز :۔ روپ رنگ

منگو :۔ گورا

فلمساز :۔ قد کاٹھ

منگو :۔ بوٹا سا

فلمساز :۔ ڈیل ڈول

منگو :۔ سانچے میں ڈھلا ہوا۔

فلمساز :۔ خدو خال۔

منگو :۔ بڑے تیکھے۔ ہو بہو چینی کی گڑیا۔

فلمساز :۔ پڑھی لکھی ہے ؟

منگو :۔ ہاں پڑھی لکھی ہے۔

فلمساز :۔ آواز کیسی ہے اس کی ؟
منگو :۔ بڑی سریلی
فلمساز :۔ ناچ سکتی ہے ؟
منگو :۔ جی وہ بڑا اچھا ناچتی ہے۔
فلمساز :۔ کیا سچ
منگو :۔ اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں سیٹھ جی۔
فلمساز :۔ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے ؟
منگو :۔ پینٹر ہے۔ بچارا دو سال سے بیمار ہے۔ بڑی مشکل سے گذر بسر ہوتی ہے۔
فلمساز :۔ اور کوئی اولاد نہیں ہے اس کی ؟
منگو :۔ نہیں رنیا اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔
فلمساز :۔ کسی وقت رنیا کو یہاں لاؤ۔
منگو :۔ ضرور لاؤں گا۔ سواری کا انتظام کر دیں۔
فلمساز :۔ کر دیں گے۔ تم ایک بات تو بتاؤ۔
منگو :۔ جی فرماؤ
فلمساز :۔ رنیا کا باپ اس کام میں اس کی مخالفت تو نہ کرے گا ؟
منگو :۔ نہیں سیٹھ جی۔ وہ تو چاہتا ہے رنیا کو جلدی سے کہیں نوکری مل جائے اور اس کے کمزور کندھوں کا بوجھ ٹلے۔
فلمساز :۔ بس تو پھر رنیا کو کسی وقت یہاں ضرور لاؤ۔

منگو :۔ میرا انعام تو سیٹھ جی ادھر سرکاؤ۔
فلمساز :۔ انعام ضرور ملے گا تم یہ کام تو کرو۔
منگو :۔ ایک بات کہوں سیٹھ جی
فلمساز :۔ کہو دادا
منگو :۔ اب میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ ایکسٹرا لڑکے لڑکیوں کا ریوڑ یہاں تک ہانک کر لانے کی طاقت نہیں رہی۔ اب تو آپ پُن دان کریں۔
فلمساز :۔ بتاؤ کیا کریں۔
منگو :۔ اب میری پنشن لگا دیں۔
فلمساز :۔ لگا دیں گے۔ دعا کرو یہ پکچر ہٹ ہو جائے۔ گولڈن جوبلی کرے۔
منگو :۔ خدا کرے۔ خدا کرے۔ لاؤ سیٹھ جی اب کچھ دو۔ مجھے گھر جانا ہے۔ دادی چولہا گرم کئے بیٹھی ہو گی۔ کہتی تھی آج میٹھے چاول پکانے ہیں۔
فلمساز :۔ جاؤ میرا نام لے کر منشی جی سے لے لو۔
منگو :۔ کتنے لوں ؟
فلمساز :۔ بیس روپے
منگو :۔ نہیں سیٹھ جی کم سے کم تیس روپے
فلمساز :۔ اچھا جاؤ لے لو۔
منگو :۔ کلیان ہو۔ اَن داتا کا کلیان ہو۔

CHANGE OVER

[ہلکی ہلکی سیٹیاں]

رینا :- بڑی سُریلی سیٹیاں بجا رہے ہو سریش بابو۔ تاروں کو کہیں نیند نہ آجائے۔

سریش :- اتنی رات گئے کہاں سے آرہی ہو رینا ؟

رینا :- سٹوڈیو سے۔

سریش :- شوٹنگ دیکھ کر آئی ہو ؟

رینا :- سیٹھ کو نئی فلم کے لئے نئے چہروں کی ضرورت ہے منگو دادا قسمت آزمانے کے لئے مجھے وہاں کھینچ کھانچ کر لے گئے تھے۔

سریش :- کیا ہرج ہے۔ قسمت کو آزمانا ہی چاہیئے۔

رینا :- سیٹھ جی بڑے تپاک سے ملے۔ بڑا اچھا سُبھاؤ ہے ان کا۔ لاکھوں پتی ہوتے ہوئے دولت کی ذرا بو نہیں ہے اُن میں۔

سریش :- اچھا۔

رینا :- ہاں مجھ سے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے ایک گیت سنایا۔ بانسری بجائی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چائے اور سموسوں سے ہماری خاطر تواضع کی۔ ہم لوگ آنے لگے تو سواری کا انتظام کر دیا۔

سرلیش :- اچھا۔
ریتا :- ابھی ابھی ان کی کار ہمیں یہاں چھوڑ گئی ہے۔
سرلیش :- دادا کہاں ہیں؟
ریتا :- ان کے سر میں درد ہو رہا ہے چھینکیں مار رہے ہیں۔ کار سے اترتے ہی ادھر چل دیئے۔ میں نے آوازیں بھی دیں۔ بولے ہی نہیں۔
سرلیش :- تمہارے بارے میں سیٹھ نے کیا کہا؟
ریتا :- سوچ کر جواب دیں گے۔
سرلیش :- تمھیں ایک بڑے مزے کی بات بتاؤں ریتا۔
ریتا :- بتاؤ بالو۔
سرلیش :- ایسے نہیں۔
ریتا :- اور کیسے؟
سرلیش :- اس بنچ پر بیٹھ جاؤ۔
ریتا :- لو بیٹھ گئی۔
سرلیش :- آج میرے اندر سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا ہے اور میں سو گیا ہوں۔
ریتا :- (ہنس کے) یہ کیا بات کہی؟
سرلیش :- تمہاری بانسری کے گیت میرے اندر شاعر بن کر جاگ اٹھے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں تمہاری بانسری کی تانیں سن سن کر میرے اندر بھی رنگ رس کی ایک تان سلگ اٹھی ہے جس کا ہر سُر

تمہارے بالوں میں لگے ہوئے اس گلاب کی طرح مہکنے لگا ہے۔

ریتا :۔ (متبسم لہجہ میں) جبھی آج تمہاری آواز سے بھی مہک آ رہی ہے۔ پہلے سے کچھ بدلے بدلے معلوم ہوتے ہو۔

سرلیش :۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ آج میں پہلے سے کچھ بدلا ہوا ہوں۔ آم کا یہ پیڑ مجھے بہت برا معلوم ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج یہ مجھے بڑا اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے یہ جہاں ہے بہت ٹھیک ہے۔ اسے یہیں ہونا چاہیئے تھا۔

ریتا :۔ انسان بدلتا ہے تو اس کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔ وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے سے نیا جنم لیتا ہے۔

سرلیش :۔ ہاں۔ آج میں نے اپنے گذرے ہوئے زمانے سے نیا جنم لیا ہے آج میں وہ نہیں ہوں جو کہ میں تھا۔ اس سے پہلے جو چیزیں مجھے بہت دور نظر آیا کرتی تھیں۔ آج بہت قریب نظر آ رہی ہیں۔ اس سے پہلے میں جن چیزوں سے بہت دور رہا کرتا تھا آج ان کے بڑا قریب آ گیا ہوں۔ وہ فاصلے مٹ گئے ہیں۔ ریتا۔

ریتا :۔ بابو

سرلیش :۔ اب میں گیتوں بھری ایک کہانی لکھوں گا۔ گیتوں بھرا ایک روپک۔

ریتا :۔ اچھا

سریش :- ہاں۔ اور تم اُس گیتوں بھرے روپک کی رانی ہو گی۔ تم نے میرے اندر سوئے ہوئے شاعر کو جگایا ہے۔ تم نے مجھے گیت لکھنے سکھائے ہیں۔ اس سے پہلے میں فقط ایک اداکار تھا۔ ایک بدنصیب اداکار۔ بجھا ہوا چاند۔ جو شاید پھر نہیں چمکے گا۔ اب اُسے چمکنا بھی نہیں چاہیئے۔ جس دنیا میں لوگ صرف دیئوں کی روشنی میں زندہ رہنا چاہتے ہوں وہاں چاند کی ضرورت نہیں۔

رتیا :- یہ گیتوں بھری کہانی مکمل کب ہو گی ؟

سریش :- اسے مکمل کرنے کے لئے مجھے تم سے کچھ لینا ہے۔

رتیا :- کیا لینا ہے تم نے مجھ سے بابو ؟

سریش :- تمہارے ہونٹوں کی ہنسی۔ آنکھوں کا جادو۔ آواز کا رس۔

رتیا :- اس سے کیا ہو گا ؟

سریش :- اس کے بغیر یہ روپک کوئی روپ نہیں دھار سکے گا۔ اس کی کوئی مشکل نہیں بن سکتی۔

رتیا :- یہ روپک کھیلا کہاں جائے گا ؟

سریش :- زندگی کی سٹیج پر۔

رتیا :- کب کھیلا جائے گا ؟

سریش :- جب تمہاری آواز کی ملہاروں کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ گھمنڈ کر اٹھیں گی اور ان سے میرے گیتوں کی برکھا ہو گی۔ ابھی تو پہلی بوند پڑی

ہے۔ آج میں نے پہلا گیت لکھا ہے۔

ریتا :۔ کیا گیت لکھا ہے تم نے؟ مجھے بھی سناؤ۔

سریش :۔ سناؤں گا۔ ضرور سناؤں گا۔

ریتا :۔ کب؟

سریش :۔ جب تمہاری بانسری کی لے پر میرے من کا مور ناچے گا اور اس کے پروں کے پیارے پیارے رنگوں کی دھنک تمہاری آواز میں کھل جائے گی۔ جانتی ہو پھر کیا ہوگا؟

ریتا :۔ کیا ہوگا؟

سریش :۔ دھرتی پر ایک نیا جادو جگائیں گے۔

ریتا :۔ کون؟

سریش :۔ میرے گیت۔ تمہاری آواز۔ پھر شاید ہماری وہ تمنا پوری ہو جائے جو ابتک پوری نہیں ہوئی۔ میرا گیت سن کر دادا نے نجوم لگایا ہے۔

ریتا :۔ کیا نجوم لگایا ہے؟

سریش :۔ دادا کہتے ہیں وہ وقت اب دور نہیں جبکہ دولت اور شہرت ہمارے قدم چومے گی۔ ہماری قسمت کے بجھے ہوئے ستارے چمک اٹھیں گے۔

[ یکدم کھانسنے لگتا ہے۔ کراہتا ہے ]

ریتا :۔ (کسی قدر پریشانی میں) کیا ہے بالو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ سینے کو دبا کر

کھانستے کھانستے لوٹ پوٹ کیوں ہونے لگے ؟

سرلیش :۔ (اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے) مجھے کھانسی کی شکایت ہے۔
تم اس کا کچھ خیال نہ کرو ریتا۔

ریتا :۔ تم یکدم پیلے پڑ گئے ہو بابو۔ معلوم ہوتا ہے سخت تکلیف میں
ہو۔ مگر اپنی تکلیف چھپا رہے ہو۔

سرلیش :۔ نہیں ریتا نہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ تم اتنا پریشان کیوں ہو
رہی ہو۔ جاؤ اب آرام کرو۔ رات کافی ڈھل چکی ہے۔ میں
بھی اب آرام کروں گا۔

CHANGE OVER

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے

منگو :۔ سو گئے سیٹھ جی ؟

فلمساز :۔ نہیں آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا ہوں۔

منگو :۔ آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے۔

فلمساز :۔ بجنے دو۔ میں اس وقت کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ اس
وقت میرے خیالوں میں نئی پکچر کا کلائی میکس گھوم رہا ہے۔

منگو :۔ وہ کیا ہوتا ہے سیٹھ جی !

فلمساز :۔ کہانی کی جان۔

منگو :۔ کہانی میں بھی جان ہوتی ہے سیٹھ جی ؟

فلمساز :۔ ارے دادا تم نہیں سمجھتے اس بات کو۔

منگو :۔ سمجھاؤ نا سیٹھ جی۔
فلمساز :۔ یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں۔ آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ اور کوئی فلمی کہانی سناؤ۔ بڑی اچھی سی۔
منگو :۔ میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں سیٹھ جی۔
فلمساز :۔ جلدی سے موڈ بناؤ۔
منگو :۔ پہلے سیٹھ جی گرم گرم چائے پلاؤ۔ رس گلے کھلاؤ۔ پھر اس پنجرے کی بلبل بولے گی۔
فلمساز :۔ یہاں تو دل ہونا ہے دادا۔
منگو :۔ خدا جانے یہاں کیا کیا ہے سیٹھ جی۔ پر میں تو اس کو بلبل بولتا ہوں۔ موڈ میں ہو تو بڑی بولیاں بولتا ہے۔ بڑا چہکتا ہے۔ بڑا پھدکتا ہے۔ بڑا غل غپاڑہ کرتا ہے۔ چھوڑ یئے اس کتھا کہانی کو۔ میں بیرے کو بلاتا ہوں جلدی سے چائے کا بولئے۔ اس کے بنا تو اپنی زندگی بس بڑی بے چین ہوتی ہے۔
فلمساز :۔ چائے کا وقت ہو چکا ہے۔ بیرہ آنے ہی والا ہے۔
منگو :۔ سیٹھ جی ایک بڑا اچھا گیت کار ہے اپنے پاس۔ بڑے اچھے گیت لکھتا ہے۔ کہانیاں لکھتا ہے۔ بڑا ہی چھیل چھبیلا نوجوان ہے۔ ایسا ہیرو بھی نہیں دیکھا ہو گا آپ نے۔
فلمساز :۔ کیا حلیہ ہے اس کا؟
منگو :۔ یہ رہی اس کی تصویر۔

فلمساز :۔ اوہ یہ۔ میں نے اسے پہلے بھی گول مارکیٹ میں دیکھا ہے۔
مشتبہ آدمی ہے۔

منگو :۔ کیوں سیٹھ جی کیا بات ہے؟

فلمساز :۔ یہ بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا سگریٹ پی رہا تھا۔
آسمان میں گھومتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔

منگو :۔ یہ اس کی عادت ہے۔ بادل نہیں ہوتے تو یہ ستاروں کو دیکھا
کرتا ہے۔ ستارے نہیں ہوتے تو یہ خالی آسمان کو دیکھتا
رہتا ہے۔

فلمساز :۔ مجھے اس پر شک ہے۔

منگو :۔ شک کیسا سیٹھ جی؟

فلمساز :۔ میں کچھ چیزیں خریدتا ہوا کھمبے کے پاس سے گزرا تو مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے میری جیب سے کوئی تیز سی چیز چھو گئی ہے۔

منگو :۔ پھر آپ نے کیا کیا سیٹھ جی؟

فلمساز :۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ گھوم کر پچھلی طرف دیکھا۔
یہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بس سٹاپ کی طرف
جا رہا تھا۔ میں نے اس بات پر کچھ غور نہ کیا۔ اور جلدی میں
آگے نکل گیا۔

منگو :۔ پھر کیا ہوا سیٹھ جی؟

فلمساز :۔ اگلی دکان پر مجھے ایک گھڑی بہت پسند آئی۔ قیمت طے کی۔ بٹوہ

نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب کٹ چکی تھی۔
بٹوہ غائب تھا۔

منگو :۔ اوخو

فلمساز :۔ یہاں سے یہاں تک کھڑکی سی بنی ہوئی تھی جیب میں۔

منگو :۔ کوئی تھا اُس کھڑکی میں؟

فلمساز :۔ ہوا کے جھونکے آجا رہے تھے۔

منگو :۔ روپیہ کتنا تھا بٹوے میں؟

فلمساز :۔ پانچ ہزار روپیہ۔

منگو :۔ باپ رے باپ۔ پانچ ہزار روپیہ۔ میرا تو سارا انجر پنجر ہل گیا ہے سیٹھ جی۔ پانچ ٹپاخے سے چلے ہیں یہاں دل کے پاس۔

فلمساز :۔ یہ مجھے جیب کترا معلوم ہوتا ہے۔

منگو :۔ نہیں سیٹھ جی نہیں۔ یہ بڑا شریف ہے۔ قسمت بری سہی آدمی بُرا نہیں۔ بڑا اونچا فنکار ہے۔ فلم انڈسٹری والوں نے اسے پہچانا نہیں۔ بیچارے کو کسی نے کوئی چانس نہیں دیا۔

فلمساز :۔ یہ کہاں رہتا ہے؟

منگو :۔ رہتا کے پڑوس میں۔

فلمساز :۔ تم اس کی حمایت کیوں کرتے ہو؟

منگو :۔ اپنا برخوردار جو ہوا۔ بڑی عزت کرتا ہے۔ جب کوئی گیت لکھتا ہے سب سے پہلے مجھے سناتا ہے۔ پرسوں رات اس نے

اپنا ایک گیت سنایا۔ میرا دل بھر آیا۔ میں رونے لگا۔ یہ بھی
میرے ساتھ رونے لگا۔ دادی چھالیاں کتر رہی تھی۔ میرے
آنسو دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔ اوپر سے ریتا آگئی۔ ہم سب
کو روتے دیکھ کر اُس نے بھی رونا شروع کر دیا۔

فلمساز :۔ (ہنستے ہوئے) بھئی واہ۔ کیا خوب تماشہ لگایا تم لوگوں نے۔

منگو :۔ اس بیچارے کو کہیں کام مل جائے تو اچھا ہے۔ پردیسی ہے۔
صدموں نے بیمار کر رکھا ہے۔ میں فلمی سیٹھوں کو اس کی یہ
تصویر دکھاتا رہتا ہوں۔ کسی کے دل میں تو رحم آئے گا ہی۔

فلمساز :۔ کوشش کرے انسان تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

منگو :۔ سیٹھ جی اسے اپنی پکچر میں ضرور کام دیں۔

فلمساز :۔ اچھا دادا سوچیں گے۔ لو بیرہ چائے لے آیا۔ اب تم چپکے
سے مزے مزے چائے پیو۔ میں کلائی میکس پر غور کرتا
ہوں۔

CHANGE OVER

ریتا :۔ سرلیش بابو۔ سرلیش بابو۔ اوہ۔ ابھی تک سو رہے ہو۔ سورج
کتنا چڑھ آیا۔ اٹھو۔ جاگو بابو۔

سرلیش :۔ (چونک کر) کون۔ ریتا۔ (جمائی لیتے ہوئے) کتنا سہانا دن ہے۔

ریتا :۔ نیند میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟

سرلیش :۔ یونہی بڑبڑا رہا تھا۔

ریتا :۔ رات سے بابا کو بڑی تکلیف ہوگئی ہے۔ پھر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔
پتھر بنے پڑے ہیں۔

سریش :۔ یہ تو بڑے افسوس کی بات سنائی تم نے۔

ریتا :۔ رات بھر میں ان کے چہرے پہ مردنی چھا گئی ہے۔ بول نہیں سکتے۔
اشاروں سے بات کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سانس کیسے
لے رہے ہیں۔ نبض کیسے چل رہی ہے۔
(روتے ہوئے) ان کی یہ حالت دیکھ کر ممی کو غش پہ غش
آرہے ہیں۔ موسی سیمار ورد کے نڈھال ہو رہی ہیں۔ گھر
میں ہمارے تو قیامت آگئی ہے۔

سریش :۔ ایسی حالت میں انہیں فوراً ہسپتال پہنچانا چاہیئے۔

ریتا :۔ ہسپتال فون کیا تھا۔ ابھی کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک دو دن
انتظار کرنا پڑے گا۔

سریش :۔ تو پھر انہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔ ہسپتال میں داخلہ
ملنے تک انہیں مناسب طبی امداد ملنی چاہیئے۔

ریتا :۔ ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ وہ بہت سی قیمتی دوائیں اور انجکشن تجویز کر گیا ہے۔
کم سے کم دو سو روپے ہوں تو کام چلے۔

سریش :۔ فکر نہ کرو ریتا۔ روپے میں کہیں نہ کہیں سے تمہارے لئے
حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ریتا :۔ تم بھی بیمار ہو بابو۔ کہاں پریشان ہوتے پھرو گے۔ تمہارے حالات

بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ آرام کرو۔

سریش :- آرام اپنی قسمت میں نہیں ہے ریتا۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ہی آرام ملے

ریتا :- تم نے ابتک سب مجھے آرام ہی دیا ہے بابو۔ بڑا آرام۔ مجھے ہر طرح خوش رکھا ہے۔ ہر دکھ میں میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے تم اپنی داسی سمجھو۔

سریش :- نہیں۔ نہیں۔ تم میرے گیتوں بھرے روپک کی رانی ہو میری گیت مالا کا سب سے پیارا گیت۔

ریتا :- تم ذرا بابا کا خیال رکھنا بابو۔ میں دادا کے ساتھ سٹوڈیو تک جا رہی ہوں۔ شاید آج کنٹریکٹ ہو جائے اور سیٹھ سے ایڈوانس مل جائے۔ دادا نے یہی مشورہ دیا ہے۔

[ باہر سے منگو دادا کی آواز آتی ہے ]

منگو :- اب آبھی جاؤ ریتا۔ باتیں بہت ہو چکیں۔ دیر ہو رہی ہے۔

ریتا :- آ رہی ہوں۔ دادا میں آ رہی ہوں۔

سریش :- آج میرے پاس کمرے میں نہیں آئے دادا۔ خفا ہیں مجھ سے؟

ریتا :- خفا کیوں ہونا ہے۔

سریش :- پھر کیا بات ہے؟

ریتا :- اپنی دھن میں رکشا والے کے ساتھ میرٹھ کی نوچندی کی باتیں کر رہے ہیں۔ چکوری بنواڑن کے ساتھی پان کا چسکا لے رہے ہیں۔

سرلیش :- اچھا اچھا۔ پانوں کے توڑے رسیا ہیں دادا۔

ریتا :- لو بالواب میں جاتی ہوں۔

وقفہ

سرلیش :- (لمبا سانس لیتے ہوئے) ریتا کو روپے کی ضرورت ہے۔ اور اپنی جیب کئی دنوں سے خالی ہے۔ پانچ ہزار کے ہنستے اور روتے ہوئے نوٹ ختم ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے میری حالت بھی تشویشناک بتائی ہے۔ اگر یہ دوائیں کارگر نہ ہوئیں تو انجکشن لگیں گے۔ جن کے لئے مجھے بھی روپے کی سخت ضرورت ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے اندر جاگے ہوئے شاعر اور اداکار نے مجھے بالکل بیکار کر دیا ہے۔ یہ مجھے اپنا دھندا بھی نہیں کرنے دیتے۔ میں گیتوں کی بھول بھلیاں میں کھو گیا ہوں۔ ڈاکٹر کی ڈسپنسری نے میری زندگی کا دامن اس مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کہ میں اپنی مرضی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔

پس منظر میں موسیقی کی آوازیں آہستہ آہستہ ابھرتی ہیں۔

سرلیش :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ گیت کیوں لکھے جا رہا ہوں۔ گیتوں بھری کہانی تو مکمل ہو چکی ہے۔ مگر وہ اسٹیج کہاں ہے جہاں یہ کہانی کھیلی جائے گی؟

کچھ پتہ نہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو معلوم نہیں یہ اندھیرے کب ختم ہوں گے؟ کہاں ختم ہوں گے؟ اجالا کیوں نہیں ہوتا؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ میری منزل کہاں ہے؟

میری منزل ---

[ موسیقی ]

سرلیش :- یہ میرا دم کیوں گھٹنے لگا ہے؟ دل کی دھڑکن دھیمی کیوں پڑتی جا رہی ہے؟ شاید اس لئے کہ رینا کو گیت نہیں روپے چاہئیں۔ وہ ایک دھن والے سے اپنے باپ کی زندگی کی بھیک مانگنے گئی ہے۔ کیا میں خاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہوں گا اور گیت لکھتا رہوں گا؟ نہیں۔ بالکل نہیں۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ میں ان گیتوں کو بیچ ڈالوں گا۔ آج نیلام اٹھے گا ان کا۔ ان کا سوداگر کے سبھی مجھے رینا کے لئے روپے حاصل کرنے ہیں۔

CHANGE OVER

[ شوٹنگ ہو رہی ہے۔ سٹوڈیو میں کام کرنے والوں کی ملی جلی آوازیں۔ ]

ہدایت کار :- پنچھی کدھر ہے؟

مکالمہ نویس :- اسی پنجرے میں ہوں۔ مکالمے درست کر رہا ہوں۔

ہدایت کار :۔ تم بالکل بنڈل ہو۔
مکالمہ نویس :۔ بوگس تو نہیں ہوں۔
ہدایت کار :۔ پورا پانچ ہزار دیا ہے تم کو اس پکچر کا۔ جلدی سے یہ ڈائیلاگ بدلو نہیں تو تمہارا حلیہ بدل دیا جائے گا۔

(ہنستا ہے)

مکالمہ نویس :۔ حلیہ تو اپنا ہر گھڑی بدلتا رہتا ہے۔ زندگی بدلنے کی بات کرو۔
ہدایت کار :۔ باتیں نہ کرو ڈیئر پنچھی۔ کام کرو کام۔ جلدی سے ایک چھوٹا سا ڈائیلاگ دو۔
مکالمہ نویس :۔ کس سائز اور سٹرنگھتھ کا؟
ہدایت کار :۔ سائز میں تمہاری ناک سے لمبا نہ ہو اور سٹرنگھتھ ہو اس میں ایٹم کی۔ بس، دو تین الفاظ۔ بڑے آسان سے۔
مکالمہ نویس :۔ سانس تو اپنا بڑی مشکل سے نکل رہا ہے۔ مکالمے آسان کیسے نکلیں گے۔
ہدایت کار :۔ لائٹس آن۔
عکاس :۔ سولہ یہاں لو۔
ہدایت کار :۔ سے بی موو کرو۔ ذرا اور۔ ذرا اور۔ بس ٹھیک ہے۔
عکاس :۔ فیس لائٹ کو ذرا سوفٹ کرو۔
ہدایت کار :۔ نمبر چار پہ شیڈ دو۔ یہ شیڈ ہٹا لو۔

عکاس :۔ پنجہ ادھر لاؤ۔

ہدایت کار :۔ نمبر سولہ میں کپڑے کا ڈفیوزر دو۔

عکاس :۔ بیس نمبر آن کرو۔

ہدایت کار :۔ ڈیٹ کو اوپر لو۔

عکاس :۔ نہیں صاحب نہیں۔ اتنا اوپر سے ایک لائٹ دے گا تو پکچر ڈارک ہو جائے گا۔ کچھ رجسٹر نہ ہوگا۔ کم سے کم دو سپاٹ۔ تین بے بیز۔ یہ پکچر کا لاسٹ شاٹ ہے۔ کلائمیکس۔ کوئی پکٹوریل ایفکٹ۔ ڈائرکٹوریل ٹچ۔

ہدایت کار :۔ اویس۔ ویری گڈ ورکر۔

عکاس :۔ فل لائیٹس۔

ہدایت کار :۔ فوکس۔

عکاس :۔ پانچ فٹ گیارہ انچ۔

ہدایت کار :۔ (ذرا اونچی آواز میں) ساؤنڈ ریڈی۔

عکاس :۔ ساؤنڈ ریہرسل۔

ہدایت کار :۔ فور ریہرسل۔

عکاس :۔ ریڈی فار ٹیک۔

ہدایت کار :۔ ساؤنڈ ریڈی۔

[ تھوڑی دور سے ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں بجتی ہیں ]

[ ہدایت کار :- او کے - او کے -
عکاس :- سائے لنٹ پلیس ]

ہدایت کار :- میک اَپ ماسٹر- میڈام کو پف کرو- اور دیکھو مسٹر ہیرو کی ناک بہت چمک رہی ہے-

| قہقہے |

عکاس :- سائے لنٹ پلیس- کیپ کوائٹ-
ہدایت کار :- کیمرہ سٹارٹ-
عکاس :- کلیپ-
ہدایت کار :- کٹ- کٹ- مارولس- اب کچھ شاٹ بنا- اب ٹرالی اور کرین شاٹ ہوگا- اور پھر پیک اَپ-
مکالمہ نویس :- سیٹھ صاحب نے پوچھا ہے- جو گیت کار آیا ہے اس کے گیت آپ نے سنے ہیں؟
ہدایت کار :- سنے ہیں؟
مکالمہ نویس :- سیٹھ صاحب پوچھتے ہیں کیسے ہیں؟
ہدایت کار :- یکدم بنڈل- فلم میں نہیں چل سکتے- بازار میں چل سکتے ہیں-

[ بازار کا صوتی منظر- جیسے خوب گہما گہمی ہو رہی ہے- ملی جلی آوازوں میں بانسری کی تانیں بھی رہ رہ کر کوندے کی طرح لپک جاتی ہیں- تھوڑی دیر میں ان آوازوں میں دبی دبی سسکیاں ابھرتی ہیں- ]

[ اور سو جاتی ہیں۔ پھر یکدم ایک جھنکار سی گونجتی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑا شیشہ گر کر ٹوٹ گیا ہو۔ ]

سرلشیں :۔ (کبھی کبھی، زندگی سے خالی آواز میں) ٹوٹ گیا سپنوں کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ سپنے ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گئے۔ گیت زخمی ہو گئے۔ کتنی تیز آندھی چلی ہے۔ شیشوں اور سپنوں کی دنیا میں کتنا ہولناک زلزلہ آیا ہے۔ دھرتی سے کتنے تیز شعلے اٹھے ہیں۔ میری گیتوں بھری کہانی جل گئی ہے۔ اس کے مرگھٹ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ جس میں وہ سب کچھ اب دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے جو اس سے پہلے صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے گیتوں بھرے رومپک کی رانی سسک سسک کر سو گئی ہے۔ مجھے آوازیں دیتے ہوئے ان اندھیروں میں کھو گئی ہے۔ مگر میں کیا کروں یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اتنی بڑی منڈی میں مجھے ان گیتوں کا کوئی بیوپاری نہیں ملا۔ یہ گیت پسند نہیں کئے گئے۔ میری طرح میرے گیت بھی فلمسازوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔ انہیں کسی نے پسند نہیں کیا۔

[ موسیقی ]

سرلشیں :۔ (تھکا ہوا سانس لیتے ہوئے) میں چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ اس پیڑ کے نیچے ذرا آرام کرنا چاہیے۔ یہ دن میری زندگی کا

کتنا سست رفتار اور اداس دن ہے۔ میں چاہتا ہوں جلدی سے رات ہو جائے۔ یہ سورج بجھ جائے۔ چاند تارے بھی آسمان میں نہ نکلیں۔ انہیں دیکھ کر میں جذباتی ہو جاتا ہوں میری کئی کمزوریاں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن آج مجھے پھر اپنی پوری طاقت سے کام لینا ہے۔ آج میں نے اپنی سوگند کو توڑ دینا ہے۔

(پنواڑی آتا ہے)

پنواڑی :۔ بابو جی - بابو جی

سرلیش :۔ کیا بات ہے للو بھیا بڑے بے چین ہو رہے ہو؟

پنواڑی :۔ آج میرے پیسے دے دیں دکان کا کرایہ دینا ہے۔

سرلیش :۔ پیسے تو ابھی دو چار روز میں آئیں گے۔

پنواڑی :۔ نہیں بابو جی نہیں۔ آج میرا حساب صاف کر ہی دیں۔ میں نے آگے حساب صاف کرنا ہے۔

سرلیش :۔ پیسے میرے پاس نہیں ہیں ہوتے تو ضرور دے دیتا للو بھیا۔

پنواڑی :۔ ہونے نہ ہونے کا للو ذمہ دار نہیں ہے بابو جی۔ مال دیا ہے۔ مفت نہیں مانگ رہا۔ پیسے تو میں لیکے ہی جاؤں گا۔

سرلیش :۔ تنگ نہ کرو بھیا۔ میں اس وقت بہت مجبور ہوں۔

پنواڑی :۔ اور للو بھی بہت مجبور ہے بابو جی۔ ایک تو مندے نے مار دیا ہے۔ اوپر سے ادھار لینے والے تنگ کرتے ہیں للو کدھر جائے۔

سریش :- بس دو چار دن اور صبر کرو۔ پیسے تمھیں مل ہی جائیں گے۔ کئی روز سے بیمار پڑا ہوں۔ آج اپنی مارکیٹ کا چکر لگاؤں گا۔

پنواڑی :- ایک دو روز کی بات نہ کرو بابو جی۔ پیسے تو میں ابھی لے لیتا تمہاری شرافت کا خیال آتا ہے۔ دو تین گھنٹوں کی مہلت دیتا ہوں۔ ٹھیک پانچ بجے پھر آؤں گا۔ میرے پیسے تیار رکھنا۔

CUT

[دروازے پر دستک]

سریش :- کون ہے؟

کمپاؤڈر :- ڈاکٹر صاحب کا کمپاؤڈر

سریش :- میں ابھی دروازہ کھولتا ہوں۔

کمپاؤڈر :- جلدی کھولئے۔

سریش :- (دروازہ کھولتے ہوئے) آئیے۔ بیٹھئے۔

کمپاؤڈر :- میں بیٹھنے نہیں آیا۔ کھڑے کھڑے آپ سے دو باتیں کرنا ہیں۔

سریش :- جی کہئے۔

کمپاؤڈر :- ڈاکٹر صاحب نے یہ بل بھیجا ہے۔ اور کہلا بھیجا ہے کہ اس کی ادائیگی آج ضرور ہو جائے۔

سریش :- کتنی رقم ہے؟

کمپاؤڈر :- بل میں دیکھئے۔

سرلش :- میں نے دیکھ لی۔
کمپاؤڈر :- ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں آج سے ادھار بالکل بند ہے۔ اب ادھار نہیں ہو گا۔

[ دروازہ کھٹ سے بند ہوتا ہے ]

سرلش :- شاعر نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ کتنی بھاری زنجیریں ڈال دی ہیں میرے پاؤں میں۔ جو مجھے گذرے ہوئے زمانے کی طرف کھینچ رہی ہیں۔ جن میں آج سے دو سال پہلے اجالے کی آخری کرن بھی سسک سسک کر دم توڑ گئی تھی۔ جبکہ میں اداکار بننے کے شوق میں اس شہر میں آیا تھا۔ مگر کامیابی نے میرا ساتھ نہ دیا۔ حالات مجھے افلاس کے آخری کنارے تک لے گئے۔ میرے تن کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ فاقوں نے میرا حلیہ بگاڑ دیا۔ پاکھ کی ٹھٹھری ہوئی تاروں سے خالی راتوں کے سناٹے میں مجھے فٹ پاتھ پر سونا پڑا۔ اور مجھے وہ کام کرنا پڑا جسے سماج بُری نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر سماج نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ زندہ رہنے کی کشمکش ہر چیز میں جاری ہے۔ اُس باز کو دیکھو جو بھوک سے تنگ آکر فضا میں بے خبر چڑیا پر جھپٹتا ہے اور اُسے دبوچ کر لے جاتا ہے۔ اسی جذبے کا سہارا لے کر میں اندھیروں سے اجالوں میں آگیا۔ پیٹ بھر کر روٹی کھانے لگا۔ سر چھپانے کو

ایک کھولی کرائے پہ لے لی۔ لیکن شاعر نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کردیا۔ یہ مجھے کارٹون بنا کر لوگوں کے ہجوم میں کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ دھوبی۔ گوالا۔ ہوٹل والا۔ باری باری سب آئیں گے۔ پیسوں کا شور مچائیں گے۔ اب ادھار کا چکر نہیں چل سکتا۔

[ موسیقی ]

سرلیش :۔ شاعر مجھے میرا دشمن معلوم ہوتا ہے۔ یہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس کو ہلاک کر دینا چاہیئے۔ اس گیتوں بھرے روپک کو مٹی میں ملا دینا چاہیئے۔ گیتوں سے بھوک نہیں مٹ سکتی۔ گیت اوڑھے نہیں جا سکتے۔ سر چھپانے کے لئے گیت جھونپڑے کا کام نہیں دیتے۔ اس جنگل میں زندگی کی کوئی تصویر گیتوں کے رنگوں سے مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان اندھیروں اور اجالوں میں باز چڑیوں پہ جھپٹتے ہی رہیں گے۔

CHANGE OVER

[ لہروں کا شور ]

سرلیش :۔ رات کے اندھیروں میں میری آنکھوں کے سامنے خون کے دھبے ناچ رہے ہیں۔ میں شاعر کو ہلاک کر دوں گا۔ اسے ہلاک کرنے سے ہی میری زندگی میں سکون پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ اسے کیسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

[لہروں کا شور]

سریش :۔ میرے سینے میں سلگتے ہوئے زخم نے کتنی کمزوری پیدا کر دی ہے میرے جسم میں۔ درد کی ٹیسیں بڑی تیزی سے اٹھ رہی ہیں۔ میں اس وقت بڑی تکلیف میں ہوں۔ کئی شکار میری گھات میں آ کے نکل چکے ہیں۔ یہ درد مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا۔ میرے ہاتھ پاؤں خود بخود کانپ رہے ہیں۔ برف کی طرح ٹھنڈے ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے اِن میں زندگی کی آگ بجھ رہی ہو۔

[لہروں کا شور]

[رینا آتی ہے]

رینا :۔ (کسی قدر لرزتی ہوئی آواز میں) بابو۔ سریش بابو۔

سریش :۔ رینا تم یہاں کہاں ؟

رینا :۔ میں سیٹھ جی کے ساتھ سمندر کی سیر کرنے آئی ہوں۔

سریش :۔ سیٹھ کہاں ہے ؟

رینا :۔ دادا اسکے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ادھر نکل گئے ہیں۔ یہ دیکھو ان کی کار۔ کتنی خوبصورت ہے۔

سریش :۔ بہت ہی خوبصورت۔

رینا :۔ میں تمھیں ایک خوشخبری سناؤں بابو۔

سریش :۔ سناؤ۔

رینا :۔ سیٹھ جی کی نئی پکچر میں مجھے ہیروئن کا چانس مل گیا ہے۔ آج کنٹریکٹ

ہو گیا ہے ۔ دو ہزار روپیہ ایڈوانس دیا ہے سیٹھ جی نے۔ بقایا بارہ ہزار پکچر کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ بس اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

سریش :- ہاں اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ریتا :- میں نے سیٹھ جی سے تمہاری گیتوں بھری کہانی کی بات کی تھی۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ بابو۔

سریش :- ریتا۔

ریتا :- اب میں ایک بہت بڑی فلم سٹار بن جاؤں گی۔ اور تم ایک بہت بڑے گیت کار۔ یہ پھول تمہارے پاس ہونے چاہئیں۔ میں یہ پھول تمہیں پیش کرتی ہوں۔ ایک شاعر کو پیش کرتی ہوں شاعر اور نرگس کے پھول۔

[ ہنستی ہے ]

سریش :- یہ پھول مجھے پسند نہیں ریتا۔

ریتا :- کیوں پسند نہیں ؟

سریش :- میری طرح زرد ہیں۔ بیمار ہیں۔ کینسر کے مریض ہیں۔

ریتا :- کیا کہا ؟

سریش :- آج مجھے ڈاکٹر نے بتایا ہے میرے پھیپھڑے میں کینسر ہے۔

ریتا :- وہ تو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

سریش :- زندگی خطروں میں سانس لینے ہی کا نام ہے ریتا۔

ریتا :۔ اتنی تکلیف میں تم یہاں کیوں چلے آئے ؟

سریش :۔ ڈاکٹر نے کہا تھا سمندر کی ہوا میرے لئے بہت مفید ہے۔ چلا آیا۔

ریتا :۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے ڈاکٹر نے۔ سمندر اور شاعر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔

لہروں کا شور

سریش :۔ آہ ۔ آہ ۔ ریتا۔ ریتا۔ مجھے تھام لو۔ مجھے تھام لو۔

ریتا :۔ (گھبراہٹ میں) کیا ہے؟ بابو کیا ہے ؟

سریش :۔ میرے سینے میں سلگتا ہوا پھوڑا شاید پھٹ گیا ہے۔ درد سے میری جان نکلنے لگی ہے۔

ریتا :۔ سنبھلنے کی کوشش کرو بابو۔

سریش :۔ آہ ۔ آہ ۔ کتنا آرام ہے تمہارے سہارے میں۔ کتنا چین ملا ہے مجھے تمہارے ہاتھوں کے لمس سے۔ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے ؟

ریتا :۔ بس سٹاپ پر آکر رکی ہے۔ اس کی ٹیل لائٹ ہے۔

سریش :۔ یونہی سہارا دیئے ہوئے مجھے بس سٹاپ تک لے چلو۔ میں گھر جانا چاہتا ہوں۔

ریتا :۔ سیٹھ جی بس آنے ہی والے ہیں۔ اتنی دیر تم ان کی کار میں چل کے بیٹھو۔ میں ابھی تمھیں گھر لے چلوں گی۔

سریش :- اور قریب آؤ۔ ریتا اور قریب آؤ۔ سمندر سے ابھری ہوئی
ان چٹانوں کو دیکھو ایک دوسری سے کتنی قریب ہیں۔
ریتا :- ابھی چاند نکلے گا تو سمندر کے یہ نظارے اور بھی دلکش ہو جائیں گے۔
سریش :- یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ یہ شعلہ سا کیا لپکا ہے؟
ریتا :- کہاں؟
سریش :- تم نے نہیں دیکھا؟
ریتا :- میں نے نہیں دیکھا۔
سریش :- یہاں- ان چٹانوں کے درمیان ابھی ابھی ایک شعلہ سا لپکا
ہے۔ خون کی طرح سرخ شعلہ۔
ریتا :- یونہی تمہارا خیال ہے۔ آگ پانی میں نہیں بھڑک سکتی۔
سریش :- نہیں ریتا کچھ ہے۔ ضرور کچھ ہے۔
ریتا :- میں جھانک کر دیکھتی ہوں۔
سریش :- دیکھو- ضرور دیکھو ریتا۔

[لہروں کا شور- چیخ کی آواز]

سریش :- ڈوب گئی۔ شرارت کی پتلی ڈوب گئی۔ شاعر ڈوب گیا۔ ریتا
ہی نے اس کو جنم دیا تھا۔ ریتا ہی کی ایک شکل شاعر بن کر
میرے اندر جاگ اٹھی تھی۔ اس کی بانسری کی آواز اور آنکھوں
کے جادو نے مجھے مسحور کر لیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں
اس سے دور دور رہتا تھا۔ وہ آگے بڑھتی آ رہی تھی میں پیچھے

تنہا چلا جاتا تھا۔ ریتا نہ رہی شاعر بھی نہ رہا۔ ریتا مر گئی۔ شاعر مر گیا۔ دونوں مر گئے۔ مجھے ان کے عذاب سے چھٹکارا مل گیا۔ میں نے دونوں کو سمندر میں دھکا دے دیا ہے۔

[لہروں کے شور میں دبے دبے قہقہے]

سرلیش :۔ کون؟ کون؟ یہ کیا ہے؟ کون قہقہے مار رہا ہے؟ یہ تو شاعر کی آواز ہے۔ ہاں۔ وہی ہے۔ زندہ ہے۔ شاعر زندہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا ہونا نہ ہونا میرے ہونے نہ ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ریتا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں جب تک زندہ رہوں گا یہ زندہ رہیگا۔ قہقہوں کی یہ آوازیں سمندر سے نہیں میرے اندر سے آرہی ہیں۔ شاعر میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ گیتوں کی تلاش میں مجھے آوارہ پھرانے والا شاعر۔ میرا بیری۔

[منگو دادا آتا ہے]

منگو :۔ سرلیش بابو

سرلیش :۔ کون؟ دادا ہیں۔

منگو :۔ اپنے ساتھ آپ ہی کیا باتیں کر رہے ہو؟

سرلیش :۔ دکھ اور اندھیرے سے بھری ہوئی وہ زندگی جس میں شاعر جاگ اٹھے اور انسانیت درندے کا روپ دھار لے، زندگی

نہیں فریب زندگی ہے۔

منگو :۔ کیا مطلب ؟

سریش :۔ اب میرے پاس مطلب سمجھانے کا وقت نہیں ہے۔

منگو :۔ کہاں جا رہے ہو بالو ؟

سریش :۔ چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ان لہروں میں۔

منگو :۔ رک جاؤ۔ بالو رک جاؤ۔

سریش :۔ اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ زندگی سے زیادہ مجھے شاعر اور اس درندے نے پریشان کیا ہے۔ جو کل سے میرے دماغ کے پنجرے کو توڑ کر باہر نکل آیا ہے اور چیر نے پھاڑنے کے لئے اپنے نوکیلے پنجے تیز کر رہا ہے۔

[سمندر میں کود جاتا ہے۔ لہروں کا شور

فیڈ اوٹ]

# چھ فنکار

## کردار

پہلی عورت ——— رقاصہ
دوسری عورت ——— شاعرہ
تیسری عورت ——— ناول نگار
پہلا مرد ——— نقاد
دوسرا مرد ——— بُت تراش
تیسرا مرد ——— مصور

یہ سب ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہیں اور اپنے گرد و پیش کی کسی چیز سے بالکل متاثر نہیں۔ یہ سب بیئر اور شراب پیتے ہوئے اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ موضوع گفتگو ناول نگار عورت کا نیا ناول ہے۔ مصنفہ یہ چاہتی ہے کہ اس کے شاہکار کو کم از کم پانچ زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کی تخلیق، اس کا نیا مطالعہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی زندگی اور اس کے نئے رجحانات کا حامل ہے۔

نقاد :۔ فلم سٹار بننے سے پہلے مادام تمھیں میرا تازہ آرٹیکل ضرور دیکھنا چاہیئے۔

رقاصہ :۔ کونسا آرٹیکل ؟

نقاد :۔ فلمینیا

رقاصہ :۔ کیا مطلب ؟

نقاد :۔ اس کا مطلب ہے فلم سٹار بننے کا جنون۔ جس کا دوسرا نام ہے فلم فیور۔ یعنی فلمی بخار۔ جس کے جراثیم مائیکرو سکوپ سے بھی دیکھے نہیں جا سکتے۔ جو آنکھوں اور کانوں کے راستے فلم فینز کے دل و دماغ پہ حملہ کرتے ہیں۔

رقاصہ :۔ یہ لفظ کسی ڈکشنری میں تو دیکھا نہیں۔

نقاد :۔ یہ لفظ میری دریافت ہے۔

رقاصہ :- اس مرض کا علاج ؟
نقاد :- یہ لاعلاج مرض ہے۔
رقاصہ :- اس سے بچنے کا طریقہ ؟
نقاد :- فلمیں زیادہ دیکھنے سے پرہیز کیا جائے۔ اور ان سے متاثر ہوکر فلم سٹار بننے کے متعلق کچھ نہ سوچا جائے۔ ہر شخص سٹار نہیں ہو سکتا۔
مصور :- مادام نیٹا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟
نقاد :- اچھا ناچ لیتی ہے۔ نرتکی ہے ایکٹرس نہیں۔
مصور :- نرتکی اور ایکٹرس میں کتنا فرق ہے ؟
نقاد :- جتنا مونچھ اور چوٹی میں۔
بت تراش :- تمہارے اس آرٹیکل کا بہترین حصہ کونسا ہے ؟
نقاد :- جس میں فلمی بادن گزوں کا حدود اربعہ ہے۔
بت تراش :- فلمی بادن گزے کون ؟
نقاد :- وہ جو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، گھر میں بازار میں فلمی چکر میں رہتے ہیں۔ فلمی ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ فلمی گیت گاتے ہیں۔ نئی فلموں کے گیت۔ پرانی فلموں کے گیت۔ انہیں فلمی گیتوں کی چلتی پھرتی لائبریری بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو زندگی کو ایک فلمی گیت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں۔

بت تراش :۔ کیا چاہتے ہیں ؟

نقاد :۔ وہ چاہتے ہیں ان کی گردن پہ چہرے کی بجائے مووی کیمرہ، ساونڈ ٹریک یا ٹیپ ریکارڈ مشین ہونی چاہئے ۔ اور وہ دن رات گاتے رہیں ۔

بت تراش :۔ کیا گاتے رہیں ؟

نقاد :۔ زندگی کا فلمی کورس ۔ (گاتا ہے)

گائے جا اے دل گائے جا
کس کو پتہ ہے کل آئے کہ نہ آئے
اے میری زندگی
اے میرے فلمی گیت

بت تراش :۔ تمہاری آواز بڑی بھونڈی ہے ۔

نقاد :۔ تمہاری بھونڈی صورت کا سایہ پڑ رہا ہے اس پہ ۔

ناول نگار عورت :۔ ایسے لوگوں کا کوئی اور نام بھی تجویز کیا ہے تم نے؟

نقاد :۔ کئی نام رکھے جا سکتے ہیں ان کے ۔

ناول نگار عورت :۔ مثلاً

نقاد :۔ کومک ۔ کارٹون ۔ مسخرے وغیرہ ۔ ان میں کئی تو کنگھی شیشہ بھی اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں ۔

مصور :۔ وہ کیوں ؟

نقاد :۔ ہیر کٹ بال سنوارنے کے لئے ہیر ڈریسنگ کے بعد انہیں ایک

دورہ سا پڑتا ہے۔ جہاں ہوتے ہیں وہیں میک اپ
کرنے لگتے ہیں۔

مصور :۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

نقاد :۔ کیا معلوم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ زندگی انہیں دھوکہ دے رہی
ہے یا وہ زندگی کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ ننگے ہو کے
فلمی نان سین۔ بیجو باورے۔ ہز ماسٹرز وائس اور میگافون کے
فلمی ریکارڈ۔ نہ کوئی انہیں چابی لگاتا ہے۔ نہ کوئی ان کی
سوئی بدلتا ہے۔ لیکن وہ بج رہے ہیں۔ خود بخود بول
رہے ہیں۔ ساری رات۔ سارا دن۔ ساری زندگی۔ وہ
چاہتے ہیں بولتے رہیں۔ بجتے رہیں۔ گاتے رہیں۔
چلتے پھرتے گراموفون۔ شکل انسان کی اور باقی سب کچھ
گراموفون کا۔

[سب ہنستے ہیں]

بت تراش :۔ فوارے کے پاس گھومتے ہوئے آج تمہارے ساتھ کون
تھا؟

نقاد :۔ سیٹھ لام جی میم جی۔

بت تراش :۔ سیٹھ ٹ جی پ جی کے بھائی؟

نقاد :۔ ہاں وہی۔

بت تراش :۔ سیٹھ جی کے نام لام جی میم جی کے ساتھ اگر فون جی وائی جی

کا اضافہ ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

**نقاد** :- اگر ان کی زندگی کی بیمہ پالیسی پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے تو ٹھیک ہے

**بت تراش** :- نام کا نام معمے کا معمہ۔ بات کی بات۔ بجھارت کی بجھارت۔ اس ترقی پسند دور میں ہر چیز کا ایسا ہی کوئی نام ہونا چاہئے۔

**مصور** :- پھل اور پھول میں خوبصورتی کے لحاظ سے تو کچھ فرق نہیں۔

**بت تراش** :- بالکل نہیں۔

**مصور** :- تو پھر انسانوں یا حیوانوں کے نام پھلوں پر بھی کیوں نہیں رکھے جاتے۔ جیسے خربوزہ خان۔ مادام الیچی۔ مادام مونگ پھلی۔ لوکاٹ بیگم وغیرہ۔

**نقاد** :- پھل کھٹے اور کڑوے بھی ہوتے ہیں۔ سمجھے تم لوگ۔ میں ایک بہت بڑی بات کہہ رہا ہوں۔

**بت تراش** :- مگر سیٹھ جی کی دکان کے چھجے سے لگے ہوئے جہازی سائز کے بورڈ سے چھوٹی ہے۔

**نقاد** :- اور سیٹھ جی خود بھی بہت چھوٹے ہیں۔ بڑے مختصر۔ مونگ پھلی سے۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔

**بت تراش** :- ویسے تو وہ چوٹی کے ناشران میں سے ہیں۔ لاکھوں کتابیں لاکھوں کا بیوپار۔

**نقاد** :- کل سیٹھ جی بزم ادب کے جشن سالگرہ میں ایک بڑی دھواں دھار تقریر کر رہے ہیں۔

ناول نگار عورت :۔ کس موضوع پہ؟

نقاد :۔ فن اور فنکاروں پہ۔

ناول نگار عورت :۔ موضوع تو بہت اچھا ہے۔

نقاد :۔ تقریر انہیں میں نے لکھ کر دی ہے۔

ناول نگار عورت :۔ اس تقریر کے چند تراشے تو پیش کرو۔

نقاد :۔ تقریر یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ حضرات ہمارا ادارہ ہر ادیب اور شاعر کا اپنا ادارہ ہے۔ ہم ہر فنکار کو اس کی محنت کا معقول معاوضہ دینے کے حامی ہیں۔ تاکہ ہمارے ملک کے ہر فنکار کی زندگی خوشحال ہو جائے۔ اگر ہمارے فنکار بھوکے ننگے رہیں گے تو ہمارے ملک کا ہر آرٹ، ہر فن بھوکا ننگا ہو گا۔ ہم اپنے ملک کے فنکاروں کو زندگی کی شاخ سے ٹوٹے ہوئے خشک پتے نہیں بننے دیں گے۔ جنہیں بھوک و افلاس کا ہر جھونکا جدھر چاہے لے جائے۔

تالیاں

بت تراش :۔ تقریر تو بہت اچھی لکھی گئی ہے۔

نقاد :۔ لیکن سیٹھ جی کے بولنے کا انداز اچھا نہیں۔ بھدی آواز۔ بھدا لہجہ۔ ان کے سانس کے اتار چڑھاؤ سے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شکر قندی بیچ رہا ہے۔ تلفظ تو بڑا ہی معیوب ہے۔ فرقت کو پھر کت اور پسمل کو بچھومل کہتے ہیں۔

بت تراش :۔ سیٹھ سے کہہ کر مادام رضیہ کے ناول کی بات طے کرا دو نا۔

نقاد :۔ کیا کہوں اُن سے؟

بت تراش :۔ اُن سے کہو مادام رضیہ اس دور کی بہترین ناول نگار ہیں۔ اور ان کے ناول میں زندگی کی آگ بڑی تیز ہے۔

نقاد :۔ آگ کا نام سن کر تو وہ بوکھلا جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ارے بھئی آگ کو اس دکان سے دور ہی رکھو۔ یہاں ہزاروں ٹن کاغذ چھپا پڑا ہے۔

بت تراش :۔ تو پھر کسی مناسب طریقے سے ان کے ساتھ مادام رضیہ کے ناول کی بات کرو۔

نقاد :۔ وہ آجکل زیادہ تر جاسوسی ناول چھاپ رہے ہیں۔ یہ جاسوسی ناول کا دور ہے۔ کوئی ایسا جاسوسی ناول ہونا چاہیئے جس کے کم سے کم دو ہزار صفحے ہوں۔ کم سے کم دس ڈکیتی کی وارداتیں۔ کم سے کم بارہ نقب زنی کے واقعات۔ کم سے کم بیس پراسرار چوریاں۔ کم سے کم پندرہ اغوا کی وارداتیں۔ کم سے کم آٹھ قتل اور سراغ کسی ایک کا بھی نہ چلے۔ سیٹھ ایسا ناول چھاپنے کو فوراً تیار ہو جائے گا۔

بت تراش :۔ کیوں مادام رضیہ کیا خیال ہے؟

ناول نگار عورت :۔ سوچوں گی اس وقت تو میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔

نقاد :۔ اسپرد کھاؤ مادام ۔ اسپرد میں جادو ہے۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔
ناول نگار عورت :۔ اسپرد میں شاید لوہا ہو میں تو لوہے کی نہیں ہوں۔
بت تراش :۔ تم تو مکھن کی بنی ہوئی ہو مادام ۔ ایسا سفید جسم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارے گوشت میں سنگ مرمر ہے ۔
رقاصہ :۔ پھر تو مادام کو ناول نگاری کا تاج محل کہنا چاہیئے ۔
نقاد :۔ گوشت میں سنگ مرمر نہیں ہو سکتا ۔
رقاصہ :۔ ہو سکتا ہے ۔ انسان میں لوہا ہے ۔ گندھک ہے ۔ چونا ہے۔ فاسفورس ہے ۔ سنگ مرمر کیوں نہ ہوگا۔
مصور :۔ یہ دیکھیئے کتنی دلچسپ تصویر ہے ۔
رقاصہ :۔ یہ کس کی تصویر ہے ؟
مصور :۔ بارہ من کی دھوبن کی ۔
رقاصہ :۔ مجھے تو یہ بارہ ٹن کی معلوم ہوتی ہے ۔

[ سب ہنستے ہیں ۔ پس منظر میں موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں ابھرتی ہیں ]

بت تراش :۔ بادل ۔ بارش ۔ دھند ۔ بہت بور کرنے والی چیزیں ہیں ۔
مصور :۔ خاص کر دسمبر اور جولائی کی یہ بارشیں ۔ یہ بادل جو سورج کو اغوا کر کے کئی کئی دن تک نہ جانے کہاں لے جاتے ہیں ۔
بت تراش :۔ یہ کالے کالے بھورے بھورے بادل بوند بوند بلکہ بوند کا بھی بیسواں حصہ ہو کر ٹپکتے ہیں ۔ گہرے ہوتے چلے جاتے

ہیں۔ جھکتے چلے آتے ہیں۔ ہر چیز گیلی گیلی، ٹھنڈی ٹھنڈی دھندلی دھندلی نظر آتی ہے۔ ایسا ماحول، ایسا موسم مجھے سخت ناپسند ہے۔

مصور :۔

بت تراش :۔ ایسے ماحول، ایسے موسم میں نروس ہو جاتا ہوں میں۔ ٹھنڈی ایریٹیل ہوائیں گلیوں اور بازاروں کو بے رونق بنا دیتی ہیں۔ کیچڑ، پانی، دھند اور بھیگے ہوئے، ٹھٹھرے ہوئے خشک پتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

مصور :۔ نزدیک اور دور۔ دور اور نزدیک کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ ٹھکنی کلر چہرے، نہ مسکراتی ہوئی لپ اسٹکیں۔ نہ میکس فیکٹر کے گنگناتے ہوئے شیڈ۔ نہ برجستہ دلفریب شعر کہتی ہوئی تھرڈ ڈائی منشن الف لیلوی آنکھیں۔

بت تراش :۔ جو ہر سنٹی مینٹل کو سندباد جہازی بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

مصور :۔ اور نہ کاجل کی کالی کالی لکیروں میں جلتے بجھتے جگنو۔ الہ دین کے میجک لیمپ۔

بت تراش :۔ اور نہ کاروں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے کوسس میٹک، ایڈمیٹک ستارے۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا ایسے ماحول، ایسے موسم میں۔

مصور :۔ ہر چیز بور نظر آتی ہے۔ بوریت کی انتہا ہو جاتی ہے۔

بت تراش :۔ گلیوں اور بازاروں کے ٹکنی کلر جگنو اور کاسمیٹک ستارے سردی سے نہ جانے کہاں سمٹ جاتے ہیں۔

مصور :۔ یہ سڑکیں، یہ پارکیں۔ یہ زندگی بالکل خالی خالی نظر آتی ہے۔ ادبی فراڈ۔

بت تراش :۔ جیسے ٹافی اور چاکلیٹ کے وہ خوشنما کور جو اندر سے خالی ہوں لیکن بڑے اہتمام سے شیشے کے کنٹر میں رکھے ہوں۔

مصور :۔ ٹافی۔ چاکلیٹ اور چیونگ گم نہ صرف میری ریفریشمنٹ بلکہ

ڈائٹ ہیں۔ خالی کوروں سے میری تسلی نہیں ہوتی۔
بت تراش :۔ اور وہ اس لئے کہ تمھیں ہر وقت جگالی سی کرتے رہنے کی عادت ہے۔ اسی لئے تو چیونگ گم بہت پسند کرتے ہو۔
مصور :۔ کیوں نہ پسند کروں اس کے بغیر تو زندگی مجھے بلیک اینڈ وائٹ میں ایک ٹریجڈی نظر آتی ہے۔
نقاد :۔ اس بوتل کا لیبل تو ذرا پڑھنا جی۔
مصور :۔ خود ہی پڑھ لو۔ میں اپنی عینک گھر پر بھول آیا ہوں۔
بت تراش :۔ تو مادام رضیہ کی گاگل لے لو۔
مصور :۔ اس بوتل میں کیا ہے ؟
نقاد :۔ دوائی ہے۔
مصور :۔ کیسی دوائی ؟
نقاد :۔ مجھے دمے کی شکایت ہو گئی ہے۔
مصور :۔ ہری چھال کے کیلے کھایا کرو۔ وٹامن اے، بی، سی، ڈی تمھارے لئے بہت مفید ہیں۔
نقاد :۔ انگریزی کا پورا قاعدہ ہی نہ پھانک لوں کسی دن فرصت میں۔
مصور :۔ کوئی ہرج نہیں۔ لیکن کسی ڈاکٹر کو کنسلٹ کر لینا۔ اُسے پھانکنے کے اوقات اور مقدار وہ تجویز کرے گا۔
ناول نگار عورت :۔ ایک چیز میں بھی تمھارے لئے تجویز کرتی ہوں۔
نقاد :۔ وہ کیا ؟

نادل نگار عورت :۔ صبح کے وقت باغ کی سیر کیا کرو۔ تازہ ہوا لیا کرو۔
میرے ناول کا ایک مرکزی کردار تم سے بہت ملتا جلتا ہے
بت تراش :۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ مادام رضیہ کا ناول اس صدی کا
بہترین ناول ہے تم اپنے دوست سیٹھ سے کہو اُسے چھاپے
نقاد :۔ تم حسب عادت جھک مار رہے ہو ناول بالکل تھُس ہے۔ زندگی
سے خالی۔ زندگی سے دور۔ جس کے سبب کردار بیمار
ہیں۔ اعصاب زدہ ہیں۔ اندھیروں کے مسافر۔
مصور :۔ اس دور کا ہر انسان اندھیروں کا مسافر ہے۔ اس کی مشکلات کا حل
حوّا اور آدم کے جسم میں نہیں بلکہ سرمایہ کی صحیح تقسیم میں ہے۔
شاعرہ :۔ میرا تو خیال ہے چاند میں ہے۔ اس کا حل اسپٹنک میں ہے۔
خلا پیما راکٹوں میں ہے۔ سرخ سویرے میں ہے۔
نقاد :۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ دھرتی پر اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
مصور :۔ یہ بکواس ہے۔ ایک بہت بڑی بکواس۔ سُرخ بکواس
بت تراش :۔ بکواس سرخ نہیں ہو سکتی۔
مصور :۔ اگر سفید جھوٹ ہو سکتا ہے تو سرخ بکواس بھی ہو سکتی ہے۔
اس معاملے میں تم بڑے تنگ نظر ہو۔
ناول نگار عورت :۔ دیکھئے۔ سنیے۔ آپ لوگ اس وقت فلسفہ
چھانٹتے ہوئے الجھ رہے ہیں۔ الجھا رہے ہیں۔ میرے
خیال میں میں نے اپنے ناول میں آج کے انسان کے

صرف ایک طبقہ کی عکاسی کی ہے۔ جو میرے خیال میں
ہے اور نہیں ہے۔ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔
میں نے نہایت چابکدستی سے اس نازک موضوع کو نباہا
ہے۔ ایک عورت ایک حوا۔

بت تراش :- سموسے کھائیے مادام۔ بڑے لذیذ ہیں۔
شاعرہ :- سموسہ کس چیز سے بنتا ہے؟
ناول نگار عورت :- گندم سے۔
نقاد :- میں گندم نہیں کھاتا۔
شاعرہ :- کیوں؟ گندم میں کیا ہے؟
نقاد :- ایک بہت بڑا خطرہ۔
شاعرہ :- کیسا خطرہ؟
نقاد :- گندم کھانے سے آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔
شاعرہ :- بے فکر رہیں آپ کو اس کلب سے کوئی نہیں نکالے گا۔
مصور :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ چنے کے ہوتے ہوئے آدم نے گندم
کیوں کھائی جبکہ چنا گندم سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔
شاعرہ :- آدم نے نہ تو گندم کھائی تھی اور نہ چنا۔
مصور :- تو پھر اس نے کیا کھایا تھا؟
شاعرہ :- ایک رنگین فریب کھایا تھا آدم نے۔

[سب ہنستے ہیں]

نقاد :۔ تمہارے شاہکار کا کیا ہوا؟

بت تراش :۔ اکادیمی نے بیس ہزار روپے کی پیش کش کی ہے۔

نقاد :۔ پھر؟

بت تراش :۔ امید ہے پچیس ہزار پر فیصلہ ہو جائے گا۔

نقاد :۔ تو پھر مبارک ہو۔

بت تراش :۔ لیکن اس میں ایک بڑی الجھن ہے جی۔

نقاد :۔ الجھن کیسی؟

بت تراش :۔ اکادیمی مجھ سے مستقل حقوق مانگتی ہے۔

نقاد :۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

بت تراش :۔ مجھے یہ بالکل منظور نہیں۔

نقاد :۔ تم اگر ڈٹے رہے تو اکادیمی تمہاری شرائط مان لے گی؟

بت تراش :۔ اس کا باوا آدم بھی مانے گا۔

نقاد : وہ کیسے؟

بت تراش :۔ تم بھی بس بالکل وہ ہو یعنی اندھیروں کے مسافر۔

نقاد :۔ لیکن تمہارا وہ شاہکار کیا ہے؟

بت تراش :۔ ہاتھی۔

نقاد :۔ اونٹ کیوں نہیں؟

بت تراش :۔ شتر غمزے بڑے دکھاتا ہے۔

نقاد :۔ کوئی کل سیدھی جو نہیں اُس کی۔

مصور :- اونٹ کا کوہان اونٹ سے زیادہ عجیب ہے۔
نقاد :- تم نے اپنا شاہکار بڑا کوٹا میں تراشا ہے یا مرمر میں ؟
بت تراش :- مرمر میں۔
مصور :- بالکل نئی چیز ہے۔ جدت ہے۔
شاعر :- یقیناً یہ ایک نئی چیز ہے۔
نقاد :- اور تخئیل اس میں کیا ہے ؟
بت تراش :- ہاتھی ناچ رہا ہے۔ گنے کھا رہا ہے۔
شاعرہ :- بالکل نیا تخئیل ہے۔ بورژوائی تخئیل
ناول نگار عورت :- اس مجسمے کے دائمی حقوق ہرگز ہرگز نہ دینا جی۔
تیس ہزار اس تخئیل کی کم قیمت ہے۔
بت تراش :- ایک اور بڑی الجھن ہے جی۔
نقاد :- وہ کیا ؟
بت تراش :- جس ہاتھی کو میں نے ہاتھی دانت میں تراشا ہے وہ
پیاری امبا کا ہاتھی ہے۔
شاعرہ :- امبا کون ؟
نقاد :- ہو گی کسی ہاتھی بان کی بیٹی۔
شاعرہ :- امبا سے تمہیں کیا نسبت ہے ؟
بت تراش :- میں چاہتا ہوں اس سے میری نسبت ہو جائے
مصور :- بس تو پھر اس مجسمے کی قیمت میں دس ہزار روپے کا اور

اضافہ کردو۔

شاعرہ :۔ بیشک۔ بیشک۔ پیار بھی ایک فن ہے۔ اور بورژوائی نقطہ نظر سے کوئی بھی فن بے مول نہ بکنا چاہیئے۔

بت تراش :۔ لیکن ایک اور بڑی الجھن ہے جی۔

نقاد :۔ وہ کیا؟

بت تراش :۔ رات میرے نگار خانے میں آگ لگ گئی۔ ہاتھی دانت کا ہاتھی جل گیا۔ صرف اگلے دو دانت بچے ہیں۔

نقاد :۔ اور تمہارے بھی اگلے دو دانت نہیں ہیں۔ کتنا خوشگوار حادثہ ہے۔

سب ہنستے ہیں

نقاد :۔ تمہارے نئے مطالعے کا موضوع کیا ہے جی؟

مصور :۔ اندھیرے اجالے۔

شاعرہ :۔ اچھا عنوان ہے۔

ناول نگار عورت :۔ جب تم کوئی تصویر بناتے ہو تو کیا محسوس کرتے ہو؟

مصور :۔ میں اس وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس وقت کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ جیسے مجھے کلوروفارم سونگھا دیا گیا ہو۔

نقاد :۔ تمہاری یہ تصویر نامکمل ہے۔

مصور :۔ نامکمل کیسے ہوئی؟

نقاد :۔ اندھیرے نہیں ہیں اس میں اجالے ہی اجالے ہیں۔

شاعرہ :۔ کیا یہ تصویر تمہارا اپنا مطالعہ ہے؟

نقاد :۔ میرا نیا مطالعہ ڈوڈاوسکی ہے۔

شاعرہ :۔ وہ کون ؟

مصور :۔ ایک نوجوان اندھی بھکارن جو حاملہ ہو گئی۔

نقاد :۔ تمہاری اُس تصویر کا عنوان کیا ہے ؟

مصور :۔ ننگی دھرتی۔

نقاد :۔ تمہاری کوئی تصویر ہماری سمجھ میں تو کبھی آئی نہیں۔ جہاں ناک ہونا چاہیئے وہاں تم آنکھ بنا دیتے ہو۔ اور جہاں کان ہونے چاہیئیں وہاں ہونٹ ہوتے ہیں۔ عجیب مصوری ہے۔

مصور :۔ میں اس زمانے کا مصور نہیں ہوں۔

نقاد :۔ اور کس زمانے کے مصور ہو تم ؟

مصور :۔ مجھے آج سے دو سو سال بعد آنا چاہیئے تھا۔

نقاد :۔ اس وقت تو شاید نہ زمین ہوگی نہ زندگی۔

مصور :۔ لیکن وقت ہوگا۔

شاعرہ :۔ تمھیں اپنے زمانے میں آنا چاہیئے تھا۔

مصور :۔ کون مردود یہاں آنے پر راضی تھا۔ میرے ساتھ تو کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔

شاعرہ :۔ کیسا حادثہ ؟

مصور :۔ اس کا جواب صرف وہ عورت اور مرد ہی صحیح دے سکتے ہیں جنھوں نے مجھ سے پہلے اس حادثہ کو جنم دیا۔

شاعرہ :۔ بہت اونچا تخیل ہے۔
ناول نگار عورت :۔ بہت بڑی بات ہے۔ سمندر اور آسمان سے بھی بڑی بات۔
بت تراش :۔ ایسے تخیل تمہارے ذہن میں کہاں سے آتے ہیں؟
مصور :۔ جہاں سے زندگی آتی ہے۔
نقاد :۔ تمہاری تصویروں میں چہروں کے نقوش ٹیڑھے میڑھے کیوں ہوتے ہیں؟
مصور :۔ زندگی ابتدا میں ایسی ہی تھی۔
نقاد :۔ تم اس وقت کہاں موجود تھے؟
مصور :۔ وقت میں۔
شاعرہ :۔ اور وقت کیا ہے؟
مصور :۔ اس کے لئے تم میری تصویر دائرے دیکھو۔
نقاد :۔ اور اگر اس سلسلے میں زندگی کا کوئی کیلنڈر۔ کوئی ٹائم ٹیبل دیکھ لیا جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟
مصور :۔ ہرگز نہیں۔ پسند اپنی اپنی۔
نقاد :۔ تمہاری تصویروں میں زندگی اصلی زندگی سے مختلف کیوں ہے؟
مصور :۔ اس لئے کہ میرا فن دوسرے فنکاروں سے مختلف ہے۔
نقاد :۔ تمہاری تصویریں ننگی کیوں ہوتی ہیں؟
مصور :۔ زندگی میرے تخیل میں ننگی یا ایسی ہی ہے۔

شاعرہ :- بورژوائی تخیئل ہے۔

ناول نگار عورت :- بورژوائی زندگی۔

نقاد :- بورژوائی موت۔

بت تراش :- اور مادام رضیہ کے دو بورژوائی بو سے۔کیونکہ میں اس کا ناول دو زبانوں میں ترجمہ کر رہا ہوں۔

شاعرہ :- تم بہت اونچے فنکار ہو۔

رقاصہ :- اس لئے کہ تمھیں سمجھا نہیں جا سکتا۔

نقاد :- اس لئے کہ لوگ تمہارے متعلق سوائے اونچے پن کے اور کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

شاعرہ :- ویٹرس۔

ویٹرس :- یس سر۔

شاعرہ :- ایک کنیڈا ڈرائی۔

ناول نگار عورت :- ایک سیون اپ۔

نقاد :- ایک شمپین

بت تراش :- ایک کوکٹیل۔ ہلکا سا پگ

مصور :- ایک ہیگ اینڈ ڈونٹ بی ڈیگ۔

نقاد :- آج دھرتی کے دیوتا پئیں گے۔ زیادہ سے زیادہ پئیں گے۔ اور ناچیں گے۔

بت تراش :- مادام رضیہ کا ناول اور سات زبانوں میں ان کے تراجم بھی

ناچیں گے۔ شاعرہ کی غزلیں، نظمیں اور گیت بھی ناچیں گے۔
رات بڑی دلکش ہوتی جا رہی ہے۔ بورژوائی رات۔ بورژوائی
چاند۔ بورژوائی ستارے۔ ان سب کو دھرتی پر آنا ہوگا۔

[سب ہنستے ہیں]

[شاعرہ دھیمے دھیمے سُروں میں کچھ گنگناتی ہے]

مصور:۔ تم بڑی حسین ہو شاعرہ۔ بڑی دلکش و دلفریب ہو۔ جیسے ایوننگ ان پیرس کا سنٹ۔ لکس ٹائیلٹ سوپ۔ پونڈز کی کولڈ کریم۔ ڈالڈیل کا شمپو۔ کڈبری کے چاکلیٹ۔ جیسے عمر خیام کی رباعی۔

ناول نگار عورت:۔ تمھیں دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں عورت سے مرد بن گئی ہوں۔

نقاد:۔ ویسے بھی تمھیں عورت تو نہیں کہا جا سکتا۔ تم اگر اپنے آپ کو اپنی ڈرائنگ میں دیکھ لو گی تو مجھ سے اتفاق کرو گی۔ مصور سے کہو تمھیں تمہاری ڈرائنگ میں دکھائے۔

مصور:۔ بس بہک گئے نا۔

نقاد:۔ بہکا نہیں میں اپنا دل بہلا رہا ہوں۔

مصور:۔ شاعرہ تم بڑی رومانٹک ہوتی جا رہی ہو۔

نقاد:۔ اور میری طبیعت بھی آجکل تنقید سے ہٹ کر رومان کی طرف آرہی ہے۔ بڑی ایڈوانس ہو تم۔

شاعرہ :- کیا ایڈوانس پکنگ کا خیال ہے ؟
مصور :- تم کیا پینا پسند کروگی ؟
شاعرہ :- جو تم پی رہے ہو۔
مصور :- میں اپنا خون پی رہا ہوں۔ دھرتی کا خون پی رہا ہوں۔ انسانوں
کا خون پی رہا ہوں۔
شاعرہ :- بس تو پھر ٹھیک ہے۔
مصور :- ویٹرس۔
ویٹرس :- یس سر۔
مصور :- ایک باٹلی تازہ خون۔ اپنا خون۔ ہمارا خون۔ ساری دھرتی کا خون۔
ویٹرس :- تازہ خون کے لئے بلڈ بنک ڈونر یر ونائن کو فون کیجئے۔
بت تراش :- شاعرہ اپنا وہ شعر تو گنگنانا۔
شاعرہ :- کونسا شعر ؟
بت تراش :- صبح اپنی گرگابی پالش کرتے ہوئے جو شعر گنگنا رہی تھیں۔
رقاصہ :- شعر نہیں۔ مادام سے کوئی تازہ نظم سُنیئے۔
مصور :- ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔
شاعرہ :- ان گنت صدیوں کے لوک گیت۔ لوک ناچ۔ میرے اس
بیگ میں پنگھٹ ہیں۔ پنہاریں ہیں۔ لہلہاتے ہوئے
کھیت ہیں۔ گھونگھٹ ہیں۔ ساگر ہیں۔ آکاش ہے۔
دھرتی ہے۔

نقاد :۔ تو پھر دور سے دھرتی کے اُس کنارے کی جھلک ہمیں بھی دکھانا۔
مصور :۔ مادام بس اب اور نہ تڑپاؤ۔ جلدی سے اپنی کوئی نظم سناؤ۔
شاعرہ :۔ عرض کیا ہے۔
مصور :۔ ارشاد — ارشاد۔
شاعرہ :۔ چھن چھن چھن
مصور :۔ یہ مصرعہ چھنکا ہے یا مادام کی پازیب کا کوئی گھنگرو ؟
شاعرہ :۔ دل کی زنجیر کھڑک رہی ہے آج

چھن چھن چھن
بھاگ کر پس دیوار کوئی آیا ہے
دور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
ہر طرف چھائے ہوئے سناٹے
اندھیرے
کسی پازیب کی جھنکار سے جل اٹھیں گے
یہ تخیل کی سحر کاری نہیں اور نہ فریب
بھاگ کر پس دیوار کوئی آیا ہے
یہ کسی مرمری پیکر کا حسیں سایہ ہے
چھن چھن چھن
کھل گیا ہے دروازہ

[ تالیاں - ہاؤ ہو کا شور ]

مصور :- مثالی نظم ہے۔ طلسمی نظم ہے۔

بت تراش :- بورژوائی نظم ہے۔

ناول نگار عورت :- کلاسیکی نظم ہے۔ میکانیکی نظم ہے۔

نقاد :- یہ نظم نہیں نئی شاعری کا بے مہار اونٹ ہے۔ جس کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں۔ بیٹھ جاتا ہے جہاں جی چاہے۔

[موسیقی کی آوازیں پس منظر سے اُبھر کر پھر مدہم پڑ جاتی ہیں۔]

اناؤنسر :- لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ ہمارا آج کا پروگرام یہ ہے۔ حسب معمول سنڈے نائٹ ٹکنی کلر پروگرام۔ روزانہ پروگرام سے بالکل مختلف۔ سب سے پہلے مس نیٹا کا ڈانس ہوگا۔ یہ آج رمبا پیش کر رہی ہیں۔ ان کے ڈانس کے ساتھ ساتھ مس ماتھر مس ٹھاپر دونوں بہنیں فلمی گیت گائیں گی۔ پھر سیکسوفون پر ایک طربیہ۔ ایک سانیٹ۔ ایک جلیبی۔ پھر ایک کیبرے اور آخر میں کھُلا ناچ۔ لیجئے اب تھوڑی دیر میں پروگرام شروع ہوتا ہے۔

| موسیقی کی آوازیں اُبھر کر مدہم پڑ جاتی ہیں |

نقاد :- مادام یہ نظم کس کی ہے ؟

شاعرہ :- الفاظ میرے اپنے ہیں۔

نقاد :- یہ الفاظ بھی تمہارے نہیں ہو سکتے۔

شاعرہ :- آواز میری اپنی ہے۔
نقاد :- یہ آواز بھی تمہاری نہیں ہے۔
شاعرہ :- تو پھر یہ کون بول رہا ہے میرے اندر؟
نقاد :- کوئی بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔
شاعرہ :- تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟
نقاد :- یہ سب کچھ کچھ بھی نہیں ہے۔ فریب۔ دھوکہ۔ چھل۔
مصور :- تم قنوطی ہو۔ اخلاقی کنگال ہو۔
بت تراش :- تم خبطی بھی ہو۔ سڑی بھی ہو۔ سودائی بھی۔
رقاصہ :- دل دکھانے کی باتوں کے سوا تمھیں کچھ آتا ہی نہیں۔
ناول نگار عورت :- جیولیس سیزر بھی خبطی تھا۔ سڑی تھا۔ سودائی تھا۔
دوسروں کو آزار پہنچا کر اُسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔
رقاصہ :- جبھی تو اُسے منظر عام پر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔
ناول نگار عورت :- بڑی زہریلی تنقید کرتے ہو تم۔ زہر میں بجھے ہوئے
خنجر چبھوتے ہو۔
شاعرہ :- تمہاری باتوں سے خون کی بُو آتی ہے۔
بت تراش :- قتل کر دو۔ اسے قتل کر دو۔
مصور :- پھولوں کی پنکھڑیوں کو چیرنے پھاڑنے والے اس درندے کو
آج میں چیر پھاڑ دوں گا۔ کھانا کھانے والی اس چھُری سے
آج میں وہی کام لوں گا جو جیولیس سیزر کے قاتلوں نے

خنجر سے لیا تھا۔

بت تراش :۔ تم اگر ایسا کرو گے تو فنون لطیفہ پر بڑا احسان کرو گے۔

مصور :۔ تم نے شاعری کی ہتک کی ہے۔ میری محبت کا مذاق اُڑایا ہے۔
میں ابھی تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گا۔

نقاد :۔ (چیختے ہوئے) بچاؤ۔ بچاؤ

[شور و شغب]

اناؤنسر :۔ ویٹرس

ویٹرس :۔ یس سر

اناؤنسر :۔ (گھبراہٹ میں) جلدی سے ہنگامی پولیس اسٹیشن کو فون کرو۔

ویٹرس :۔ یس سر

بت تراش :۔ (قہقہہ مارتے ہوئے) ٹھہرو رک جاؤ۔ پریشان نہ ہوں
آپ لوگ۔ ہم اس ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ جسے
ہم سب فنکار اس کلب کی اسٹیج پہ پیش کرنے والے
ہیں۔

[پس منظر سے موسیقی کی آوازیں ابھرتی ہیں]

# افسانے

۱۔ آم کی گٹھلی

۲۔ آرک لائٹ

۳۔ ایک کے بعد ایک

۴۔ گل رخ

۵۔ موم بتی

۶۔ دلربا

# حرفِ اول

کچھ عرصہ ہوا اُردو کے نوخیز افسانہ نگار آغا اشرف نے مجھے اپنے چند مطبوعہ افسانے پڑھنے کے لئے دئیے تھے۔ میں نے انہیں پڑھ کر محسوس کیا ہے کہ مصنّف نے نہایت دُور اندیشی کے ساتھ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو ایک ہی موضوع کی حدود میں محصور کر دیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی نگارشِ لطیفہ میں فنّی منطق اور جغرافیائی حقائق پر اچھے افسانے لکھنے والوں کی صف میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

اس جادۂ فن پر منٹو نے جو آثارِ سفر چھوڑے ہیں، وہ قابلِ مطالعہ ہیں اور آغا اشرف کو انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اِن افسانوں میں وہ منٹو کے بہت قریب ہیں۔

(مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم)

یہ انشا پرداز (آغا اشرف) جذبات انسانی کی گہرائیوں کو ٹٹولنے اور موثر طریق پر انہیں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(اقتباس از تبصرہ) (مولانا) عبدالمجید سالک مرحوم)

# "آم کی گٹھلی"

کالی گھٹا چھائی تھی۔ پروا کے بھیگے بھیگے جھونکے یوں چھنک رہے تھے۔ جیسے کسی چنچل چھوری کی چھاگل کے گھنگرو اس کی گوری گوری پنڈلی سے ٹکرا کر چھنک جائیں۔ مادھو مالی آموں کا ٹوکرا اٹھائے چونگی کے چوراہے میں آبیٹھا۔ اور ہانکا دینے لگا۔

"آم سندھوری آم۔ مصری کی ڈلیاں۔ شہد کے ڈونے۔ برکھا نے رس ٹپکایا۔ مادھو مالی چُن چُن لایا۔"

سندھوری آم مادھو مالی نے ٹوکرے میں بڑے قرینے سے چُنے ہوئے تھے۔ جیسے ہونٹ کے اوپر ہونٹ دھرا ہو۔ کہیں کہیں کسی آم کے ساتھ ہرا پتہ چپکا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر یہی گماں ہوتا تھا کہ کسی پری زاد کے چہرے پر سبزہ خط کا نشان ہے۔ آموں کی میٹھی میٹھی مہک نے چونگی کے چوراہے کو مہکا دیا تھا۔

"ارے مادھو کے سیر دیئے ہیں شہد کے ڈونے؟" مادھو کے پرانے گاہک مرلی دھر نے پوچھا۔

"بہت سستے۔" مادھو نے جواب دیا۔ "کوڑیوں میں باغ لٹا دیا ہے۔ اوروں سے ڈھائی آنہ آپ سے دو۔"

"ارے مادھو اتنے مہنگے۔ تو آم بیچتا ہے رس گلے؟" مرلی دھر نے طنز کی۔

"کوی جی رس گلے ان آموں کے آگے کیا چیز ہیں۔" مادھو نے آم اٹھا کر انگلیوں کی پوروں پہ دھرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو نا کیسر کی کلی۔ یہ کھاکی بیر بہوٹی۔ ایک حسیکی تو لے کر دیکھو۔ بوسے کا مزا نہ آئے تو کوڑی نہ لوں گا۔"

"دکھلا تو بھلا۔" مرلی دھر نے آم لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"سخت ہاتھ نہ لگانا کوی جی۔ کانچ کی کلی بڑی نازک ہے۔" مادھو نے آم اس کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے مادھو یہ تو داغی ہے۔" مرلی دھر نے کہا۔

"یہ دیکھ داغ۔"

"اجی واہ۔ کیوں خواہ مخواہ میری ہوا خراب کرتے ہو کوی جی۔ یہ داغ نہیں کوئل کے بوسے کا نشان ہے۔" مادھو مالی نے کہا اور مرلی دھر پھڑک اٹھا۔ آخر شاعر تھا۔ کہنے لگا۔

"مادھو تول دے دو سیر کوئل کے بوسے۔ رام جانے بات نہیں کہی تو نے ایک شعر کہا ہے۔"

مادھو نے دو سیر آم تول دیئے۔ مرلی دھر گیا تو چمپا کولہے مٹکاتی آگئی۔

"مادھو آج تو آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ بولو کھلاؤ گے؟" چمپا نے آنکھوں میں آموں کا رس چھلکاتے ہوئے کہا۔

"کھالو جتنے جی چاہے۔" مادھو نے کہا۔ "ٹوکرا تمہارے آگے دھرا ہے۔"

"آم ایسے نہیں کھائے جاتے۔" چمپا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"یوں مزا نہ آئے گا۔"

"مزا پھر کیسے آئے گا؟" مادھو نے پوچھا۔

"میرے چبارے میں آؤ گے تو بتاؤں گی۔"

"اچھا تو میں آؤں گا۔"

"کب آؤ گے؟"

"آم بیچ کر۔"

"آم کب بکیں گے؟"

"ابھی بک جائیں گے۔ چھینٹے پڑنے کی دیر ہے۔"

"اچھا تو میں جا کر میٹھے پکوان بناتی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" مادھو نے کہا۔ "تم جا کر پکوان بناؤ۔ میں اتنے میں آم بیچ کر آجاؤں گا۔"

"ذرا جلدی کرنا۔" چمپا نے جاتے ہوئے تاکید کی۔

"مادھو کے آم بہت جلدی بک جاتے ہیں۔ متھرا کے پیڑے بیچتا ہے مادھو۔ یہ آم لیتی جاؤ برف میں لگا دینا۔" مادھو نے کہا۔ اور اپنی مرضی کے اچھے اچھے آم چن کر ٹوکری میں ڈال دیئے۔ چمپا آم لے کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مادھو پھر ہانکے دینے لگا۔ اور آموں کے گاہک دھڑا دھڑ آنے لگے۔ ٹوکرا رفتہ رفتہ خالی ہونے لگا۔ برکھا کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔

مادھو چمپا کی پڑوسن مالتی کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ مالتی کسبن مادھو پور

رہنے والی تھی۔ بڑی تیز طرار۔ کہتے تھے اس میں مادھوپور کی ربڑی کی مٹھاس تھی۔ اُسے بہت سے فلمی گیت یاد تھے۔ وہ فلمی گیتوں کا چلتا پھرتا سنگیت تھی۔ کاٹھ بازار کے کن رسیوں نے اس کا نام سارنگی رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے گلے میں سارنگی کے پردے لگے ہوئے تھے۔ بڑی سُریلی تھی اس کی آواز۔ لیکن ہر شخص کن رسیا نہیں ہوتا۔ سُر کی پہچان بڑی مشکل ہے۔ بجانے کے شوق میں مادھو نے عطائیوں والا ہاتھ مارا تو گیتوں بھری اُس سارنگی کے سارے سُر خراب کر کے رکھ دیئے۔ گیت بیمار ہو گئے۔ مالتی اس سے ناراض ہو گئی۔ ویسے دیکھنے میں تو مادھو ٹڑا پتلا دبلا ماشہ بھر کا انسان تھا۔ لیکن نہ جانے اس میں یہ کیا بات تھی کہ کوئی بھی کسبن دوبارہ اُس سے آنکھ نہ ملاتی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دُور سے اُسے سلام کر دیتی تھی۔ اس کے بعد مادھو کئی بار مالتی سے ملنے آیا لیکن اس نے سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ آخر مادھو نے بھی دل میں یہ بات پکی کر لی کہ دل لگی کے لئے اب کوئی نئی دنیا ہی دیکھیں گے۔

کئی دنوں سے اس کی نظر میں چمپا کے نقشے اترنے لگے تھے۔ مالتی اگر مولسری کا پھول تھی تو چمپا بھی چمپا کلی تھی۔ اور پھر سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ اس کے منہ میں مینا کی زبان تھی۔ جب وہ مٹک مٹک کر باتیں کرتی تھی۔ تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لفظوں کو چوم چوم کر ادا کر رہی ہو۔

پہلے دن جب مادھو نے اس کے ساتھ تعارفی گفتگو کی تو اس نے مادھو کا من موہ لیا۔ اور وہ چمپا کا چکور بن گیا۔ اس نے چمپا سے کہا۔

"چمپا مجھے اپنا بنا لو۔"

اور چمپا نے جواب دیا۔ "میں تمھیں اپنا ہی سمجھتی ہوں مادھو۔ پر تو بھی اپنوں کی سی بات تو کر۔"

"بتاؤ میں کیا کروں"؟ مادھو نے کہا۔ "مجھے اپنے دل کی بات بتا دو۔"

"مجھے آرسی اور چھوسے لا دسے۔" چمپا نے کہا۔

"اچھا تو لا دوں گا۔ مجھے ایک ہفتہ کی مہلت دے دو۔"

اور آج اس وعدے کی میعاد گزر چکی تھی۔ آموں کا تو ایک بہانہ تھا۔ چمپا تو در اصل اُسے اس کا وعدہ یاد کرانے آئی تھی۔ اور اسی لئے اُسے اپنے چبارے میں بلا گئی تھی۔ مادھو ساری بات سمجھ گیا تھا۔ لیکن اب کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ آٹھ دنوں میں اُس نے کافی رقم جمع کر لی تھی۔

پروا کے جھونکے چھنک رہے تھے۔ ننھی ننھی بوندوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ گھٹاؤں سے چمپا کی کلیاں برس رہی ہیں۔ اور مادھو کو یوں محسوس ہوا جیسے چمپا ساری چیزیں تیار کر کے چبارے میں بیٹھی اُسے یاد کر رہی ہے۔ اُسے بُلا رہی ہے کہ مادھو اب آ بھی جاؤ۔ یہ کالی گھٹائیں یونہی نہ گزر جائیں۔ پروا کی پائل کے گھنگرو کبھی کبھی چھنکا کرتے ہیں۔ مگر آم تو جب تک ان کی رُت ہے ہر روز بکا ہی کرتے ہیں۔ بکتے ہی رہیں گے۔ بک ہی جائیں گے۔ آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں۔ یہ آم جو تو بیچ رہا ہے نیم کی تم کولیاں ہیں، محبت کے آموں کے مقابلے میں۔ وہ آم جب تک انسان جیتا ہے اس کی زندگی میں مہک پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ آم تو باسی ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت کے چمن کے آم کبھی باسی نہیں ہوتے۔ اس

ٹوکرے کو اٹھا کر کہیں رکھ دو۔ اور پروا کے چھنکتے ہوئے جھونکوں پر چھنکتے چلے آؤ۔ جھونکے چھنکے۔ بادل گرجا۔ کوندا لپکا۔ کالی گھٹائیں اور جھک گئیں۔ برکھا کی رانی بوندوں کے جلترنگ پر میگھ ملہار بجانے لگی۔ اور مادھو نے ٹوکرا اٹھا کر نیلام کر دیا۔ امراؤ جی حلوائی کی بولی بڑھی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ پندرہ رُپے۔ مادھو نے ٹوکرا اٹھا کر امراؤ جی کے آگے دھر دیا۔ اور رقم جیب میں ڈال کر چمپت ہو گیا۔

امراؤ جی حلوائی نے پیچھے سے آواز دی۔

"ابے چورنگی کے چمر سیٹے اپنا ٹوکرا تو لیتا جا۔"

اور مادھو نے جاتے جاتے کہا۔ "سیٹھ جی آم تو کھالو ٹوکرا ابھی آجائے گا۔"

جب مادھو چمپا کے چبارے میں پہنچا تو گھٹائیں کھل کر برس رہی تھیں۔ کہیں قریب ہی کوئل کی کوک رہ رہ کر کوندے کی طرح لپک جاتی تھی۔ اور سب چیزیں تیار پڑی تھیں۔

چمپا نے مادھو سے کہا۔ "ویسے تو سب کچھ موجود ہے مادھو۔ پر مدھیرا نہیں ہے۔ اور اس کے بغیر تو تم جانو ہو مزا نہ آئے گا آم کھانے کا۔ اور کوئل کو سنو کیا کہتی ہے۔ پی۔ پیلے جی بھر کر پی۔ گھٹاؤں سے مدھیرا ہی تو برس رہا ہے۔ جو نہ پیئے وہ پاپی۔ پیو اور پیار کرو۔ دیئے کو جلانے سے پہلے اُس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ پھر دیا جلتا ہے۔ پتنگے آتے ہیں۔ پریم کی راس رچاتے ہیں۔ پتنگے پریم کی آگ کو پی جاتے ہیں۔ تم مدھیرا نہیں پیو گے مادھو؟"

"ضرور پیوں گا۔" مادھو نے کہا۔ "ابھی منگوالو۔ مدھیر سے اور مادھو
میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔"
"ایسی رُت میں تو جھانسی کی رسیلی رس گھولتی ہے۔ آموں کے
رس سے تیار کرتے ہیں۔ سندھوری آموں کے ساتھ بس مزاہی
تو آجائے گا۔"
"تو بس پھر رسیلی ہی منگوالو۔" مادھو نے کہا۔ "میں رس میں بس
تو نہیں گھولوں گا۔"
چمپا نے کھڑکی کھولی۔ کالی گھٹائیں اور گہری ہوتی جارہی تھیں۔ بارش کی
ہلکی ہلکی دھند میں ڈفرن برج کے اُس پار بہتی ہوئی جمنا سفید لکیر سی معلوم ہو رہی
تھی۔ اور مادھو کے اندر رکا ہوا برساتی نالہ بھی بہہ نکلا۔ چمپا کے کالے لانبے
بال جھونکوں سے اس کے کولہوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلنے
لگا۔ چمپا نے سر میں چنبیلی کا تیل لگایا ہوا تھا۔ تیکھی تیکھی خوشبو سے مادھو کے
من میں لگا ہوا آموں کا باغ بھی مول اٹھا۔ اس باغ کے ہر پیڑ کی ہر شاخ میٹھی
میٹھی مہک والے بور سے بھر گئی۔ اس وقت وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس
دن کے انتظار میں اس نے کئی دن بڑی بے چینی میں گزارے تھے۔
چمپا کے کالے کالے بال کاجل بن کر اس کی آنکھوں میں پھیلنے لگے۔ آنکھوں
کا سنگار۔ کاجل۔ آنکھوں میں ڈالنا تو سب کو آتا ہے لیکن اس کو ٹمکانا کسی کسی
کو آتا ہے۔ چمپا نے بھی آنکھوں میں کاجل ڈالا ہوا تھا۔ اور وہ کاجل کو ٹمکانا
بھی جانتی تھی۔ جب وہ آنکھوں کو لٹو کی طرح گھما کر کاجل ٹمکاتی تھی تو یوں

معلوم ہوتا تھا۔ جیسے برکھا کی بھیگی کالی راتیں اس کی پلکوں کی کالی جھالروں کو ہٹا کر مادھو کے من میں جھانک رہی ہیں۔

چمپا نے چاندنی ہوٹل کے بیرے بادرے کو آواز دی۔

"بادرے ارے بادرے۔"

"کیا بات ہے چمپا بائی؟" بادرے نے ہوٹل کے دروازے میں آتے ہوئے نیچے سے آواز دی۔

"ہمیں رسیلی دے جا۔" چمپا نے کہا۔

"ابھی لایا۔" بادرے نے جواب دیا۔

چمپا کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور میٹھے میٹھے سروں میں گانے لگی۔

ساون کا مہینا ہے

ساجن سے جُدا رہ کر جینا کوئی جینا ہے

کتنی میٹھی تھی چمپا کی آواز۔ جیسے یکدم بہت سی سریلی بانسریاں بجنے لگیں۔ مادھو کو یوں محسوس ہوا جیسے چمپا نے اپنی کالی کالی زلفیں اس کے گرداگرد لپیٹ کر زور سے جالی ماری ہے۔ اور وہ لٹو کی طرح زمین پر گھومنے لگا ہے۔

"مادھو میری آرسی اور بچھوے نہیں لائے۔" چمپا نے ساڑھی کا آنچل سنبھال کر پھیری لیتے ہوئے کہا۔

"اپنا بول بچن بھول گئے نا۔"

"میں اپنا بول بچن بھولا نہیں کرتا چمپا۔" مادھو نے اپنے سلوکے کی جیب سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر چمپا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"لو اپنی مرضی کی آرسی اور اچھے سے بچھوے خرید لینا۔"

اور چمپا خوش ہو گئی۔ مادھو کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

"تم بڑے اچھے ہو مادھو۔"

اتنے میں باورا رسیلی کی بوتل لے آیا۔ اور رس گھلنے لگا۔ کوئل کی کوک کے کوندے لپکتے رہے۔ گھٹائیں کھل کھل کر برستی چلی گئیں۔ پروا کی پائل کے گھنگرو رہ رہ کر چھنکے۔ اور رسیلی کے رسیا پیتے پیتے خود بھی رسنے لگے۔

رسیلی کا رس مادھو کے حلق سے نیچے اترتے ہی بس بن گیا تھا۔ آج تک اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ پینے پر آتا تھا تو کافی پی جاتا تھا۔ مگر آج تو دو ہلکے ہلکے ہلوروں نے اس کی رگ رگ کو کھینچ کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ کتنی آگ تھی رسیلی میں۔ مادھو دو گھونٹ بھی نہ لے سکا۔ سر سے لے کر پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ رسیلی اس کے دل کو چاٹ رہی تھی۔ اس کے دل کا رس چوس رہی تھی۔ انسان کا دل ایک آم ہی تو ہے جس میں ساری زندگی کا رس رمکتا ہے۔ اور جب یہ رس نہیں رہتا تو انسان بالکل چوسے ہوئے آم کی طرح ہو جاتا ہے۔ چھلکے اور گٹھلی۔ ہڈیاں اور مردہ گوشت۔ جس میں خون نہ ہو۔ رس نہ ہو۔ رونق نہ ہو۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا آم۔ مردہ جسم۔ پیچ و خم کھاتا ہوا ناگ نکل جاتا ہے۔ اور اس کی سپید کینچلی رہ جاتی ہے۔

ایکا ایکی مادھو کا جی متلانے لگا۔ اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔ مگر نہ سنبھل سکا۔ اُسے ابکائی آرہی تھی۔ اس نے اچھلتی ہوئی طبیعت کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن نہ روک سکا۔ پاس ہی اگالدان پڑا تھا۔ رسیلی اور آموں کا جھاگ

کی طرح ابلتا ہوا اس گھبراہٹ کے ایک ہی جھٹکے میں اس نے اگل دیا۔ اس نے قے کر دی۔

چمپا مسکرا رہی تھی۔ مادھو دل ہی دل میں شرم سی محسوس کر رہا تھا۔ کاٹھ بازار کا بھیم سین۔ مادھو مالی۔ جس کی شکل دیکھتے ہی ہر کسبن اُسے دور سے سلام کر دیتی تھی۔ اس سے آنکھ نہ ملاتی تھی۔ اس وقت چمپا سے آنکھ ملاتے ہوئے شرما رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا چمپا اس کے متعلق اپنے دل میں جانے کیا کہتی ہو گی۔ کتنی گندی چیز ہے۔ معاً اس کی نظریں ایک بار پھر اگالدان کی طرف اٹھ گئیں۔ بڑے اچنبے کی بات تھی۔ اس سے پہلے اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اُس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اگالدان سے دبی دبی بو آرہی تھی۔ مادھو پانی سے منہ صاف کرنے کا بہانہ کر کے سیڑھیوں کی طرف سرک گیا۔ اور چمپا نے رسیلی کے دو گھونٹ اور پئے۔

بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ مادھو چمپا کے چبارے کے سامنے شبراتی پنواڑی کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ اور اچھلتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی غرض سے اس نے الائچی والا پان کھایا۔ اس کا منہ سخت بدمزا ہو رہا تھا۔ ہزار لعنت ہے ایسی رسیلی پہ اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ جھلک امرت کی اور اندر اس کے سنکھیا۔ بوتل دیکھو تو کتنی دلکش تھی۔ اور رسیلی کی رنگت میں بھی کافی رس تھا۔ مگر پینے سے اس نے کتنی بدمزگی اور بے چینی پیدا کر دی تھی۔ پھر کبھی بھول کر بھی رسیلی نہ پیوں گا۔ مادھو نے کان پکڑے۔ جو پھر کبھی رسیلی پیئے رام قسم اپنا خون پیئے۔ جھانسی کی یہ پھانسی بڑی خوفناک ہے۔ بڑے

پیار سے گلا گھونٹتی ہے۔ ہڈی ہڈی سے دھواں نکال دیتی ہے۔ بس کی بھری ناگن رام قسم بڑی زہریلی ہے۔ اب سے اپنے باوا کی بھی توبہ۔ مادھو نے اپنے دل سے فیصلہ کر لیا تھا کہ پھر کبھی رسیلی کے رس بھرے نینوں سے نین نہیں لڑائے اور نہ کبھی اس کا رسیا بن کر اس کے رنگ محل میں آنا ہے۔ ایک قے اگر اوپر سے اور آجاتی تو مادھو متھرا پہنچ گیا تھا۔

چمپا ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی اٹھی۔ کھڑکی میں چلی آئی۔ اور باورے کو آواز دی۔

"باورے میری بات سن جا"

باورا آیا۔ پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے چمپا بائی؟"

"ہوٹل میں کیا غلا غلا ہو رہا ہے؟" چمپا نے پوچھا۔

"مادھو غل غپاڑہ کر رہا ہے۔" باورے نے جواب دیا۔

"کیا غل غپاڑہ؟" چمپا نے آنکھیں لٹو کی طرح گھماتے ہوئے پوچھا۔

"کہتا ہے مالشیا بلاؤ۔ سر کے ساتھ میں بھی چکر کھا رہا ہوں۔ جلدی سے جنجر کی بوتل پلاؤ۔ میرا جی متلا رہا ہے۔ تم نے اُسے کیا کر دیا ہے بائی؟"

یہ سن کر چمپا نے ایک بے ساختہ قہقہہ مارا۔ اور برف میں لگا ہوا آم اٹھا کر چوسنے لگی۔ اور پل کی پل میں اس نے چوسی ہوئی گٹھلی کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی۔

# آرک لائٹ

سٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔ کبھی دن۔ کبھی رات۔ ہیرو اور ہیروئن میک اَپ کئے سٹ پر کیمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اور سٹوڈیو کے خلاء میں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔

"لائیٹس آن۔"

"لائیٹس آف۔"

"بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ۔"

"مس چاندنی کو ایک اور بے بی دو۔"

اور وہ گھبرا گئی۔ یہاں کنواریوں کو بھی بے بی دیئے جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک لائٹ کا نام تھا۔ سٹوڈیو میں آکے اُس نے تینوں کے بھی نام سنے تھے۔ بے بی لائٹ۔ سن سپاٹ۔ سولہ۔ ویٹ۔ آرک لائٹ۔

"آرک لائٹ آن۔" یہ کیمرہ مین کی آواز تھی۔ اور وہ پھر گھبرا کر سمٹ کر ایک تختے کے ساتھ لگ گئی۔ جیسے آندھی آرہی ہو۔ آرک لائٹ۔ روشنی کے طوفان کا دوسرا نام تھا۔ لائٹ قلی جب اس لائٹ کو جلاتے تھے تو روشنی کا طوفان سا امڈ آتا تھا۔ اس کی روشنی اتنی تیز اور گرم تھی کہ کپڑوں کے علاوہ گوشت اور ہڈیوں کو چیرتی ہوئی جسم کے پار نکل جاتی تھی۔ آرک لائٹ کا دوسرا نام پنجہ بھی تھا۔ کیونکہ جلتے وقت اس کے اندر روشنی کا سرخ پنجہ سا بھڑک

اُٹھتا تھا۔

کسی زمانے میں جبکہ وہ جاسوسی ناول پڑھا کرتی تھی۔ تو اس قسم کے نام اس کی نظر سے گزرا کرتے تھے۔ خونی پنجہ۔ آدم خور پنجہ۔ فولادی پنجہ۔ شیر کا پنجہ۔ موت کا پنجہ۔ بھوت کا پنجہ۔ لیکن آرک لائٹ کا کھڑکتا ہوا پنجہ سب سے زیادہ خوفناک تھا۔ سٹوڈیو کے اندھیروں اور اجالوں میں فلمی پنجے بڑے خوفناک کھیل کھیلتے ہیں۔

برکت ایکسٹرا سپلائر دوسری ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ کل جب اُسے پہلی بار فلم میں ایکسٹرا کا کام کرانے کے لئے سٹوڈیو میں لایا۔ تو اس نے اس کا تعارف بڑے سیٹھ کے سالے چھوٹے سیٹھ سے کرایا تھا۔

"سیٹھ جی نیا چہرہ ہے" برکت نے چھوٹے سیٹھ سے کہا۔

"بڑا اچھا فیس ہے" چھوٹے سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ چھوٹا سیٹھ ہونے کے علاوہ پروڈکشن انچارج بھی تھا۔

"نگہت ہے اس کا نام"

"بڑا اچھا نام ہے"

"نویں جماعت پاس ہے"

"ہوں"

"بڑے اچھے گھرانے کی لڑکی ہے"

"ہوں"

"بیچاری کا باپ مرگیا ہے"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"بیچاری کی ماں بہت بیمار ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"روٹی پانی کا کوئی آسرا نہیں۔"

"اوہو۔"

"گھر کا سامان بیچ کر وقت گزار رہی ہیں۔"

"ہوں۔"

"اس کی ماں میری ماں کی بہن بنی ہوئی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

"میری ماں نے اس کی ماں کو بڑا مجبور کر کے اس کام پہ راضی کیا ہے کہ نگہت میری سپرداری میں فلموں میں کام کرے۔ آخر روٹی پانی تو چلے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"سیٹھ جی بڑا اچھا فیس ہے۔ اپنی کسی پکچر میں ہیروئن کا رول دلوا دو نا۔ ستارے چمک اٹھے تو بیچاری کی زندگی بن جائے گی۔"

"اچھا تو میں بڑے سیٹھ سے بولوں گا۔" چھوٹے سیٹھ نے کہا۔

"جاؤ تم کینٹین کے بیرے کو بولو چائے لائے۔"

برکت اس کا پڑوسی تھا۔ پرستان پارک میں اس نے ایک فلمی دفتر کھول رکھا تھا۔ جو فلمی شوق رکھنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے دن رات کھلا رہتا تھا۔ جہاں سکرین پہ ناچنے گانے والی پریاں فلمی اُڑن کھٹولوں میں بٹھا کر

نگار خانوں کے اندھیروں اور اجالوں میں اتاری جاتی تھیں۔ ابھی وہ چھوٹے سیٹھ کے ساتھ چائے پی رہی تھی کہ ڈائرکٹر کا حکمنامہ آیا۔

"ایکسٹرا لڑکیاں میک اپ کر کے پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔"

اور میک اپ روم کا دروازہ بند تھا۔ فلم کے بڑے ایکٹر بڑے ٹھاٹھ سے بڑے بڑے آئینوں کے سامنے تھری کیسل اور پلیئر نمبر تھری کے سگرٹوں کے دھوئیں کے بادلوں میں بیٹھے سٹرونگ چائے اور کافی پیتے ہوئے میک اپ کر رہے تھے۔ میکس فیکٹر کے ایرومیٹک شیڈوں اور ٹکنی کلر فیس پوڈروں کی خوشبو دروازہ بند ہونے کے باوجود باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایکسٹرا لڑکوں اور لڑکیوں کی حیثیت سٹوڈیو میں فلم سٹاروں کے نزدیک بالکل اچھوت کی سی ہوتی ہے۔ لہذا آخر کو اس بھرتی کو سٹوڈیو کے ایک کونے میں جھونک دیا گیا تھا۔ اور اسسٹنٹ میک اپ مین جس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے ایک بتی اپنی طرف کھینچ کر کولٹا پان کے ان پتوں پر کتھا چونا لگانے لگا تھا۔ ہر میک اپ مین۔ میک اپ مین ہونے کے علاوہ ایک ایسی مشین ہے جو سٹوڈیو میں کیمرے کے سامنے آنے والے ہر چہرے کا بے جھجک اچھی طرح پوسٹ مارٹم کر سکتی ہے۔

کل جب شوٹنگ شروع ہوئی تو آرک لائٹ کا رخ اس کے چہرے کے بالکل سامنے تھا۔ اور پھر جب طوفانی بتی میں سرخ پنجہ بھڑکا تو اُسے چکر آنے لگے تھے۔ اور چکروں کا یہ سلسلہ تو چھوٹے سیٹھ کی پیش کی ہوئی چائے پینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ سٹ کے اُس پار چھوٹا سیٹھ لائٹ

فلیوں کی ایک ٹولی کے ساتھ کانا پھوسی کانفرنس کر رہا تھا۔ سٹوڈیو میں اس وقت اتنی گہری خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھسر پھسر کی آوازیں سُن کر ڈائرکٹر کے غصے کی آرک لائٹ بھی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگا تھا۔ اور پھر جب کمرہ دوبارہ سٹارٹ ہوا تو سٹوڈیو لائٹ چلی گئی تھی۔۔ سب بتیاں بجھ گئی تھیں۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے آرک لائٹ کے بجھے ہوئے پنجے نے اس کی کلائی پکڑ کر اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں غوطہ مار دیا ہے۔ اور وہ یکدم لوکھلا گئی تھی۔ گھبرا گئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن ڈائرکٹر کی گالیوں کے خوف سے چیخ اس کے حلق ہی سے چپک گئی تھی۔ اور آرک لائٹ کے طوفانی پنجے باری باری اس پہ جھپٹتے چلے گئے تھے۔ اور اس نے اپنے دل میں یہ بات پکی کر لی تھی کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی سٹوڈیو میں نہ آئے گی۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ دس روپے جو اُسے اس کی مزدوری کے ملے تھے دس منٹ میں خرچ ہو گئے تھے۔ اس کی ماں کو پھر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر بلایا گیا تھا۔ چھ روپے اس کی فیس کے چلے گئے۔ اور بقایا چار روپے جب ان کے پیٹ میں بھوک کی آرک لائٹ کا پنجہ بھڑکا تو بھسم ہو گئے تھے اور اُسے مجبوراً پھر سٹوڈیو میں آنا پڑا تھا۔

آج وہ بہ نسبت کل کے بڑی چوکس ہو رہی تھی۔ اس کی نظر چاروں طرف بڑی ہوشیاری سے کام کر رہی تھی۔ ملی جلی آوازیں سٹوڈیو میں بدستور گونج رہی تھیں۔

"چودہ نمبر اوپر لو۔"

اور اس نے اپنی ہر چیز ٹٹولتے ہوئے اپنا جائزہ لیا کہ وہ کہاں ہے؟ اوپر یا نیچے؟ زمین پر یا آسمان میں؟ لیکن وہ جہاں تھی ابھی تک وہیں تھی۔ لیکن ہیرو اور ہیروئن کا کچھ پتہ نہیں وہ اب کہاں تھے؟ اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"چودہ نمبر۔" پھر وہی آواز گونجی۔

اور اُس نے بڑے غور سے اپنے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ کہ یہ چودہ نمبر پیٹے کون ہیں؟ اس سے پہلے اس نے صرف دس نمبر پیٹے دیکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کوٹھے کی منڈیر سے لگی کھڑی تھی تو سپاہی چار پانچ آدمیوں کو ہتھ کڑی لگائے لئے جا رہے تھے، اور اس کی ماں نے اُسے بتایا تھا۔

"یہ اس علاقے کے دس نمبر پیٹے ہیں۔"

ستائیں نمبر کو ہارڈ کرو۔" معلوم نہیں یہ کس کی آواز تھی لیکن کافی سے زیادہ ہارڈ تھی۔

"ہارڈ۔ اور ہارڈ۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ کرو۔ بس ٹھیک ہے۔"

"نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ نہیں شیشے کا۔"

اس کا خیال تھا کہ شاید اب گوشت کے ڈفیوزر کی باری آئے گی۔ اور گوشت نہ جانے کس کا اور نہ جانے کہاں سے لیا جائے گا۔ لیکن آواز یکدم خاموش ہو گئی اور اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ڈفیوزر کپڑے کا ڈالا گیا یا شیشے کا؟

کپڑے کس کے اتار رے گئے؟ اور شیشے کس شیش محل کے تھے؟ اُسے کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

"ریہرسل" یہ ایک نئی آواز تھی۔

"کیمرہ ریڈی۔"

"یس ریڈی۔ او کے۔"

"آل لائیٹس۔"

"ریہرسل۔"

ساؤنڈ ٹریک کی سیٹیاں "خاموش۔ خاموش"

"میڈم چاندنی اور سورج کمار ریڈی۔"

اور فلمی دنیا کے چاند سورج ڈائیلاگ بولنے لگے۔

"بستی کے پہرہ دار سو گئے ہیں۔" ہیرو نے کہا۔

"کتے بھی سو گئے ہیں۔" ہیروئن نے کہا۔

"بھگوان بھی سو گیا ہے۔"

"انسان بھی سو گیا ہے۔"

"شیطان جاگ رہا ہے۔ یہ کبھی نہیں سوئے گا۔ یہ کبھی سو ہی نہیں سکتا۔"

"چلو بھاگ چلیں۔"

"کدھر؟"

"کلکتے۔ تم رس گلے کھانا۔ میں بارہ من کی دھوبن دیکھوں گی۔" اور پھر

ساؤنڈ ٹرک کی دو سیٹیاں بجیں۔ "او کے۔"

"مس چاندنی کی لپ اسٹک ٹھیک کرو۔"

اور اس کا خیال تھا شاید مس چاندنی کا اور بھی کچھ ٹھیک کیا جائے گا لیکن معاملہ لپ اسٹک سے آگے نہ بڑھا۔

"سورج کمار کی ناک چمک رہی ہے۔" یہ ڈائرکٹر کی آواز تھی۔ جیسے اُس وقت شاید ہیرو کی ناک ہی نظر آ رہی تھی۔ ورنہ اس نامراد کی تو اس وقت آنکھیں بھی بلی کی طرح چمک رہی تھیں۔

"فوکس۔"

"پانچ فٹ ساڑھے گیارہ انچ۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ معلوم نہیں مس چاندنی کی لپ اسٹک ناپی گئی یا سورج کمار کی ناک۔

"لینز بدلو۔" یہ کیمرہ مین کی آواز تھی۔

اور یہ جملہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ لینز کیمرے کے بدلے جا رہے ہیں یا ڈائرکٹر کی عینک کے۔

"سیونٹی فور لگاؤ۔"

یہ بھی ایک معمہ سی بات تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر کسی انسان کو لگایا گیا یا گاڑی کو؟

"خاموش۔ وی آر شوٹنگ (We are shooting)

"ساؤنڈ ریڈی۔"

ساؤنڈ گیا وہاں سبھی ریڈی تھے۔ اور وہ بھاگ کر سٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ آسمان کی آرک لائٹ سپیدے کے لانبے لانبے درختوں کے اُس پار افق کے کنارے پر بجھ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں اس کی ماں کی تصویر ابھر آئی۔ پتلی۔ دُبلی۔ زرد بڑھیا۔ زندگی کی بجھی ہوئی آرک لائٹ جس کے دل کو نہ جانے کس خونی پنجے نے دبوچ لیا تھا۔ اگر آج اُسے یہاں سے اس کے سارا دن کام کرنے کی مزدوری دس روپے نہ مل سکے۔ تو اس کے گھر میں دل کو پکڑ کر ہانپتی ہوئی آرک لائٹ ہمیشہ کے لئے بجھ جانے کا اندیشہ تھا۔ معاً اُسے خیال آیا۔ ڈاکٹر صبح اس کی ماں کو پھر ٹیکہ لگانے آرہا تھا اور وہ فلم کمپنی کے بیرونی دروازے سے واپس لوٹ آئی۔ قسمت کی بجھی ہوئی آرک لائٹ۔

# "ایک کے بعد ایک"

[اس افسانے کا عنوان کانگڑی تھا۔ لیکن محترم بھائی
اشفاق احمد صاحب سابقہ ایڈیٹر لیل و نہار نے
اس کا عنوان ایک کے بعد ایک" کر دیا۔ لہذا
اس افسانے کو اس مجموعہ میں شامل کرتے ہوئے
میں نے ان کے عنوان کو نہیں بدلا۔]

ہر چیز کہر میں چھپی ہوئی تھی۔ جھیل کے چاروں طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے چنار کے درخت، صنوبر کے درخت، ان کے پس منظر میں اونچے اونچے برف پوش پہاڑ اور جھیل کا نیلا نیلا پانی بھی۔ ہر چیز کہر میں چھپی ہوئی تھی۔ کئی روز سے لگاتار پہاڑوں پہ برف گر رہی تھی۔ اور سردی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

بڈھے رحمان نے فرغل کا چاک بند کیا۔ جھرجھری لی۔ چند بالوں کو ناخنوں سے کھبر کھبڑ کر دیا۔ پیال کے ڈھیر پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے ڈونگے سے باہر نظر دوڑائی۔ کہر کے بادل اور زیادہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر بتی جلائی۔ اور فرغل کی جیب سے ایک خط نکال کر بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ برف چاٹ کر آتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اور کہر کے بادل کھپریلوں سے

سرک سرک کر ڈونگے کے اندر آنے لگے۔

بوڑھے رحمان نے کانگڑی اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ نسوار کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈالی اور چند یا کو کریدتے ہوئے کہر کے بادلوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے خیالات اس کی کھوپڑی میں کہر کے بادلوں کی طرح پھیل رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اور پھر جھرجھری لیتے ہوئے اٹھا۔ ایک ہاتھ سے فرغل کے چاک کے دونوں کنارے سینے پر سمیٹ لئے۔ اور دوسرے ہاتھ سے کانگڑی اٹھائے چل دیا۔ کانگڑی میں آگ دہک رہی تھی۔

تیز تیز چلتا ہوا وہ ڈونگے کے اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں بیگماں رشماں اور ان کی بوڑھی نانی ایک بہت بڑی کانگڑی کے پاس کمبل میں لپٹی پڑی تھیں۔ ایکا ایکی بڑھیا کو کھانسی اٹھی اور وہ کھانستے کھانستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس نے بلغم کا لچھا حلق سے کھینچ کر خلا میں اچھالا اور کانگڑی کی طرف سرک گئی۔ اگر رحمان جلدی سے آگے نہ نکل جاتا تو بلغم کا گولا سیدھا اس کے وجود سے چمٹ جاتا۔

"دیدی۔" رحمان نے دبی آواز میں بڑھیا کو پکارا۔ "دیدی۔"

"کیا ہے رحمان؟" بڑھیا چونک پڑی۔ اور اس نے اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"لاہور سے قادر بھائی کا خط آیا ہے۔" رحمان نے بڑھیا کو خوشخبری

سنائی۔

"قادر کا خط ؟" بڑھیا کا زرد چہرہ خوشی سے یکدم دمک اٹھا۔

"میرے قادرے کا خط آیا ہے ؟" بڑھیا نے الجھے الجھے سانسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور کمبل سے باہر نکل کر کانگڑی کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں دیدی۔ قادر بھائی کا خط آیا ہے ؟" رحمان نے کہا اور کانگڑی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کیا لکھا ہے خط میں ؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"بڑی خوشی کی بات لکھی ہے خط میں ؟" رحمان نے جواب دیا۔

"وہ کیا ؟" بڑھیا نے جوش مسرت سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"جلدی بتا مجھے کیا لکھا ہے خط میں ؟"

"اب کے گرمیوں میں ہم کم سے کم چار ڈونگے بنا سکیں گے ؟" رحمان نے کہا۔

"وہ کیسے ؟" بڑھیا نے چہرے پر مسرت اور حیرت کے ملے جلے اثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"قادر نے لاہور سے روپیہ بھیجنے کو لکھا ہوگا ؟"

"نہیں۔ میں لاہور جا رہا ہوں ؟" رحمان نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا قادر نے بلایا ہے ؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"ہاں ؟" رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"قادر بھائی نے لکھا ہے خط دیکھتے ہی چلے آؤ۔ اور بگیاں کو ضرور ضرور اپنے ساتھ لیتے آنا ؟"

"اور کیا لکھا ہے خط میں؟" بڑھیا نے متبسم لہجہ میں پوچھا۔

"قادر بھائی نے دو تانگے بنا لئے ہیں۔" رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک مکان خریدا ہے۔ اور آٹھ سو روپیہ ڈاکخانے میں جمع ہے۔"

"اچھا۔" بڑھیا کا منہ بگلے کی چونچ کی طرح کھل گیا۔

"اب تو امیر کبیر بن گیا ہے میرا قادر۔" بڑھیا نے کہا۔

"اور میں کنگال ہی رہا دیدی۔" رحمان نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"اپنی اپنی قسمت ہے دیدی۔"

"تو نے خط کس سے پڑھایا ہے رحمان؟" بڑھیا نے معنی خیز نظروں سے رحمان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے دیدی؟" رحمان نے سوال کیا۔

"تجھے ان پڑھ جان کر تیرے ساتھ کسی نے ٹھٹھا نہ کیا ہو پگلے۔" بڑھیا نے کہا۔

"منشی جی سے پڑھوایا ہے میں نے خط۔" رحمان نے کہا۔

"بس تو پھر سمجھ لے یہ بات سچ ہے۔" بڑھیا نے بڑے وثوق سے کہا۔ منشی جی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پیر فقیر کے ماننے والے ہیں۔ اور بتا کیا لکھا ہے خط میں؟"

"اور لکھا ہے بھابی کی دامن ابھی تک اچھی نہیں ہوئی۔ ایک ٹیکہ دن میں

لگتا ہے اور ایک رات میں۔ گرم اور کھٹی چیز کا ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے۔ ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ سوکھتی جا رہی ہے۔"

"ہائے میری بیٹی گل دامن۔" بڑھیا کی آواز ایکا ایکی حلق میں رندھ گئی۔ بولی۔

"سدا کی روگن ہو گئی۔ اچھا ہو وہ یہاں چلی آئے۔ اچھی ہو جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ دنیا کے دھندے تو زندگی کے ساتھ ہیں۔"

"یہاں کیسے چلی آئے۔" رحمان نے کہا۔ "کام بڑا تیز جا رہا ہے۔"

"رحمان مجھے نسوار دے۔" بڑھیا نے نسوار کی پوٹ نچلے ہونٹ تلے دباتے ہوئے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے؟"

"میں تو سویرا ہوتے ہی بیگماں کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔" رحمان نے جواب دیا۔

"بڑی سردی ہے رحمان۔" بڑھیا نے کہا۔

"سردی کیا ہمارے پاؤں پکڑے گی۔" رحمان نے کہا۔

"برف سے سارے راستے بند ہو رہے ہیں۔" بڑھیا نے کہا۔

"ہم پہاڑی ہیں دیدی۔" رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ماں کی گود سے نکل کر ان برفوں ہی کی گود میں پلے ہیں۔ بس یہاں سے بیس میل تک راستہ خراب ہے وہاں سے ہم ریل میں بیٹھ کر لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"تو پھر بیگماں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔" بڑھیا نے کہا۔

"اکیلی یہاں اداس ہو جائے گی۔"

"اگلے سال۔" رحمان نے کہا۔ "ایک نجومی نے مجھے کہا ہے ریشماں رانی بنے گی۔ بڑی اچھی قسمت ہے اس کی۔ اگلا سال اس کے لئے اچھا ہے۔"

"خدا کرے۔ خدا کرے۔" بڑھیا نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

"نسوار کی ایک چٹکی مجھے اور دے۔"

رحمان نے بڑھیا کو نسوار دی اور ریشماں نے ایک لمبا خراٹا بھرتے ہوئے کروٹ بدلی۔ اور پنڈلی کھجانے لگی۔ ریشماں کے گوشت کی رنگت اور کانگڑی میں دہکتے ہوئے چیل کے کھوپے جیسے ایک ہو رہے تھے۔ بڑھیا اور رحمان اپنے اپنے خیالوں میں محو کافی عرصہ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"اب سو جا رحمان۔" بڑھیا نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"سویرے سے تجھے سفر پر جانا ہے۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی دیدی۔" رحمان نے کہا۔

"بس اب تو لاہور پہنچ کر ہی مزے سے سوؤں گا۔"

"خدا تجھے خیر سے لاہور پہنچا دے۔" بڑھیا نے دعا دی۔

رحمان اپنی گنجی ٹانٹ کو کھجاتے ہوئے اپنے بچھونے کی طرف سرک گیا۔ بڑھیا نے بڑی کانگڑی میں چیل کے دو تین کھوپے اٹھا کر پھینکے اور کمبل تان کر سو گئی۔ رحمان ساری رات بچھونے پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ اور اس کی کھوپڑی میں اس کے خیالات گھر کے بادلوں کی طرح پھیلتے رہے۔

رات تھوڑی باقی رہ گئی تھی کہ بڑھیا جاگ اٹھی اور اس نے ریشماں کو شانے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ریشماں — او ریشماں۔"

"کیا ہے دیدی؟" ریشماں نے کسی قدر برہم ہو کر نیند بھری آواز میں کہا۔

"مجھے سونے دو دیدی۔"

"اٹھو میری بیٹی اٹھو۔" بڑھیا نے بڑے پیار سے کہا۔

"صبح ہونے والی ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج تم اپنے بابا کے ساتھ لاہور جا رہی ہو۔ اپنے چچا قادر کے پاس۔ اپنی چچی گل دامن کے پاس۔"

"اور کیا بیگماں بھی جائے گی؟" ریشماں نے خوشی سے لپکتے ہوئے پوچھا۔

"آہستہ بول آہستہ۔" بڑھیا نے دبی آواز میں کہا۔

"کہیں سن نہ لے بیگماں۔ تیری چچی نے تو تجھے اپنے پاس بلایا ہے۔ بیگماں ابھی نہیں جائے گی۔"

لاہور — کتنا اچھا شہر ہے — لاہور — جہاں اس کا چچا اور چچی رہتے ہیں۔ وہ لاہور کو دیکھنے کی بڑی شائق تھی۔ اپنے چچا اور چچی سے ملنے کی بڑی شائق تھی۔ اس کا چچا شادی سے فوراً بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا تھا۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ریشماں کا چچا اپنی بھاوج کی موت پر بھی اپنے وطن نہ آیا تھا۔ حالانکہ اسے تار بھیجا گیا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے ایک افسوس بھرا خط لکھا تھا اور معذرت چاہی تھی کہ کام بہت

ہونے کی وجہ سے نہیں آ سکتا۔

ریشماں خوشی سے لہر کی طرح لہراتی ہوئی اٹھی اور تیار ہونے چلی گئی۔ ادھر رحمان اپنا بوریہ بستر باندھنے لگا۔ بڑھیا نے اٹھ کر باجرے کی روٹیاں پکائیں۔ شلغموں کا بھرتہ جلدی جلدی تیار کیا۔ اتنے میں بیگماں تیار ہو کر آ گئی۔ آج اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا زعفرانی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ اوپر پشمینے کی خاکستری فرغل اوڑھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں لومڑی کی کھال کے چپل تھے۔ جس میں اس کے گورے گورے پاؤں چھپ گئے تھے۔

بڑھیا نے ریشماں کو سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما، گال چومے، ہونٹ چومے، ایک جیب میں بنفشے کی کلیاں اور دوسری میں چلغوزے اور اخروٹ ڈال دیئے۔ اور پھر بڑھیا نے اپنی بوسیدہ فرغل کی جیب سے چھوٹی سی ایک پوٹلی نکال کر کھولی اس میں کیسر کے پھول تھے۔ جن کو ریشم کی چھوٹی سی تراشں میں لپیٹ کر اس نے ایک تعویذ سا بنایا اور اسے ریشماں کے دائیں بازو سے باندھ دیا۔ دعائیں دیں۔ لپک کر تین کانگڑیاں اٹھا لائی۔ ایک کانگڑی آگ سے بھر کر ریشماں کو پکڑا دی اور دو کانگڑیاں رسی سے باندھ کر ریشماں کے کندھے پر ڈال دیں۔ بولی۔

"اچھی بیٹی یہ کانگڑی تم اپنی چچی گل دامن کو دینا۔ اور یہ اپنے چچا قادر کو۔ اور اپنی چچی سے کہنا۔ تیری دیدی تجھے بڑا یاد کرتی ہے۔ اسے اپنے پاس بلا لے یا خود آ کر اس سے مل جا۔ بھول نہ جانا میری باتیں۔ میرا پیغام ضرور دینا میری بیٹی کو۔"

اور ریشماں نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"ضرور دیدی ضرور۔"

"اب چلنا چاہیئے۔" رحمان نے کہا۔

"اس وقت کے چلے نہ جانے کب منزل پر پہنچیں گے۔"

"اچھا خدا حافظ۔" بڑھیا نے کہا۔

"جاتے ہی اپنی خیر خیریت کا خط ضرور لکھنا۔"

"پانچویں چھٹے دن میرا خط تمہارے پاس آتا ہی رہے گا دیدی۔" رحمان نے کہا اور اپنا بستر اٹھا کر چل دیا۔

بڑھیا انہیں ڈونگے کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اور خوشی خوشی جاتی ہوئی ریشماں کا رخصتی بوسہ لیا۔ پیار بھرا ہاتھ سر پر پھیرا۔ اور اس عرصہ تک دروازے میں کھڑی رہی جب تک کہ جانے والے اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

کہر کے بادل بدستور ہر چیز پر پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اب ان میں ہلکا ہلکا نور گھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کی نہ جانے کن چوٹیوں پر شفق پھول رہی تھی۔ رحمان اور ریشماں شفق کے گلابی نور میں بڑھتے چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے مسافت کی منزلیں طے ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر منزل پر نئے نئے مناظر کہر سے نمودار ہو کر کہر ہی میں چھپتے جا رہے تھے۔ ندیاں، نالے، دریا، آبشار، ہری بھری وادیاں، بنفشے اور زعفران کے کھیت، مہکتے مہکتے مرغزار اور پُرپیچ گھاٹیاں قریب آآ کر دُور ہٹتی چلی گئیں۔ رحمان اور ریشماں

ریل میں سوار ہو گئے۔

رکشا والا انہیں بڑے بازار میں لے آیا۔ رحمان نے ایک پنواڑی سے قادر کا پتہ پوچھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے قادر کا مکان بتا دیا کہ بھئی وہ رہا۔ دروازے پہ پہنچ کر رحمان نے دستک دی۔ قادر سو رہا تھا۔ گل دامن جاگ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ڈاکٹر سے ٹیکہ کروا کر آئی تھی۔ اور اپنا بازو سینک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باغ باغ ہو گئی۔ بھاگی بھاگی آئی۔ اور ریشماں سے لپٹ گئی۔ اُسے سینے سے لگا کر گل دامن کو اپنی مری ہوئی بہن یاد آ گئی۔ اور چچی کو دیکھ کر ریشماں کی آنکھوں میں اپنی ماں کی تصویر اُبھر آئی۔ دونوں چھم چھم رونے لگیں۔ اتنے میں قادر بھی جاگ پڑا۔ نیچے اتر آیا۔ سامنے رحمان کھڑا تھا۔ دونوں بھائی مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

اسی رات قادر نے آنے والوں کی خوشی میں جشن منایا۔ گراموفون پہ فلمی ریکارڈ بجائے گئے۔ قہوے کے کئی دور چلے۔ اور سلفے کے بادلوں نے تو گھر کا سماں باندھ دیا۔ رحمان کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اپنے ڈونگے میں بیٹھا ہے۔ دوسرے دن گل دامن اپنے پشاوری تانگے میں ریشماں کو لاہور کی سیر کرانے لے گئی۔ دونوں سارا دن سیر کرتی رہیں۔ شام کو سینما دیکھا۔ اور پھر گھر واپس آتے ہی ایک اور جشن منایا گیا۔ ریشماں کو کیک پیسٹری اور کستوری والے پان کھلائے گئے۔ جن سے اس کو ہلکا ہلکا سرور سا ہو گیا۔ اور وہ پنڈلیوں کو کھجاتے ہوئے ٹھاہ ٹھاہ ہنستی رہی۔

گل دامن نے ریشماں کے لئے دو ریشمی جوڑے سلوائے۔ لفٹی سینڈل لے دی۔ رولڈ گولڈ کے زیورات بھی خرید دیئے۔ جنہیں پہن کر ریشماں عین مین اُن جل پریوں کی تصویر معلوم ہونے لگی۔ جو موسم بہار کی چاندنی میں جھیل میں لہروں پر ناچتے ہوئے سیپ کے ساز بجایا کرتی ہیں۔

اسی اثنا میں قادر نے ایک علیحدہ چوبارے کا انتظام کر لیا۔ اسے فلمی پریوں کی تصویروں سے سجایا۔ اور ایک رات جب کہ ستارے آسمان میں پوری سج دھج سے چمک رہے تھے۔ چوبارے کی کھڑکی کھلی اور اُس میں ایک فانوس لٹکا دیا گیا۔ رحمان بہت خوش تھا۔ اس کے ڈونگے کے لئے سونے چاندی کے تختے تیار ہو رہے تھے۔ رحمان کے تصور میں جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں تیرتے ہوئے ڈونگے کے سنہری بادبان پھڑپھڑا رہے تھے۔

دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن۔ وقت کا چکر یونہی چلتا رہا۔ فانوس جلتا رہا بجھتا رہا۔ جھونکے آتے رہے جاتے رہے۔ اور ریشماں بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر کہتا تھا پرہیز کرو ریشماں۔ اور رحمان کہتا تھا گرمیوں کا موسم قریب آ رہا ہے۔ اور ریشماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہو گئی۔ اس کی چارپائی اٹھا کر چوبارے کی برساتی میں رکھ دی گئی۔ سارا دن وہیں پڑی رہتی تھی۔ وہ اڑ کر اس چوبارے سے کہیں دور نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر اس میں سکت باقی نہ تھی۔

ایک دن بیماری کی حالت میں ریشماں کو پو پھٹنے سے پہلے ہی چوبارے کو چھوڑنا پڑا۔ اس دن کوئی تہوار تھا۔ گلی میں خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں

بیٹھے بیٹھے اچانک ریشماں کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ پچھم کی طرف سے اس نے کونجوں کی ایک ڈار آتی دیکھی۔ اور ریشماں کے سینے میں چھپی ہوئی کونج بھی پھڑپھڑانے لگی۔ کونجیں اپنے دیس کو جا رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کب جائے گی اپنے دیس۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

چوبارے کے چھجے تلے رحمان اپنی تھیلی نکالے ٹٹول رہا تھا۔ اور کچھ کچھ بے چین سا معلوم ہوتا تھا۔ ڈونگے بنانے کے لئے ابھی اُسے چاندی سونے کے بہت سے تختوں کی ضرورت تھی۔ اور ریشماں بہت بیمار ہوگئی تھی۔ رحمان رہ رہ کر تھیلی کو ٹٹول رہا تھا اور ریشماں نیلے نیلے پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ کونجوں کی ڈار بہت دور نکل گئی تھی۔

ریشماں کسی ہیجانی کیفیت میں تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور چارپائی پر دھم سے گر پڑی۔ اور پھر جب اُسے ہوش آیا، تو اس کی چچی گل دامن اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ریشماں کا پیٹ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں برف کی طرح یخ تھے۔

"کیوں ریشماں کیا بات ہے؟" گل دامن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔

"اب کیا تکلیف ہے تجھے؟"

اور ریشماں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میرے سینے میں رُکی ہوئی روح ہچکولے کھا رہی ہے۔

"کیا تجھ سے بولا نہیں جاتا ریشماں؟" گل دامن نے اس کے ماتھے

پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

اور ریشماں نے سر ہلاتے ہوئے اشارے سے کہا۔

"نہیں بولا جاتا۔"

گل دامن نے رحمان سے کہا۔ "جاؤ جلدی سے ڈاکٹر کو بلالاؤ" وہ ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔ اور ریشماں نے اکھڑے اکھڑے سانس لینے شروع کر دیئے۔ کھڑکی سے باہر سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ریشماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو ندیاں پھوٹ کر بہنے لگیں۔ اور لانبی لانبی زعفرانی پلکیں آپس میں مل گئیں۔ ریشماں کا بدن جو اس سے پہلے برف کی طرح یخ تھا خود بخود گرم ہونے لگا۔ حرارت لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگی۔ اور اس نے گل دامن کو اشارے سے کہا۔

"نیچے سے کانگڑی ہٹا لو۔"

کانگڑی ہٹالی گئی۔ ریشماں نے جھر جھری لی۔ پھر پے بہ پے کئی کروٹیں بدلیں، اور برف کا تودہ بن گئی۔ حرارت جو اس کے جسم میں یکدم عود کر آئی تھی "آناً فاناً" کافور ہوگئی۔ ریشماں مرگئی۔ گل دامن بین کرنے لگی۔ اور ریشماں کے بازو سے بندھا ہوا زعفران کا تعویذ مردہ جھینگر کی طرح ٹھنڈے جسم سے چمٹ گیا!

ہر چیز کہر میں چھپی ہوئی تھی۔ جھیل کے چاروں طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے چنار کے درخت۔ صنوبر کے درخت ۔ ان کے پس منظر میں اونچے اونچے برف پوش پہاڑ۔ اور جھیل کا نیلا نیلا پانی بھی۔ ہر چیز کہر میں

چھپی ہوئی تھی۔

رحمان گردن جھکائے چپ چاپ ڈونگے میں داخل ہوا۔ بیگماں اور اس کی نانی کمبل تانے کانگڑی کے پاس پڑی تھیں۔ بیگماں سو رہی تھی۔ بڑھیا جاگ رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے اٹھی۔ اور رحمان کے گلے سے لپٹ کر رونے لگی۔ بڑھیا کو تار کے ذریعے ریشماں کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

وہ دونوں کافی دیر تک روتے رہے۔ اور پھر جب خوب رو چکے تو رحمان نے بڑھیا کو تھیلی دیتے ہوئے کہا۔

"پورا دو ہزار ہے دیدی۔"

"دو ہزار سے تو کیا چار ڈونگے بنائے گا" بڑھیا نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

"اس سے تو چار ڈونگوں کے پیندے بھی نہیں بنیں گے۔"

"تو فکر نہ کرو دیدی۔" رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اب کے جب میں آؤں گا تو دس ڈونگوں کی قیمت لے کر آؤں گا۔ سویرا ہوتے ہی میں بیگماں کو ساتھ لے کر لاہور جا رہا ہوں۔ ریشماں تو ہمیں بیچ منجدھار چھوڑ گئی۔"

بڑھیا تھیلی سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ ڈونگے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ جس میں چنار کے درختوں کی سرسراہٹ کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

کہر کے بادل بدستور ہر چیز پر پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اب ان میں ہلکا ہلکا گلابی نور گھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کی نہ جانے کن

چوٹیوں پر شفق پھول رہی تھی۔ بیگماں ڈونگے سے باہر نکلی۔ وہ سرخ اونی شال میں لپٹی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اُسے الوداعی بوسہ دیا۔ اور دہکتی ہوئی کانگڑی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ جس میں انگاروں کی شفق پھول رہی تھی۔

# "گُل رُخ"

گُل رخ — کتنا خوبصورت نام ہے۔ اور وہ خود بھی بڑی خوبصورت تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا سرخ گلاب تھا۔ وہ آہو چشم تھی۔ اس کے کالے چمکدار بال اس کے کولہوں کو چھوتے تھے۔ اور اس کا بوٹا سا قد سر سے لے کر پاؤں تک ترشا ہوا تھا۔

گل رخ نے اپنے گاؤں کے چرواہے مدامیر سے عشق کیا۔ تاروں بھری رات میں وہ ندی کنارے بادام کے پیڑ تلے رباب بجاتا تو گل رخ کے من میں چھپا ہوا مور ناچنے لگتا۔ اس کے گورے گورے گوشت میں ابھری ہوئی نیلی نیلی رگوں میں کیچوے سے رینگنے لگتے۔ اور اس کے سانسوں سے حنا کے پھولوں کی مہک آنے لگتی۔ وہ مدہوش ہو جاتی اور اسی مدہوشی میں ایک دن رات کے اندھیرے میں چادر کی بُکل مار کر چپکے سے وہ مدامیر کے پاس چلی آئی۔ بادام کے پیڑ کی ننگی شاخوں میں شگوفے اور کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چاند ایک چٹان کے پیچھے قندیل کی طرح خلا میں لٹک رہا تھا۔ مدامیر کو معلوم تھا کہ گل رخ اسے پیار کرتی ہے۔ برسات کی وہ بھیگی بھیگی شام اُسے بھولی نہ تھی۔ جبکہ اُس کی بھیڑیں ندی کے اُس پار سبزہ زار میں گھاس چر رہی تھیں اور کسی چٹان پر سے عقاب اس کی ایک بھیڑ پر جھپٹا تھا۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی سے بھیڑ کو اس کے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔ گل رخ ندی سے پانی لینے جا رہی تھی۔

زخمی بھیڑ کی گردن اور پیٹھ سے لہو بہ رہا تھا۔ گل رخ نے جلدی سے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر اس کے زخموں پر پٹی باندھ دی۔ اور پھر دیر تک مدامیر کے پاس کھڑی ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مدامیر کو معلوم تھا کہ اس کے رباب کے جادو نے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی کے دل میں محبت کی ٹیسیں بھر کر اُسے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ اندھیروں میں ایک بہت بڑے اندھیرے کی ٹکل مار کر اُس کے پاس چلی آئی ہے۔

گل رخ اپنے دل کے ساتھ آخری فیصلہ کر کے آئی تھی کہ وہ اب گھر واپس نہ جائے گی۔ مدامیر اُسے جلدی سے اپنے گھر میں لے گیا۔ سویرا ہوتے ہی وہ اپنی بھیڑوں کو بیچنے جا رہا تھا۔ پو پھٹنے سے بہت پہلے وہ گل رخ کو ساتھ لے کر اپنے ریوڑ کو ہانکتا ہوا سورج کے طلوع ہونے تک گاؤں سے بہت دور نکل گیا۔ منڈی میں مال کی بڑی مانگ تھی۔ اس کے سارے مال کا وہیں سودا ہو گیا۔ رقم تھیلی میں ڈالتے ہوئے مدامیر نے حنا کے پھول سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو میں ایک بیوپاری کے ساتھ باتیں کر کے ابھی آتا ہوں۔"

پر وہ نہ آیا۔ صبح سے شام ہو گئی۔ اجالے اندھیروں میں بدل گئے۔ گل رخ اُسے تلاش کرنے کو اٹھی۔ لیکن اُسے روک لیا گیا۔ وہ فروخت ہو چکی تھی۔ رباب کا جادو اُسے دو ہزار روپے میں فروخت کر گیا تھا۔ بھیڑوں کے ساتھ حنا کا پھول بھی بک گیا تھا۔ فقط دو ہزار روپے حنا کے پھول کی قیمت۔ گل رخ کی قیمت۔ محبت کی قیمت۔ اس دنیا کے بازار میں انمول چیزیں بے مول بھی بک جاتی ہیں۔ اور گاؤں کا چرواہا نئی بھیڑوں کا ریوڑ منڈی میں لانے

کے لئے واپس چلا گیا تھا۔ تاروں بھری رات میں ندی کنارے بادام کے پیڑ تلے بیٹھ کر کسی اور گل رخ پر رباب کا جادو چلانے کے لئے واپس چلا گیا تھا۔

گل رخ کے خریدار کا نام خوسنے تھا۔ خونی آنکھوں والا۔ گھر سے بھاگی ہوئی منہ کالی بھیڑوں کا ایک بہت بڑا بیوپاری۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اُسے دُور ایک اور شہر میں لے آیا۔ اور خنجر خان کے پاس پانچ ہزار روپے میں فروخت کر گیا۔

خنجر خان — یہ کسی ہتھیار کا نام نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا نام ہے۔ جو اُس بازار کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اُس بازار کے کونے پر پرانے وقتوں کی ایک مسجد ہے۔ جس کے نیچے دکانیں ہیں۔ اور مغرب کی جانب ایک پھاٹک ہے۔ جس کے سامنے کچھ زمین تکون کی شکل میں خالی پڑی ہے۔ یہ پھاٹک خنجر خان نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس کا دروازہ سارا دن مقفل رہتا ہے۔ لیکن شام کے وقت خنجر خان کے بلڈاگ پھاٹک کا دروازہ کھول کر تکون کی زمین پر چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ اور چارپائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کلیان گرم ہو جاتے ہیں۔ پشوری تمباکو کے دھوئیں سے سارے ماحول میں کلوروفارم کی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ چائے اور قہوے کے دور چلتے ہیں۔ اور پیپل کی شاخوں سے لٹکتے ہوئے پنجروں میں خان کے بٹیر ٹپاختے ہیں۔ یہ پیڑ تکون کے سرے پر اگا ہوا ہے۔ اور نہ جانے کب سے اُگا ہوا ہے۔ اس کی کہانی خان کی کہانی سے بھی پرانی ہے۔

خنجر خان بٹیر باز ہے۔ مرغ باز ہے۔ اس نے انسانی بریڈ کے کتوں

کے علاوہ وہ کتے بھی لڑایا کرتا ہے۔ اس پھاٹک میں اس کے لڑاکے کتے اور اصیل مرغ رہتے ہیں۔ وہ ریس کھیلتا ہے۔ سٹہ کھیلتا ہے۔ چرس، افیون اور شراب خوب پیتا ہے۔ کم سے کم دو تین سو روپے روزانہ کی آمدنی ہے۔ جس کا اُسے کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ اُس بازار میں اس کی بہت سی نوچیاں بیٹھی ہیں۔ جو اُس کے لئے چاندی پیدا کرتی ہیں۔ اور خان انہیں صرف کھانے کو روٹی دیتا ہے۔ اور پہننے کو کپڑا۔ اور ان کی نگرانی کے لئے اس نے انسانی نسل کے بلڈاگ رکھے ہوئے ہیں۔ جو کھولی کا دروازہ بند ہونے پر پہلے سے زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اُس بازار میں چُھپ چُھپ کر آنے والے شریفوں کے بھیس میں کبھی کبھی بدمعاش بھی آجاتے ہیں۔ اور واپس جاتے ہوئے گسبن کا گوشت بھی نوچ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس بازار میں خاص کر ایسے لوگوں کو تو خوفناک بھیڑیئے سمجھا جاتا ہے۔ جو کسی منہ کالی بھیڑ کو باتوں میں لگا کر کسی باڑے سے بھگا لے جاتے ہیں۔ خنجر خان ایسے منہ کالی بھیڑوں کے بیوپاری انسانی بریڈ کے بلڈاگ خاص کر ایسی بھیڑوں کی دیکھ بھال کے لئے ہی رکھتے ہیں۔ جو ان کی بھیڑوں کی ہر طرح رکھوالی کرتے ہیں۔

خنجر خان کی چاندی کی لیشم والی بھیڑیں صبح کے وقت باغ کی سیر کرنے جاتی ہیں۔ اور اوس سے بھیگے ہوئے ہرے ہرے ٹھنڈے ٹھنڈے گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتی ہیں۔ وہ سب ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی سپرداری اور حفاظت میں سیر کرنے جاتی ہیں۔ جس کا نام گل قدم ہے۔ وہ ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کہ کوئی بھیڑ باغی ہو کر کہیں بھاگ نہ جائے یا کسی طرف سے کوئی بھیڑیا کسی بھیڑ پر

حملہ نہ کر دے۔

گل قدم نشیلی نسوار کی رسیا ہے۔ پل پل بعد نسوار کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈالتی ہے۔ اور پر چ پر چ پیک کی پچکاریاں چھوڑتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی یہ پنیر کتیا ہاتھ میں موٹا ساڈنڈا لئے اپنے آقا کے ریوڑ کو ہانک کر باغ میں لے جاتی ہے۔ خان اس پر بڑا خوش ہے۔ اس پر اسے پورا پورا اعتماد ہے۔ وہ اس کی ٹین کی ڈبیا میں نشیلی نسوار کبھی کم نہیں ہونے دیتا۔ اور کبھی کبھار اُسے چسکی بھی لگوا دیتا ہے جس کے نشے میں اس کی پنیر کتیا کھُردری آواز میں گایا کرتی ہے۔

دا سا پڑ سانے زماں بہرے خُدا یا را
مکڑا دا جور و ستم یادہ ہائے ہائے

اور پھر نہ جانے کس گاؤں کا۔ کس قبیلے کا رباب بجانے والا کوئی چرواہا یاد آجاتا ہے گل قدم کو۔ جس کے تصور میں نہ جانے کس ندی کے کنارے بادام کے پیڑوں میں شگوفے پھوٹتے دکھائی دیتے اُسے اور اس کی آنکھوں سے بادام جتنے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اور خان کے بلڈاگ اپنی زبان باہر نکال کر اس کے رخساروں پر رکے ہوئے آنسو چاٹتے ہیں۔ گل قدم ان کے لئے گاڑھی لسی کا بھرا ہوا مرتبان ہے۔ وہ جب زندگی کی تپش سے ہانپتے ہوئے آتے ہیں تو اپنی پیاس بجھانے کے لئے اُس مرتبان میں اپنی لپکتی، ہانپتی، کپکپاتی زبان ڈال دیتے ہیں۔

گل رخ اپنی خوشی سے منڈیوں اور بازاروں میں بکنے والی عورت نہ تھی۔ اس نے اس دھندے میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ تو خان نے اُسے بڑی سخت سزائیں دیں۔

کئی کئی دن تک اُسے کھانے پینے کو صرف اتنی روٹی اتنا پانی ترسا ترسا کر، تڑپا تڑپا کر دیا گیا۔ جس سے وہ صرف زندہ رہ سکے۔ اس کے بال باندھ کر اُسے چھت سے لٹکایا گیا۔ پاؤں باندھ کر کنویں میں ڈالا گیا۔ اس کے ساتھ اور بہت سی بدسلوکیاں کی گئیں۔ اور وہ بکنے پر مجبور ہو گئی۔ خان کے پانچ ہزار روپے تو ایک ہی مہینے میں وصول ہو گئے۔ اس کے بعد منافع ہی منافع تھا۔ بے چاری گل رخ کے لئے عجیب مصیبت تھی۔ اُسے ڈبل رول ادا کرنا پڑتا تھا۔ صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک اُسے اُس بازار میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور پھر جب اُسے اس کے ڈربے میں سونے کے لئے بند کیا جاتا۔ تو خان کے بھوکے بٹیرے پٹاخنے لگتے۔ اور اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ خان اُسے اپنے پاس بلا کر اپنی ٹانگیں اس کے سامنے پھیلا دیتا اور کہتا۔

"گل رخ میری ٹانگیں تو دباؤ"

اور باقی رات اس کی ٹانگیں دبانے میں ڈھل جاتی۔ وہ چپکے چپکے خون کے آنسو روتی۔ وہ اب بھی مدامیر کو بہت یاد کیا کرتی تھی۔ اس کی بُرائی اس کے ساتھ رہی۔ وہ ابھی تک اُسی کی تھی۔ اُسے ابھی تک اس کا انتظار تھا کہ وہ آ جائے۔ لیکن مدامیر تو نہ آیا۔

ایک دن اس بازار کا بدمعاش مانی جاٹ کا بھیس بدل کر اس کے پاس آ گیا۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ رم جھم ہو رہی تھی۔ مانی نے محبت کی مصوری شروع کر دی۔ اس کی کالی کالی زلفوں کی لٹ کا برش ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے کے کھلے ہوئے گلابی لبوں کے رنگ سے

اپنے دل پر حنا کے غنچے۔ گلابوں کے غنچے کھینچے تو گل رخ نے اپنی ساری زندگی کی تکون اس کے سامنے رکھ دی۔ اور مانی نے اُس سے ایک وعدہ کیا۔ اس کے رخساروں پہ لہراتی ہوئی لٹ کو ہٹا کر کہا۔

"تم ذرا فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس پنجرے سے نکال کر لے جاؤنگا۔"

اور پھر ایک طوفانی رات میں جبکہ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ جھکڑ بڑے زور سے چل رہا تھا۔ مانی نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ خان اور اس کے بلڈاگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس بازار کا بھیڑیا چپکے سے خان کی بھیڑوں کے باڑے میں گھس آیا۔ اور بڑے ڈرامائی انداز سے گل رخ کو لے کر فرار ہو گیا۔

خنجر خان اس کا تعاقب کرتا اور ضرور کرتا لیکن اچانک اس پر ایک بہت بڑی مصیبت آن پڑی۔ ایک بیوپاری وہ نئی بھیڑیں اس کے پاس فروخت کر گیا۔ ان کے لواحقین کھوج لگاتے لگاتے انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کی معیت میں انھوں نے خان کے باڑے پر چھاپہ مارا۔ اور مدعا برآمد ہو گیا۔ پولیس خان کو گرفتار کر کے لے گئی۔ مقدمہ چلا۔ مجرم کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

خان ابھی زندہ ہے۔ اور بقول اس کے وہ اس عرصہ تک زندہ رہیگا۔ وہ اس عرصہ تک کبھی نہیں مرے گا۔ جب تک کہ وہ گل رخ سے اپنا تیس ہزار روپیہ وصول نہیں کرے گا۔ وہ فرار ہوتے وقت اس کی جیب سے چابی اڑا کر یہ رقم سیف سے نکال کر لے گئی تھی۔ خان کو پورا پورا یقین ہے

کہ وہ اُسے اس کی زندگی میں کہیں نہ کہیں ایک بار ضرور ملے گی۔ اور وہ اُس سے
اپنی پائی پائی وصول کرے گا۔ جب سے خان قید سے چھوٹ کر آیا ہے،
بلاناغہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بٹیر کی بجائے ہر
وقت تسبیح دیکھنے میں آتی ہے۔ اور جس دن وہ کوئی نئی بھیڑ خریدتا ہے پرانی
تسبیح بدل دیتا ہے۔

# موم بتی

سورج نکل آیا تھا۔ پڑوسیوں کی دیوار پر پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے مرغا بولا تو بابا ابسا جاگ گیا۔ لیٹے لیٹے اُس نے جمائی لی۔ اور پھر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آنگن میں نیم کے پیڑ پر چڑیاں چہک رہی تھیں۔ اونچے اونچے مکانوں کی ممٹیوں اور منڈیروں پر سورج کی سنہری کرنوں کے پھول کھلنے لگے تھے۔ ہر چیز جاگ اٹھی تھی۔ اس کی سوئی ہوئی سوچیں بھی جاگ اٹھیں اور وہ سوچنے لگا کہ سورج کی کرنوں کے سنہری پھول اونچے مکانوں کی منڈیروں پر ہی کھلتے ہیں۔ اس کی زندگی کے گہرے اندھیروں میں سورج کی کرن کا کبھی کوئی سنہری پھول نہیں کھلا۔ ان اندھیروں ہی میں اس کی گھر والی اس سے بچھڑ گئی۔ اور اپنی نشانی پانچ سال کی ایک بچی اس کے پاس چھوڑ گئی۔ جس کو اس نے بڑی مشکل سے پالا پوسا۔ جوان کیا۔ بالی تھا جس کا نام۔ جس کے بارے میں وہ ہر وقت یہی سوچا کرتا تھا کہ خدا اگر کوئی سبب بنا دے تو وہ اسے جلدی سے کہیں بیاہ دے۔ بیٹیاں اپنے گھر ہی بھلی لگتی ہیں۔ اور پھر وہ محلہ جہاں بابا رہتا تھا ٹھیک نہیں تھا۔

گلی کے موڑ پہ چائے والے کی دکان تھی۔ جہاں محلے کے آوارہ گرد اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ایک دن بابا نے بالی کو منڈیر پہ ایک آوارہ لونڈے کے سامنے کھڑے دیکھ لیا۔ وہ رومال ہلاتے ہوئے فلمی گیت گا رہا تھا۔ بابا ابسے نے اس دن

بالی کو بڑا ہی مارا۔ بالی نے کان پکڑے اور ناک سے زمین پر لکیریں نکالتے ہوئے توبہ کی کہ پھر کبھی ایسا نہ کروں گی۔

چائے کی دکان سے آگے ایک کوچوان کا ڈیرہ تھا۔ جس کی جورو کا نام بی بی تھا۔ اس کا رنگ تو سانولا تھا لیکن نقش بڑے تیکھے۔ تیز تلوار۔ سر سے لے کر پاؤں تک سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ وہ بڑے تنگ ریشمی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ محلے کے ہر معاملے میں سب سے آگے نظر آتی تھی۔ اس ڈیرے کے ساتھ ہی ایک ڈیری فارم تھا۔ جہاں دودھ سے مکھن نکالتے تھے۔ وہاں ایک عورت ماجھی مکھن والی بڑی مشہور تھی۔ وہ مکھن بہت کھاتی تھی۔ عمر تو اس کی چالیس سے اوپر تھی لیکن ڈیل ڈھول اور قد کاٹھ سے انتیس تیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ بڑی نٹ کھٹ۔ بڑی کایاں۔ ڈیری فارم میں صبح شام گوالے دودھ بیچنے آتے تھے۔ اور ماجھی مکھن والی ان کی ٹہل سیوا کیا کرتی تھی۔

اس محلے کو چھوڑنے کی بابا نے بڑی کوشش کی لیکن اتنے کم کرائے پر اس کو اور کہیں ایسی جگہ نہ ملتی تھی۔ ایک کوٹھری اور اس کے آگے آنگن۔ جس میں نیم کا ایک پیڑ۔ جس پر چڑیوں کا چہکنا بابا کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کے اکیلے دم کی بات ہوتی تو بابا کسی سڑک پر ہی ڈیرے ڈال دیتا۔ مگر مشکل تو ساری اس کے لئے بالی کی تھی۔ اللہ وہ مشکل اب حل ہوتی نظر آرہی تھی۔ بابے کو بگڑی پر ایک دکان مل رہی تھی۔ جہاں بابا صبح کے وقت نہاری اور دوپہر کو بھلے پکوڑیاں بیچنا چاہتا تھا۔ اور دنوں ہی میں معقول رقم جوڑ کر بالی کا کہیں بیاہ کر دینے کے خیالی خاکے تیار کر رہا تھا۔

بابا تیسرے بازار میں بیوپاریوں کی گانٹھیں اٹھایا کرتا تھا۔ ایک بیوپاری کے ساتھ

اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لہٰذا اس نے دکان کا معاملہ طے کرنے کے لئے اپنے دوست بیوپاری سے کہا۔ وہ اُس دن بڑا مصروف تھا۔ بولا۔

"بابا کل بات کروں گا دکاندار کے ساتھ۔ فکر نہ کرو تمہارا کام ہو ہی جائے گا۔"

آج کا دن بابا کی زندگی میں بڑا ہی اہم دن تھا۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ بابا کے بیوپاری دوست نے دکان دار کے ساتھ بات چیت کرنا تھی دکان کے لئے۔ بابا نے جمائی لی اور چارپائی سے اٹھا۔ اُسے خدا کے گھر سے امید تھی کہ آج اس کا کام ہو جائے گا۔ اس نے مٹی کے پیالے میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں بالی بھی جاگ گئی۔ گھر میں آٹا ختم ہو رہا تھا۔ بابا نے جلدی سے اُسے بازار سے آٹا لا دیا۔ اور اللہ کا نام لے کر کام پر چل دیا۔

سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ بابا ڈیری فارم کے پاس سے گزرا تو وہاں بہت سے ریڑے کھڑے تھے۔ دودھ سے بھرے ہوئے ڈول لینے نیچے اتار رہے تھے۔ ماچھی چولہے کے پاس بیٹھی گوشت بھون رہی تھی۔ ہونٹوں پہ دنداسہ مل رہی تھی۔ ایک گوالا اُسے ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے مست ہوا بیٹھا تھا۔ کچھ ہوش نہ تھا اس کو۔ حقے کی نڑی منہ سے نکال کر نتھنوں میں لے رہا تھا۔ ایک اور گوالا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ماچھی کی کاجل سے سنواری ہوئی آنکھوں کی اندھیر نگری میں آندھیوں کے ساتھ ساتھ اڑا جا رہا تھا۔ اپنی آنکھوں میں بھی سرمہ ڈالنے کے لئے بڑے چاؤ سے اس نے واسکٹ کی جیب سے سُرمہ دانی

نکالی۔ سرنچو نکالا۔ سلائی بھر کر ہاتھ اٹھایا۔ دھیان تھا ڈھول مکھن میں لگا ہوا۔ اس کو اس کا احساس ہی نہ ہوا کہ آنکھیں کہاں ہیں۔ سرمے کی بھری بھرائی سلائی کان میں گھسیڑ لی۔

ایک اور گوالا جو مرلی بغل میں دبائے شاید رانجھا بنا کھڑا تھا۔ ڈھول مکھن کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ ایکا ایکی اس کو اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کا خیال آیا سامنے سے حجام چلا آتا تھا۔ اس کے آگے بیٹھ گیا۔ کہتا تھا داڑھی مونڑ دے بولا ٹنڈ کر دو۔

رانجھا بالناتھ کے ٹیلے پر پہنچا تھا تو سب سے پہلے انھوں نے اس کی ٹنڈ ہی کی تھی۔ جوگ کی پہلی سیڑھی۔ اور وہ گوالا اس وقت مکھن کے ٹیلے پہ جا رہا تھا عشق کی پہلی سیڑھی۔ مکھن کھاؤ اور مرلی بجاؤ۔ اس گوالے کو بھی اپنی مرلی یاد آگئی جو اس نے بغل میں دبائی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں مکھن کی مورت میں۔ پاس ہی کھڑے ہوئے ریڑے میں سے نکی کا ٹانڈا کھینچ کر اُسے بجانے لگا۔ بیخودی کے عالم میں اس کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مرلی بول رہی ہے یا نہیں۔ عشق کے ٹیلوں پر یہی ہوتا ہے۔ مرلی تو تھوڑی مختصر سی چیز ہے وہاں کسی وقت مرلے بھی نہیں بولتے۔ مگر عشق حقیقی کے ٹیلوں کی اور بات ہے۔ وہاں وہی پہنچ سکتے ہیں جو انگ بھبھوت رما کے۔ کان چھدوا کے جوگ لیتے ہیں۔ اور سارے جگ کی چوٹیں اپنے سر پر سہتے ہیں۔ وہ عشق مجازی نہیں۔ پھسلن بازی نہیں کہ مکھن کھاتے جاؤ اور پھسلتے جاؤ۔ پھسلنا یہاں پاپ ہے۔ مگر اتنا اونچا کون آتا ہے۔

ہیریں جب ڈیری فارموں میں مل جائیں تو عشق حقیقی کے ٹیلوں پہ جا کے کان چھدوانے کی کیا ضرورت ہے۔

بابا ابراب کوچوان کے ڈیرے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مالشیا ایک گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ کوچوان کی جورو بی پی رونس کے نیچے موڑھے پر بیٹھی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کو مہندی لگائی ہوئی تھی۔ منہ میں پان تھا۔ اس کی نظریں گھوڑے کا گوشت ٹٹول رہی تھیں کہ کہاں موٹا کہاں پتلا ہے۔

گردن جھکائے چلتے چلتے بابا ذرا اور آگے بڑھا تو اسے فیروزاں مل گئی۔ وہ اپنے بھائی کی بچی کو ڈاکٹر کے پاس لائی تھی۔ بابا کو دیکھ کر رک گئی۔ کسی زمانے میں بابا اس کی کٹھڑی میں اس کا کرایہ دار رہ چکا تھا۔ فیروزاں جب کبھی اور جہاں کہیں اُسے ملتی تھی بالی کا ضرور پوچھتی تھی۔ فیروزاں نے اس کے ساتھ اس دن بڑی ہی باتیں کیں جن میں بار بار بالی کا ذکر آتا رہا۔

بابا اپنے دوست بیوپاری کی دکان پر پہنچا تو اس نے بابا کو خوشخبری سنائی۔

"بابا تمہارا کام ہو گیا ہے۔ دکاندار تین سو روپیہ پگڑی مانگتا ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے؟"

بابا نے کوڑی کوڑی کر کے دو سو روپیہ جمع کیا ہوا تھا کہنے لگا۔

"میرے پاس تو کل دو سو روپے ہیں۔"

"اچھا تو ایک سو روپیہ میں اپنے پاس سے دے دوں گا۔" بیوپاری نے کہا۔

اور بابا نے اُسے بڑی ہی دعائیں دیں۔ سارا دن خوشی خوشی وہ اپنا کام کرتا رہا۔ شام ہوئی تو گھر کو لوٹا۔ وہ ڈیری فارم کے پاس پہنچا تو گوالے ماجھی مکھن کو تانگے میں ڈالے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے۔ وہ اوندھی لیٹی چیختے ہوئے

اناپ شناپ بک رہی تھی۔ آس پاس کی رہنے والیاں کواڑوں کی جھریوں میں سے دیکھ رہی تھیں۔ ماجھی شراب کے نشے میں سارا دن دل پشوری کرتے کرتے اب پشاوری نسوار بن گئی تھی۔ تانگہ جدھر سے گزرتا تھا ہر چیز چھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

بابا بھی چھینکتا ہوا کوچوان کے ڈیرے کے پاس سے گزرا تو روشنی میں دیا جل رہا تھا۔ جس کی سوتی جاگتی لو میں کوٹھڑی کا دروازہ کھٹ سے کھلا۔ بی بی باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض الٹی پہنی ہوئی تھی۔ ننگے پاؤں۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ جلدی سے اس نے گھوڑے کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور گھوڑے کا منہ چومتے ہوئے گانے لگی۔

چلی پیار دی ہوا مستانی گھنڈ لہہ گئے کلیاں دے

بابا ہنسا۔ اور تیز تیز چلتے ہوئے اپنے گھر کے آنگن میں آ گیا۔ اندھیرے میں اُسے یوں معلوم ہوا جیسے چھت پر کوئی دبے دبے پاؤں چل رہا ہے۔ وہ بھی دبے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس کے پاؤں خود بخود رک گئے۔ بالی کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

"کنی موٹی ہو گئی اے تیری دینی۔ تو کیہہ کھانا ایں؟" یہ بالی کی آواز تھی۔

"میں کھانا مکھن تے پنیا بادام۔ پر میں کیہا اج دس کو روپے مینوں ضرور دے۔ اوئیے مینوں بڑی لوڑ اے۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"سو منہ تیرا ہن تے میرے کول کجھ وی نہیں ہیگا۔ بابے نیں اندر نکرہ وچ دو سو روپیہ دبیا ہویا سی۔ میں کڈھ کڈھ تینوں دیندی رہی آں۔

ہن تے اوہتے کجھ وی نئیں ہیگا "۔ یہ بالی کی آواز تھی۔

اور بابا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی۔ کھڑکا سن کر اندھیرے میں ایک سایہ لمبا ہو کر نیم کے پیڑ پر سے رینگ گیا۔ بالی جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔ بابا اندر کوٹھڑی میں نکرے کی زمین کریدرہا تھا۔ اس نے ہنڈیا نکالی۔ اس میں کچھ نہ تھا۔ اسے ایسا چکر آیا کہ بیٹھا بیٹھا لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی بھی بالکل خالی ہو گئی ہے۔ اس کے آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے اور گہرے ہو گئے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر اس کی کھوپڑی میں سوچ کی ایک نئی کونپل نہ پھوٹتی تو اس کا وہیں کلیان ہو جاتا۔ وہ اٹھا اور جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ اور اس کا سامان ہی کیا تھا۔ دو چار پائیاں۔ دو تین برتن۔ بوسیدہ سا ایک ٹرنک۔ مٹی کا گھڑا تو اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ ایک چارپائی الٹی کر کے دوسری چارپائی پہ رکھ دی۔ صندوق اور برتن ان کے اوپر ٹکائے۔ اور بالی کو لے کر چل نکلا۔ گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا وہ ایک بارونق بازار میں آ گیا۔ جہاں ہر طرف روشنی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ بڑی چہل پہل ہو رہی تھی۔ ہر شے اگر بتی کی طرح سلگ رہی تھی۔ خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ گھنگرو چھنک رہے تھے۔ سریلی سروں کی پھوار سی پڑ رہی تھی۔ اونچے اونچے مکان۔ حویلیاں۔ چوبارے اور ان کے سجے سجائے دریچے۔ حسن کی قندیلیں اندھیروں میں جل رہی تھیں۔ بالی چور آنکھوں سے انہیں دیکھ دیکھ مسکرا رہی تھی۔

ایک حلوائی کی دکان کے پاس آ کر بابا نے بالی کو ایک طرف کھڑا کیا۔ اور

چپکے سے حلوائی سے کچھ پوچھا۔ اس نے بابا کو بڑے غور سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ مسکرایا۔ بولا۔

"اوہ جتھے لال بتی بل رہی اے۔ جتھے بھیڑ دجھا ہویا اے فیروزاں دا مکان اسے۔"

پیچھے ہٹ کر بابا نے بالی کو دیکھا۔ وہ چوک میں کھڑے ہوئے لونڈوں کی منڈی کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے اس کو آواز دی۔

"نی کڑئیے ٹر پو۔"

بالی جلدی سے بابا کے پاس آگئی۔ بابا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور ایک ہی جھونک میں جلدی سے دروازے کے اندر گھس گیا۔ آسمان میں جلتی ہوئی قندیلیں بادلوں میں چھپ گئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں زمین پر اتر رہی تھیں چوک میں کھڑے ہوئے لونڈروں کی منڈری سے آواز آئی۔

"بابے وی موم بتی بالی اے۔"

# دلرُبا

غم غلط کرنے کے لئے دلربا افیون کھاتی تھی۔ دو رتی طلوعِ آفتاب سے پہلے اور دو رتی غروبِ آفتاب کے بعد۔ اُدھر شفق سے افق کے اُداس کنارے رنگین ہو جاتے اور ادھر افیون کے نشے سے دلربا کی اداس آنکھیں۔
افیون کا کانچہ حلق سے نیچے اترتے ہی نشہ ہولے ہولے سلگنے لگتا اور دلربا بن ٹھن کر اپنے پالتو طوطے گلفام کو کندھے پر لئے اپنے اڈے پر بیٹھ جاتی۔ حقے کی نڑی منہ میں لے کر لمبے لمبے کش لگاتی۔ بنارسی تمبا کو افیون کے نشے میں ایک عجیب کیف پیدا کر دیتا۔ ہلکی ہلکی پھریریوں کی گود میں ہلورے لیتے ہوئے دلربا مزے میں آنکھیں بند کر لیتی۔ اور اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے اس کی مغرور جوانی واپس لوٹ آئی ہے۔ جیسے وہ پھر جوان ہو گئی ہے۔ اس کی ڈھلکی ہوئی چھاتیوں میں پھر وہی پہلا سا تناؤ آ گیا ہے۔ اور اس کی اُبھری اُبھری نیلی نیلی رگوں میں کیچوے سے رینگنے لگے ہیں۔
کتنا دلفریب۔ کتنا طربناک تھا وہ احساس۔ جو کہ افیون کھانے کے بعد بڑھاپے میں دلربا کے دل میں پیدا ہو جاتا۔ افیون کا سرور ہوتے ہی اس کے خیالوں کے دھندلکوں میں گذری بیتی جوانی کے رنگین سپنے جگنو بن کر ٹمٹماتے چلے جاتے۔ اور دلربا ان کا تعاقب کرتی۔ فضائے تصور میں ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی۔ کبھی سپنے چھپ جاتے کبھی دلربا چھپ جاتی۔

کتنا اچھا تھا وہ زمانہ۔ کتنے سہانے تھے وہ دن۔ کتنی حسین تھیں وہ راتیں۔ کتنا پیارا تھا وہ مہکا مہکا ماحول جس میں ہر شب دلربا کو اگربتی کی طرح سلگایا جاتا۔ ایک گلدستے کی طرح ایک مرمری دریچے میں سجا دیا جاتا۔ ایک بکاؤ گڑیا کی طرح ایک شوکیس میں لگا دیا جاتا۔ جبکہ وہ کستوری کے نافے اور گلاب کے پھول کی طرح ایک کھڑکی میں کھلا کرتی۔ جبکہ محبت کے مریض اُسے صندل کی طرح گھس کر دل پر لیپ لگایا کرتے۔ اور فضائیں مشکبار ہو جاتیں۔ جبکہ اس کی ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔ آنکھوں کے دبے دبے شوخ اشارے۔ سینے کے اُبھار کی دوپٹے میں چھپی چھپی کپکپاہٹ۔ چوڑیوں کی چھنکار۔ صندلی پیشانی پر چمکتے ہوئے جھومر کی جگمگاہٹ۔ اور اس کی آرسی کے ننھے ننھے کوندے رک رک کر چلتی ہوئی ہواؤں کو اپنے جادو سے تیز کر دیا کرتے تھے۔

کتنا اچھا تھا وہ وقت۔ کتنے سہانے تھے وہ دن۔ کتنی حسین تھیں وہ راتیں۔ کتنا بہار آفریں تھا وہ ماحول جس میں دلربا کے سانس بھی بہار بن کر مہک جاتے تھے۔ اور سازندے اپنا اپنا ساز لے کر بیٹھ جاتے۔ رات اپنی تمام رنگینیوں کو ساتھ لئے اُس بازار میں اُتر آتی۔ رنگو اندر سے بڑی بائی کا بڑا سا گنگا جمنی پاندان اٹھا لاتا۔ اور اُسے گاؤ تکیے کے پاس رکھ کر چلا جاتا۔ بڑی بائی آنگن میں بچھے ہوئے تخت پوش پر آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتی۔ لوبان سلگاتی۔ اور چپکے چپکے جلدی جلدی منہ میں کچھ پڑھنے لگتی۔ اور دلربا دریچے میں آنے سے پہلے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بڑی گہری نظر سے اپنے بناؤ سنگار کا آخری جائزہ لیتی۔ اُس بازار کا پھیرا تازہ گجرے، ہار اور گلدستے لے آتا۔ گجرے

اور ہار دلربا کے لئے اور گلدستے اس کے کمرے کی سجاوٹ کے واسطے۔ سازندے اپنے اپنے سازوں کے سُر ملانے لگتے۔ مختلف ساز۔ مختلف آوازیں۔ نغموں کی رم جھم۔ سُریلی سروں کے تانے بانے۔ طبلے کی دھمک، سارنگی کی جھنکار۔ تانپورے کی گونج۔ ہارمونیم کی تانیں۔ سرگم۔ الاپ۔ میٹھے میٹھے میٹھے بول۔ انترے اور استھائیاں۔ راگ راگنیاں۔ اُن کا مکھ بلاس۔ ان کی آرو ہی امروہی۔

سا رے گا ما پا دھا نی سا

سا نی دھا پا ما گا رے سا

سات سُر۔ دس ٹھاٹھ۔ چھ راگ۔ سارا سنگیت انہی میں ہے۔ لیکن بڑی بائی کہا کرتی تھی۔ سنگیت کے سات نہیں آٹھ سُر ہیں۔ اور وہ آٹھواں سُر ہے لا۔ یعنی جو کچھ تیری جیب میں ہے ادھر لا۔ بڑی بائی کہتی تھی زندگی کے سنگیت کا یہ آٹھواں سُر بڑا ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا سنگیت نامکمل ہے۔ اس سُر کے بغیر زندگی کی سب آوازیں بے سُری ہیں۔ اس کے بغیر زندگی کا کوئی راگ، کوئی راگنی جنم نہیں لے سکتی۔ کوئی ٹھیکہ، کوئی تال پیدا نہیں ہو سکتا۔ تین تال سب تالوں کی ماں ہے۔ سب تال اسی سے جنم لیتے ہیں۔ تین تال کے سولہ ماترے ہوتے ہیں۔ اور ایک روپیہ کے سولہ آنے۔ دو اٹھنیاں چار چونیاں۔ آٹھ دونیاں۔ یہ دولت کے ماتروں کی تقسیم ہے۔ یہ سب زندگی کے تال کے ماترے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو زندگی بے تال ہے۔ بے گرُ ہے۔ اس کا کوئی سم نہیں ہے۔ بڑی بائی اس آٹھویں سُر کو ہر رنگ میں بڑی استادی

اور خوبصورتی سے لگاتی تھی۔ اسی لئے تو رنگو نے اُس سے پیت لگالی تھی۔
رنگو۔ چھبیس ستائیس سال کا ایک خوبصورت لونڈا۔ گورا رنگ گھنگریالے بال۔ چوڑا چکلا سینہ۔ بازو بڑے مضبوط۔ موٹی گردن۔ گوشت سے بھری ہوئی لٹکتی ہوئی رانیں۔ جیسے شہد سے بھرے ہوئے چھتے لٹکتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک روغنی تھا رنگو۔ روغنی بڑی بائی کی زبان میں اس کو کہتے تھے جس میں خون اور چربی بکثرت ہو۔ اور تازی تازی ہو۔ جوانی کی گرمی اور رنگوں سے بھرپور۔
بڑی بائی کو دمے کی بیماری تھی۔ حکیم جی نے دوائی کے ساتھ چوزوں کی یخنی تجویز کی تھی۔ رنگو بڑی بائی کو اُس بازار میں ایک دن لاوارث چوزے کی طرح آوارہ گردی کرتے ہوئے مل گیا۔ بڑی بائی نے بڑی ترکیب سے اُسے پکڑ لیا۔ فاقوں کا مارا ہوا تھا رنگو۔ بڑی بائی نے دانہ ڈالا۔ ڈورے پھینکے۔ اور گھیر گھار کر دل کے ڈربے میں بند کر لیا کہ کہیں اڑ نہ جائے۔ بس کھانے پینے کے وقت ہی اُسے نکالا کرتی تھی۔
رنگو کے صرف دو کام تھے۔ بڑی بائی کی مالش کرنا اور شام کو جب دلربا سنگار کرنے لگتی تو وہ بڑی بائی کا پاندان گانے بجانے والے کمرے میں اٹھا لاتا۔ اتنے میں بڑی بائی پان چباتے ہوئے آجاتی۔ اور سازندوں سے ذرا ہٹ کر گاؤ تکیے سے کمر لگا کر بیٹھ جاتی۔ پاندان کھول کر سروتا نکالتی۔ چھالیاں نکالتی۔ اور بڑے نخرے نخرے سے مزے مزے انہیں کترنے لگتی۔ سازندوں کی سریلی آوازوں میں سروتے کی کٹ کٹ یوں معلوم ہوتی۔ جیسے کتا ہڈی چبا رہا ہو۔
بڑی بائی بانجھ تھی۔ بنجر زمین۔ جس میں کبھی کوئی دانہ نہ اُگ سکا حالانکہ چلانے نے

والوں نے اچھی طرح ہل چلائے۔ سہاگے پھیرے۔ وقت پر پورا پورا پانی دیا مگر کوئی دانہ نہ اگ سکا۔ جو بھی جنس بوئی گئی مٹی میں مٹی ہوگئی۔ اب کوئی کیا کرتا زمین ہی ایسی تھی۔ کلر اٹھی زمین۔ جس میں قلمی شورے کی مقدار بہت زیادہ تھی۔ اتنی زیادہ کہ بڑی بائی کے پسینے سے بھی قلمی شورے کی بو آتی تھی۔ جسے دبانے کے لئے وہ دن میں کئی بار خوشبودار صابن سے نہایا کرتی۔ خوشبوئیں لگایا کرتی۔

بڑی بائی نے اپنی کوکھ کو ہرا کرنے کی بڑی کوشش کی۔ کوئی دائی۔ کوئی دوا، کوئی حکیم، کوئی ڈاکٹر نہ چھوڑا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اسی کشمکش میں وہ وقت بھی آگیا۔ جبکہ اُسے اپنی زندگی کے دروازے پر بڑھاپے کی دستک صاف صاف سنائی دینے لگی۔ اور وہ گہری سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

جہاں وہ تھی وہاں تو بڑھاپے کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں بڑھاپا ایک بہت بڑے عذاب کا نام ہے۔ اُس بازار میں بوڑھا باسی گوشت نہیں بکتا۔ وہاں جھریوں سے بھرے ہوئے، کھانستے ہوئے، بجھے ہوئے چہروں کو گرمجوشی سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہاں اندھیروں کے نہیں چاندنی راتوں کے سوداگر آتے ہیں۔ وہاں چاند ستاروں کے سودے ہوتے ہیں۔ وہاں پرانے نہیں نئے چراغوں کو چاہت سے دیکھا جاتا ہے۔ اُس بازار کے پروانے بڑے چوکس ہوتے ہیں۔ بجھتے ہوئے چراغوں پر فدا نہیں ہوتے۔ لہذا اندھیروں سے بچنے کے لئے وہاں پرانے چراغ بجھنے سے پہلے ہی نئے چراغ جلا دیئے جاتے ہیں۔ بڑی بائی کے پاس اپنا کوئی نیا چراغ نہ تھا۔ وہ زندگی کے ایک بازار سے ایک نیا چراغ لے آئی۔ نیا چراغ۔ نئی شمع ۔ دلربا ۔ جسے کوئی عُمری پردے دار

بڑے پردے سے چھن کر نہ جانے کن پردوں میں چھپ گئی تھی۔ اور بڑی بائی بڑے صاحب کو ڈالی دے کر اُسے حرامی بچوں کے ہسپتال سے لے آئی۔ اس کا نام دلربا رکھا۔ بڑے نازوں سے اُسے پالا پوسا۔ لکھایا پڑھایا۔ اور پھر سنگیت کی ایک کومل سُر بنا کر رہ اگ رنگ کے رنگ محل میں بٹھا دیا۔

شام کے وقت آسمان میں ستارے طلوع ہوتے تو دلربا نت نئے نئے پشواز پہن کر اُس بازار کے ایک خوشنما دریچے میں طلوع ہوا کرتی تھی۔ اور بازار میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ لوگوں نے اس کے کئی نام رکھے ہوئے تھے۔ اُسے کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔

چاند ستاروں کی جھنکار تو سنائی نہیں دیتی۔ لیکن دلربا کی پازیب کی جھنکار تو بازار کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک سنائی دیا کرتی تھی۔ سلگتے ہوئے عنبر اور کستوری کی خوشبو خوابناک ہی سہی۔ لیکن جب دلربا اس چھنکتے اور گنگناتے ہوئے ماحول میں اگر بتی کی طرح سلگا کرتی۔ تو چلتے پھرتے لوگوں پر چھنکتا اور گنگناتا ہوا جادو چل جاتا۔ اور انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نیند میں چل رہے ہیں۔ وہ سب چلتے چلتے اونگھنے لگتے۔

دلربا دریچے میں آتی تو بھرے بازار میں زلزلہ سا آجاتا۔ لوگ اس کے حسن کے جلووں میں کھو جاتے۔ اس کی اچھوتی اور انوکھی جوانی کے تذکرے ہونے لگتے۔ جھکتے ہوئے جادو کے اندھیروں اور اجالوں میں سوتے جاگتے لوگ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ ایک شمع اور لاکھ پروانے۔ ایک عورت کئی افسانے۔

ایک دلربا اور کئی دیوانے۔ اس کی کاجل سے سنواری ہوئی آنکھیں جدھر اُٹھ جاتیں بے شمار بھوکی پیاسی نظریں ان کا تعاقب کرتیں۔

بے شمار آنکھیں۔ بے شمار ہونٹ۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ گنگناتے ہوئے ہونٹ۔ لمبے لمبے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لیتے ہوئے ہونٹ۔ بدنما بھی خوشنما بھی۔ اور مونچھیں۔ نقلی اور اصلی مونچھیں۔ ہر قسم کے لمبے چوڑے پتلے موٹے ناک۔ داڑھیاں۔ چھوٹی بڑی داڑھیاں۔ کوئی سادہ۔ کسی پر وسمے مہندی یا خضاب کا کوٹ۔ وارنش۔ کالے گورے چہرے۔ چیکبرے چہرے۔ اجنبی چہرے۔ جانے پہچانے چہرے۔ آس پاس پھیلے ہوئے اندھیروں اور اجالوں میں دلربا کی آنکھیں بے شمار صورتیں۔ بے شمار نقوش۔ بے شمار خاکے تصویریں اور سائے۔ ابھرتے ہوئے۔ اجاگر ہوتے ہوئے۔ اپنے قریب آتے ہوئے دیکھتیں۔ دلربا کی آنکھیں۔ جیسے کسی نتھری ستھری جھیل میں دو کنول کھلے ہوں۔ جیسے کسی کان میں دو ہیرے جگمگا رہے ہوں۔ اور دلربا بھی حسن کی کان تھی۔ جس میں حسن و جمال کے بڑے نایاب ہیرے تھے۔ کئی علی بابے۔ کئی چالیس چور انہیں چُرانے آئے لیکن دلربا کھُل سم سم کے الفاظ سے کھُلنے والا دروازہ نہ تھی۔ وہ لوہ لاک کا بڑا مضبوط سیف تھی جس کا قفل توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ جو صرف اپنی چابی سے کھلتا تھا۔ اور وہ چابی بڑی بائی کے پاس رہتی تھی۔ وہی اُسے کھولتی اور بند کرتی تھی۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ دولت کو دولت اپنی طرف کھینچتی ہے۔ چوروں کا وہاں کیا کام تھا۔ اور پھر دلربا خود حسن و دولت کی چور تھی۔ حُسن وہ خدا کے نگار خانے سے چُرا لائی تھی۔ اور دولت دُنیا کی چُرا رہی تھی۔ وہ بڑا دلیر

چور تھی۔ وہ دن کے اجالے میں بھی چوری کرتی تھی۔ وہ اپنے ہنر میں بڑی ماہر تھی۔ وہ بغیر کسی ریزر اور قینچی کے بڑی سے بڑی فولادی جیب کو کاٹ کر موزا بنا دیتی تھی۔ بڑی نٹ کھٹ۔ بڑی کایاں۔ بڑی چوکس تھی دلربا۔ وہ جو اُسے چوپٹ سمجھتے تھے گھن چکر تھے۔ بے رنگ۔ پٹی ہوئی۔ پرانی اور اُدری کھدری زندگی کو تو وہ اپنے کسی خانے میں آنے ہی نہ دیتی تھی۔ وہ بڑے بڑے شاطروں کے ہاتھ باندھ کر انہیں ایک طرف کنارے پر یوں بٹھا دیتی تھی۔ جیسے مداری بندر کو بکرے پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ جب کوڑیاں اپنے ہاتھ میں لیتی تھی تو بس پھر انہیں چھوڑنے کا نام ہی لیتی تھی۔ بڑی چیزے باز تھی دلربا۔ اپنے متوالوں کے ساتھ بڑے چیزے لیا کرتی تھی۔

حسن کے بازار میں آنے والے لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس سوائے اپنے آپ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بیچارے مجبور ہوتے ہیں۔ دل لگی کے لئے کسی صورت کے چبارے کے سامنے۔ چھجے کے نیچے یا کسی کھمبے سے لگ کر آنکھیں سینکتے ہیں۔ دل سینکتے ہیں۔ سینے کو ٹکور کرتے ہیں۔ دور ہی دور سے اُس صورت کو سونگھتے ہیں۔ بت بنے ٹکٹکی لگائے۔ جب تک ان کی ٹانگیں لگاتار کھڑے رہنے سے تھک کر خود بخود ٹپ ڈانس نہ کرنے لگیں بس وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ اور پھر جب وہ صورت لگاتار دیکھتے رہنے سے نسوارین کر ان کے دماغ کو چڑھ جاتی ہے تو چھینکتے ہوئے ہوا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دلربا اپنی زبان میں گردگھمے یا لالٹو لوگ کہا کرتی تھی۔

اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں۔ جو کہیں سے مفت کی پی کر چلے آتے

ہیں۔ سگریٹ اور پان بھی کسی سے ادھار لیتے ہیں۔ کپڑے بھی کسی سے مانگ تانگ کر ہی لیتے ہیں۔ باتیں بڑی کرتے ہیں۔ پرلے درجے کے باتونی۔ باتوں کے رسیا۔ باتوں کی آٹومیٹک مشین۔ آتے ہیں تو راستے میں کہیں رکتے نہیں ہیں۔ اپنی جھونک میں ادھر اُدھر گردن گھما کر بھی نہیں دیکھتے۔ کسی کی نہیں سنتے۔ بس اپنی سنائے جاتے ہیں۔ ہر پری کو باتوں ہی باتوں میں اپنی پاکٹ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے اپنی باتوں کے سبز باغوں میں لئے پھرتے ہیں۔ اور جو وہ پری پوچھ لے مسٹر پیسے کتنے ہیں تمہارے پاس؟ ذرا اپنا پرس تو دکھانا۔ تو مسٹر یکدم پاؤں پھیلا کر زمین پر اینٹھنے لگتے ہیں۔ جیسے اُنہیں مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ دلربا ایسے لوگوں کو سبز باغیے کہا کرتی تھی۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس دولت ہوتی ہے۔ جو اس بازار میں آکر اپنی مرضی کی حونالہ خریدتے ہیں۔ اپنی پسند کی ایک رات کی قلوپطرا کا سودا کرتے ہیں۔ اس بازار کے ہر شوکیس میں ایک گڑیا۔ ایک پُتلی۔ بولتی چالتی ایک تصویر۔ ایک گریٹا گاربو۔ ایک ایوا گارڈنر۔ ایک روزینا پوڈسٹا۔ ایک بیلا ڈاردی۔ ایک جینا لولو بریجڈا۔ ایک رونڈا فلیمنگ۔ ایک ہیلن۔ ایک پدمنی۔ ایک دیول دیوی۔ ایک ہیر۔ ایک سوہنی۔ ایک سسی۔ اپنے صرف ایک رات کے مہینوال۔ پنوں اور رانجھے کا انتظار کرتی ہے لیکن اس بازار میں ہر حسین جسم۔ ہر حسین چہرہ۔ ہر حسین رات۔ ہر حسین دن صرف دولت سے خریدا جاتا ہے۔ جہاں ہر چیز بکاؤ ہے۔ جس کے پاس پیسے ہوں خریدے۔ دلربا ان دولت مند لوگوں کو سوداگر کہا کرتی تھی۔ بیوپاری کہا کرتی تھی۔ بیوپاری

لوگ۔

اور چوتھی قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں۔ جوان سوداگر دن کے سونگھے ہوئے مسلے ہوئے پھول اٹھا کر اپنی جھولی بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوکر بن کر۔ دوست بن کر۔ مسخرے بن کر۔ خیر اندیش بن کر۔ ان کے مصاحب بن کر۔ بہر حال ان کے کچھ نہ کچھ بن کر انہیں بناتے ہیں۔ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ ان کا بچا کھچا کھاتے پیتے ہیں۔ ان کی اترنیں اوڑھتے ہیں۔ ان کی مسلی ہوئی سیجوں پر اگر موقعہ ملے تو یہ موقعہ شناس چپکے سے سو بھی جاتے ہیں اور ان کی خریدی ہوئی گڑیا کو ان کی غیر موجودگی میں اپنی محبت کے گلگلے کھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دلربا ایسے لوگوں کو چیچڑ یا پسّوئے کہا کرتی تھی۔ لسّی پینے والے۔ تلچھٹ پینے والے۔ کھرچن کھانے والے لوگ۔

اس بازار میں آنے والے لوگوں کی ان چار اقسام کے علاوہ دلربا نے ایک اور قسم بھی نکالی تھی۔ پانچویں قسم کے ان لوگوں کو وہ کارٹون لوگ کہا کرتی تھی۔ کارٹون لوگ۔ یہ نام دلربا کی اپنی اختراع تھا۔ کارٹون لوگ چال ڈھال میں۔ بول چال میں۔ شکل و صورت سے۔ قد کاٹھ میں۔ کھانے پینے اور پہننے میں ایک اچھے خاصے کارٹون ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے کارٹون ہونے کا خود بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ اس احساس ہی میں زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو اس فریم میں جڑ لیا ہوتا ہے۔ اور کسی صورت میں بھی اس سے باہر ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے۔ یوں بھی گزر سکتی ہے۔ بہر طور گزر سکتی ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا یہ نظریہ بلند ہو یا پست بہر حال ایک

نظریہ ضرور ہے۔ ان کا اپنا نظریہ۔ دلربا کے رنگ محل میں آنے والے کارٹون لوگ یہ تھے۔

(۱) صوفی جی عرف کالا جادو۔

(۲) مسٹر اخبار

(۳) چچا غالب کی روح

(۴) پنڈت سورج گرہن چاند گرہن

(۵) جانی کیا بیہ عرف چپلی کباب۔

یہ نام دلربا نے اپنے رنگ محل میں آنے والے کارٹون لوگوں کی ہر بات کے عین مطابق سوچ سمجھ کے رکھے تھے۔ صوفی جی عرف کالا جادو عامل روحانی تھے۔ تعویذ گنڈا ٹونہ ٹوٹکا کرتے تھے۔ سحر و پریخوانی میں بھی بقول ان کے وہ لاجواب تھے۔ ہر جمعرات کو دلربا کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور آتے ہی دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے۔ آنکھیں بند کر لیتے۔ اور منہ میں جلدی جلدی کچھ پڑھتے ہوئے دلربا کو رہ رہ کر روحانی پھونکیں مارا کرتے۔ اور ہر پھونک پہ ذرا سا سرک کر اس کے قریب قریب ہوتے جاتے۔ پائیوریا کی بیماری تھی انہیں۔ منہ سے ان کے بڑی بدبو آتی تھی۔ بس ایک ہی بھبکے سے دلربا کا دماغ پریشان ہو جاتا۔ بوکھلا کر کسی بہانے اٹھ جاتی۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ اور صوفی جی کا روحانیت کے اسٹیشن پہ شنٹ کرتا ہوا انجن بغیر وسل دیئے ایک لائن سے دوسری لائن پہ ہو جاتا۔ وہ بڑی بائی کے پاس جا بیٹھتے۔ دلربا کے دھندے کی ترقی کے لئے تعویذ لکھتے اور بڑی بائی قوام کا انہیں ایک پان پیش کرتی جس کے نشے میں وہ اپنے مرشد کا مرثیہ اور یا پھر معرفت میں ڈوبی ہوئی کوئی نعت پڑھتے۔

اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے۔ اتنے موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلتا۔ وہ روتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں لگا ہوا آنسوؤں کا کوئی پائپ پھٹ گیا ہو۔ آواز ان کی ایسی تھی جیسے کسی ٹرک کے پھٹے ہوئے ہارن کی۔ آس پاس بسنے والوں کے بچے بالے چونک کر چیخنے لگتے۔ مگر صوفی جی کہا کرتے تھے۔

"میری آواز پہ پریاں عاشق ہیں۔"

مسٹر اخبار ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جب آتا یہی اسی قسم کی باتیں اس کی زبان پہ ہوتیں۔

"دلربا اب کے میں نے تمہارے دانتوں کی تعریف میں سات صفحے کا ایسا ایڈیٹوریل لکھا ہے کہ تمہارے حریفوں کے سارے دانت کھٹے ہو جائیں گے۔ آنے والے شمارے میں پہلے اور آخری صفحے پر تمہاری چار تصویریں ہوں گی۔ چار تصویریں۔ چار مختلف پوز۔ فرنٹ۔ پروفائیل سیمی پروفائیل۔ کلوز اپ۔ چار بڑے چار منگ پوز۔ ایک ساری میں۔ ایک فراک اور شلوار میں۔ ایک برجس اور جیکٹ میں۔ اس پوز میں تمہارے سر پر جیکی کیپ ہو گی۔ اور چوتھا چوڑی دار پاجامے اور ڈھاکے کی ململ کی قمیض میں۔ دیکھو مجھے جھاڑنا جھڑکنا نہیں میں تمہارے ریشمی الجھے ہوئے بالوں کے معمے سلجھانے لگا ہوں۔"

مسٹر اخبار باتوں کے کالم پہ کالم چھاپے چلا جاتا۔ اور دلربا بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنا کرتی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز ہنسی کھیلا کرتی۔ جس کا

مطلب یہ ہوتا کہ میری پیزار جھاڑتی جھڑکتی ہے کسی کو۔ بہر حال تم جی بھر کر جھڑک جھاڑ لو۔

اور پھر مسٹر اخبار جیب سے بھڑ انکال کر نیٹ ہی پینے لگتا۔ اور جب نشہ تیز ہو جاتا تو پاؤں سے گھنگرو باندھ کر سازندوں سے کہتا ساز بجاؤ۔ اور خود نشے میں ناچنے لگتا۔ دلربا سے کہتا۔

"دیکھو دلربا آج تمھیں کھیرت ناٹیم۔ عنی پوری۔ کتھا کلی اور کتھک ناچ کے وہ نمونے دکھاتا ہوں کہ اودھے شنکر۔ میگھ رنجنی۔ گدمبری اور ناگ سوراولی کو بھول جاؤ گی۔ اگر تم میرے آگے اپنی شیرینی دھر دو تو ساری نرت ودیا صرف نو دن میں تمہاری ٹانگوں میں بھر دوں گا۔ یہ دیکھو کیسا پوز ہے۔ یہ رمبا۔ یہ فوکس ٹراٹ اور یہ ٹمینگو۔ تمھیں اس لباس میں دیکھ کر آج میری طبیعت بڑی خوش ہوئی ہے۔ بائی گاڈ تم اس لباس میں اس صدی کی حوا معلوم ہوتی ہو۔ دل یہی چاہتا ہے کہ آج تمہاری صورت کو بس دیکھتا ہی رہوں۔ اور ناچتا رہوں۔ ان ریشمی جھاڑوں سے جھانکتی ہوئی تمہاری گوری گوری پنڈلیوں کا مجھ پر ایسا جادو چلا ہے کہ جی چاہتا ہے ناچتا ہی چلا جاؤں۔ اور تم بھی اب ترُپ چال چلا ؤ۔ اکاؤ گی۔ صرف دو پتے۔ دو دل۔ دو پنچھی۔ اور یہ تمہارا طبلچی سالا پان کا غلام۔ مونچھیں دیکھو مردود کی۔ چینی جادوگر۔ رقیب روسیاہ۔ تمہارے چہرے اور میری آنکھوں کے درمیان سالا بے رنگی روند کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اسے کہو اکھٹی کرے اپنی تاش۔ اب یہاں چوپٹ چلے گی۔

کیرم چلے گی۔ کالی اور سپید گوٹوں کا کھیل۔ اور تم کوئین ہو۔ دلربا تم لال کوئین ہو۔ لو میں چلانے لگا ہوں سٹرائیکر۔ کوئین میری ہے۔ میری پوکٹ میں جائے گی۔ داد دو۔ دلربا مجھے داد دو کیسا سٹروک دکھایا ہے۔"

اور دلربا مسکراتے ہوئے کہتی۔

"صرف داد ہی نہیں۔ مسٹر ڈیئر اخبار میں تمہیں چنبیل اور پھگندر بھی دیتی ہوں۔ واقعی اس وقت تمہاری ٹانگیں اور تمہارے پاؤں رہنبے کی طرح چل رہے ہیں۔ ناچتے ہو کم اور گھاس زیادہ کھودتے ہو۔ ایسا سُست ناچ آجکل پسند نہیں کیا جاتا۔ ذرا رفتار دکھاؤ اپنے ناچ کی۔"

اور مسٹر اخبار یہ سنتے ہی بے تحاشا گھومنا شروع کر دیتا۔ جیسے کسی لٹو کو لپیٹ زور سے جالی مار دی جائے۔ اور وہ تیز تیز گھومنے لگے۔ اور پھر گھومتے گھومتے اخبار پھیٹ جاتا۔ بیہوش سا ہو کر زمین پر گر جاتا۔ اور ہانپنے لگتا۔ بیچارا مسٹر اخبار ایوننگ ایڈیشن۔ دلربا ایڈیشن۔ جس کی ساری سرخیاں، ساری خبریں دلربا کے گرد اگرد گھومتی تھیں۔

اور دلربا مسٹر اخبار کو بچے کی طرح تھپکتے ہوئے۔ اس کی طوطے کی سی ناک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔

"جاگو۔ مسٹر اخبار جاگو۔ صبح ہو گئی۔ اس وقت تو تمہیں گلیوں اور بازاروں میں دھڑا دھڑ بکنا چاہیئے۔ اور تم یہاں ڈھیر ہو رہے ہو۔ مائی ڈیر پیرٹ جاگو۔ سب پنچھی جاگ اٹھے۔ تم ابھی تک نیند میں ہو۔ آنکھیں

کھولو۔ مائی ڈیئر پیرٹ۔ آنکھیں کھولو آنکھیں۔ اللہ اللہ کرو میاں
مٹھو۔"

چچا غالب کی روح دلربا نے ایک شاعر کا نام رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی غزلیں اور گیت دلربا کو گانے کو دیا کرتا تھا۔ نام نہ جانے کیا تھا اس کا مگر تخلص صحرائی تھا۔ اور شکل وصورت سے بھی وہ بالکل صحرائی ہی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے اور سر کے بال بڑھے ہوئے۔ پیٹ بھی حد سے زیادہ بڑھا ہوا۔ گفتگو بھی شعروں میں کیا کرتا تھا۔ بولتا کم اور روتا زیادہ تھا۔ ایک بات اور دس آنسو۔ اور کبھی کبھی تو رونے کا اُسے اتنا شدید دورہ پڑتا کہ زخمی بھیڑیئے کی طرح چیخنے لگتا۔ آنکھیں اس کی ساون بھادوں کی جھڑیاں لگا دیتیں۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ جاتی۔ کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر مرغ بسمل کی طرح تڑپتا۔ اور پھر یکدم سناٹے میں چلا جاتا۔ جیسے شعروں کی تلاش میں دھرتی سے بہت دور نکل گیا ہو۔ اور دلربا اس کی توند کو سہلاتے ہوئے کہتی۔

"صحرائی صاحب آپ کا یہ دیوان تو بڑا بھاری بھرکم ہے۔ بڑا ضخیم ہے۔ اس میں غزلیں کتنی ہیں؟ رباعیاں کتنی ہیں؟ قصیدے کتنے ہیں؟ اور نظمیں کتنی ؟"

اور صحرائی صاحب فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اور دلربا کو رباعیاں سناتے۔ اپنی رباعیاں۔ عمر خیام کی رباعیاں۔ فرخی کی رباعیاں۔ رودکی اور عنصری کی رباعیاں۔ پنڈت سورج گرہن چاند گرہن جوتشی تھا۔ نجومی تھا۔ آتے ہی جنتری کھول لیتا۔ پرشن لگاتا۔ زائچے تیار کرتا۔ دلربا کا گورا گورا اسنبل سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر

ستاروں میں چلا جاتا۔ اس کی روپ ریکھا کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا۔ اور اس کی ہتھیلی کی لکیروں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہتا۔

"تم بڑی بھاگوان ہو دلربا۔ بھگوان تجھے بڑا دھن دے گا۔ توبھی روپ وان دیا کر۔ کسی دن رات کو میرے جوتش کنڈ میں آنا۔ جوتش کے بڑے بڑے چمتکار دکھاؤں گا۔ ستاروں سے تمہاری باتیں کراؤں گا۔"

اور پھر وہ اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ کہتا۔

"سندر ناری۔ سندر دلربا۔ تیرے اندر ایک اور دلربا سوئی ہوئی ہے۔ جب منگل بدھ ستارا کنبھ راسی میں آئے گا تو وہ جاگے گی۔ اور تو کسی کے ساتھ اس گھر سے بھاگے گی۔ اور جس دن یہ ہوگا سورج کو گرہن لگا ہوگا۔"

یہ جملہ سنتے ہی بڑی بائی چونک جاتی۔ سرو تا پنڈت سورج گرہن کی کمر پہ دے مارتی اور دھاڑتی۔

"ارے او پنڈت چاند گرہن سورج گرہن۔ بند کر اپنی بکواس۔ بھاگے گی تیری جورو میری دلربا کیوں بھاگے گی۔"

بڑی بائی کی جلی کٹی سن کر پنڈت سورج گرہن کو گرہن لگ جاتا۔ وہ اپنا سر اپنے کالے دوشالے میں چھپا لیتا۔ اور سیڑھیوں کی طرف سرک جاتا۔ بڑی بائی کا سروتا آنے سے پہلے ہی اس کی سپاری کٹ چکی ہوتی تھی۔ وہ تو بس دلربا کے گورے گورے ہاتھوں کے ساتھ گھڑی دو گھڑی کھیلنے آتا تھا۔ بس اسی میں اس کا کام ہو جاتا تھا۔

جانی کبابئیے عرف چیپی کباب کی دکان بڑی بائی کے چبارے کے بالکل سامنے تھی۔ وہ لنگڑا تھا اور کانا بھی۔ یعنی اس کے چہرے کے کیمرے کا صرف ایک لنز تھا۔ جس کا فوکس جب تک دلربا دریچے میں بیٹھی رہتی فقط اس کے چہرے پر ہی رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے کسی جنم میں سانپ ہو۔ دلربا کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہوئے اس کی اکلوتی آنکھ تھکتی ہی نہ تھی۔ بس مسلسل دلربا کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے انگلی کو سیخ سمجھتے ہوئے کباب اس پہ لگا دیا۔ اور آگ پہ دھر دی۔ آنچ سے اس کا اپنا گوشت جلا تو چونک پڑا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کباب سیخ سے اتار کر چٹنی کے کٹورے میں ڈال دیا۔ اور خالی سیخ گاہک کے آگے رکابی میں رکھ دی کہ نوش کیجئے۔ دلربا اس کی ایسی حرکتیں دیکھ کر ٹھاہ ٹھاہ ہنسا کرتی تھی۔ ایک دن دلربا کے ماتھے پہ چمکتے ہوئے جھومر کو دیکھنے میں جانی کبابیہ ایسا محو ہوا کہ آنچ کو تیز کرنے کے لئے اٹھاتا تھا کوئلہ اور اٹھا کر اپنی جوتی آگ میں رکھ دی۔

دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن۔ وقت کا چکر یونہی چلتا رہا۔ اور دلربا کے اندر سوئی ہوئی دلربا چپکے سے جاگ اٹھی۔ اُس دن سورج کو گرہن لگا ہوا تھا۔ دلربا ایک پٹھان خوبرو خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ خوبرو خان اُسے اُس بازار سے بڑی دور کوہستانی علاقے کے مرغزاروں میں لے آیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد دلربا بیمار ہو گئی۔ اور ایسی بیمار ہوئی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ خوبرو خان نے اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن خوبرو خان نے اُس سے کہا۔

”دلربا یہ کوہستانی علاقہ۔ یہ اونچے اونچے برف پوش پہاڑ۔ گھنے گنجان جنگل۔ اور ان ندیوں کا نمکین پانی تمہیں راس نہیں آیا۔ میں تمہیں راس نہیں آیا۔ یہ پیار تمہیں راس نہیں آیا۔ چلو میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔“

اور دلربا رضامند ہو گئی۔ خوبرو خان اُسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ گیا۔ دلربا کو دیکھتے ہی پالنے پوسنے کی محبت بڑی بائی کے سینے میں کھولنے لگی چند دن ناراض رہی اور پھر پہلے کی طرح اس کے ساتھ گھُل مل گئی۔ لیکن اب اس کی زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔

ایک دن اچانک وہ بیمار ہو گئی۔ دو دن بخار آیا اور تیسرے دن مر گئی۔ اور ایک اچھا خاصا مکان اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ جس کے نیچے تین چار دکانیں۔ اور اوپر کے حصہ میں بڑی بائی کی رہائش۔ سو سوا سو روپیہ ماہوار دکانوں کا کرایہ آتا تھا۔ اب دلربا اُس مکان کی واحد مالک تھی۔ رنگو بڑی بائی کی موت کے بعد زندگی میں ایک بار پھر لاوارث ہو گیا۔ اس کا خیال تھا اب وہ اس گھر سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن دلربا نے اُسے اپنے دل کے ڈربے میں بند کر لیا۔ کیونکہ وہ بڑی بائی کے پیار کی نشانی تھا۔ دلربا کی صحت پہلے سے دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ کوہستانی آسیب اُسے چھوڑ چکا تھا۔ وہ ایک بڑے قابل ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھی۔

رنگو کو فلک سیر کھانے کی عادت تھی۔ بڑی بائی فلک کی سیر کرنے کے لئے افیون کی ایک معجون بنایا کرتی تھی۔ جو بہت سی چیزوں کا مرکب تھی۔ کستوری، عنبر،

موتی، طباشیر، الائچیاں، سونے چاندی کے ورق اور نہ جانے کیا کیا کوٹ پیس کر افیون میں ملا کر معجون تیار کیا کرتی تھی بڑی بائی۔ وہ رنگو کو بھی فلک کی سیر کرانے کے لئے فلک سیر کھلایا کرتی تھی۔ رنگو نے دلربا کو بھی فلک سیر کی چاٹ پر لگا لیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ دونوں شراب بھی کثرت سے پینے لگے۔ جس کی وجہ سے دلربا کو دق ہو گئی۔ اور راگ رنگ کے متوالے اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ رنگو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ وہ بھی بے وفا نکلا۔ دلربا کے زیورات اور نقدی لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اسی دوران میں سب سے بڑی مصیبت تو دلربا پر یہ ٹوٹی کہ برسات میں لگاتار بارشیں ہونے سے دلربا کے مکان کو سخت نقصان پہنچا۔ پرانی عمارت تھی۔ بیشتر حصہ گر کر زمین پر آ رہا۔ دلربا کو نقل مکانی کی مصیبت آ پڑی۔ دکانداروں نے دکانیں خالی کر دیں اور آمدنی کا وہ ذریعہ بھی جاتا رہا عجیب مصیبت تھی۔ بیماری دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کہتا تھا لگ کر علاج کرو۔ اور اس کے لئے دولت کی ضرورت تھی۔ دلربا اس جگہ کو بیچنے پر مجبور ہو گئی۔ ملبے کا کسی نے کیا دینا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور پرانی مٹی کے ڈھیروں کا کسی سے کیا مل جاتا تھا۔ صرف زمین کا مول پڑا۔ اس نے رقم لے کر پلے باندھی اور اپنا باقاعدہ علاج کرانے لگی۔

متواتر سات سال وہ اپنی بیماری کے ساتھ لڑتی رہی اور آخر کامیاب ہو گئی لیکن اب جوانی بیت چکی تھی۔ حسن و شباب شبنم کی طرح اڑ گیا تھا۔ عجیب انقلاب تھا نہ وہ شمع رہی نہ پروانے۔ نہ وہ دلربا رہی نہ دیوانے۔ نہ راگ رنگ اور نہ وہ رنگ محفل۔ اسے کئی کئی روز کے فاقے آنے لگے۔ مالک مکان الگ آئے دن

مکان کے کرائے کا تقاضا کرتا تھا۔ آخر تنگ آکر اُس نے وہ مکان چھوڑ دیا۔ کسبنوں کی گلی میں ایک کھولی میں آگئی۔ کہاں چبارے میں رہنے والی دلربا اور کہاں کھولی میں رہنے والی حقیر کسبنیں۔ جن کی قدر و قیمت ہی کیا ہوتی ہے وقت وقت کی بات ہے۔

دلربا کو اپنی جوانی کے بیت جانے کا بڑا غم تھا۔ جسے غلط کرنے کے لئے وہ افیون کھایا کرتی تھی۔ دو رتی طلوع آفتاب سے پہلے اور دو رتی غروب آفتاب کے بعد۔ اُدھر شفق سے افق کے اداس کنارے رنگین ہو جاتے اور اِدھر افیون کے کیف سے دلربا کی اداس آنکھیں۔

افیون کا کانچہ حلق سے نیچے اترتے ہی نشہ ہولے ہولے سلگنے لگتا۔ اور دلربا بن ٹھن کر اپنے پالتو طوطے گلفام کو کندھے پر لئے اڈے پر بیٹھ جاتی۔ اور حقے کی نڑی منہ میں لے کر لمبے لمبے کش لگاتی۔ بنارسی تمباکو افیون کے نشے میں ایک عجیب کیف پیدا کر دیتا۔ ہلکی ہلکی کپکپاہٹ یوں کی گود میں ہلورے لیتے ہوئے دلربا مزے میں آنکھیں بند کر لیتی اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی مغرور جوانی واپس لوٹ آئی ہے۔ جیسے وہ پھر جوان ہو گئی ہے۔

کتنا دلفریب۔ کتنا طربناک تھا وہ احساس۔ اس کے خیالوں کے دھندلکوں میں گذری بیتی جوانی کے مہکے مہکے سپنے جگنو بن کر ٹمٹماتے چلے جاتے اور دلربا ان کا تعاقب کرتی۔ اسی ترنگ میں افیون کا نشہ انتہائی عروج پہ پہنچ جاتا۔ پلک میں دلربا کا سر جھکتے جھکتے سینے سے جا ٹکراتا۔ اور وہ ہڑبڑا کر چونک اٹھتی۔ اور اس کا گلفام پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے ٹراتا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"ڈر گئیں دلربا ؟"
"ڈراؤنا سپنا تو نہیں دیکھا ؟"
"مقدار سے زیادہ تو نہیں کھالی آج ؟"
"نصیب دشمناں طبیعت ناساز تو نہیں آج ؟"

اور دلربا ہنس دیتی۔ اور اپنے ہونٹ اپنے گلفام کی سرخ چونچ سے ملاتے ہوئے بڑے پیار سے کہتی۔

"تیرے صدقے۔ تیرے واری۔ تیرے قربان۔ ایک بوسہ تو دے میرے گلفام۔"

اور دلربا کا گلفام اپنی سرخ چونچ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا۔ اور دلربا کا پالتو کتا جس کا نام اُس نے مجنوں رکھا ہوا تھا۔ کھولی کے کسی کونے کنارے سے نکل کر جسم کو جھاڑتے ہوئے جوشِ رقابت سے بھونکنے لگتا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"شہد سے زیادہ میٹھے اور لذیذ لبوں سے اور اس طوطے چشم، سبز قدمے کو یوں فیاضی سے دیئے جارہے ہیں۔ ایسے مخملی بوسوں کی بارش اور اس ٹیڑھی چونچ پر۔ بڑی بدذوق ہوتی جارہی ہو دلربا۔ دیکھنا اس ٹیڑھے نشتر سے تمہارا مخمل سا ہونٹ کہیں زخمی نہ ہوجائے۔ میں بھی تو تمہارا شیدا ہوں۔ ایک بوسہ درویش کو بھی مل جائے۔ دیکھو تو کیا حالت ہورہی ہے تمہاری محبت میں۔ سوکھ کر کانٹا ہورہا ہوں۔ پنجر نکل آیا ہے۔ پوچھ لے دل والوں سے سبھی وفادار کہیں گے تیرے دلیوانے کو۔ نادان نہ بنو دلربا۔ پنچھی کے پیار کا کیا بھروسہ۔ پیت لگا کر

اڑ جاتے ہیں پنچھی۔ پہلے زخم کیا مٹ گئے۔ جو نئے نشتروں سے
کھلنے لگیں؟"
دلربا کا مجنوں کٹی ہوئی دُم کو ہلاتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں آگھُستا۔ اور وہ اُسے
تھپک تھپک کر لوریاں دینے لگتی۔

سو جا مجنوں سو جا
سو جا چندا سو جا
سو جا جانی سو جا

اور دلربا کا مجنوں برساتی کھنب کی طرح سمٹ کر وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ میٹھا نہ سہی
میٹھی سی بات ہی سہی۔ گر نہیں بوسہ تو بوسے کی سی بات تو ہے۔ جسم سے دور سہی
دل سے تو دور نہیں۔ سوال تو صرف قربت کا ہے۔
کہتے ہیں گیدڑ کی شامت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ اور دلربا کے مجنوں
کی جو شامت آئی تو ایک دن کھولی سے نکل کر ٹہلتا ٹہلتا گلی سے باہر بازار میں پہنچ
گیا۔ اور ناگہاں اس کی موت کے فرشتے آ گئے۔ اس دن کمیٹی کے کتنے مارے آوارہ
گرد کتوں کو زہر دیتے پھر رہے تھے۔ پروا چل رہی تھی۔ دلربا کا مجنوں جھونکوں
سے مست ہو کر مور چال چلتا ہوا سامنے کوڑے کرکٹ کی ڈھیری پر بیٹھ گیا اور
گنگنا نے یعنی کوں کوں کرتے ہوئے اگلے پنجوں سے مٹی کریدنے لگا۔ اتنے میں
اس کی قضا کے کارندے آ گئے۔ کتے کی ہیئت کذائی سے انھوں نے یہی اندازہ
لگایا کہ باولا ہے۔ اور حدود اربعہ ہی کچھ ایسا تھا دلربا کے مجنوں کا۔ تپلا دُبلا۔
آنکھیں پھٹی پھٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی۔ لٹکے ہوئے جبڑے۔ اور ان سے ٹپکتی

ہوئی رال۔ جھاگ۔ دونوں طرف کی پسلیاں ابھری ہوئیں۔ اور ان پہ کاغذی بادام کے چھلکے کی مانند گوشت پوست۔ پچھلی ٹانگوں کے درمیان دم کے نیچے لٹکتے ہوئے چیچڑوں کے گچھے۔ سب کتے ماروں نے متفقہ طور پر یہی کہا خطرناک کتا ہے۔ ختم کر و سالے کو۔ وہ کوندے کی طرح لپکے۔ چاروں طرف سے نرغے میں لے کر وہیں دھر لیا۔ یکے بعد دیگرے ملائی میں زہر کی چار گولیاں داغ دیں۔ چندہی لمحوں میں دلربا کا مجنوں وہیں اینٹھ گیا۔ دم چونکہ پہلے ہی اچھی خاصی کٹی ہوئی تھی لہٰذا کمیٹی کے بہادر کان کاٹ کر لے گئے۔ تاکہ سند رہے۔

دلربا ابھی اڈے پر بیٹھی ہی تھی کہ چندو چمار آگیا۔ اور کان پکڑ کر لگا رام رام کہنے۔ چندو گلی کی نکڑ پہ اڈہ لگائے جوتیاں گانٹھا کرتا تھا۔

"خیر تو ہے لالہ رام نام جپ رہے ہو؟" دلربا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"انیائے۔ گھور انیائے۔ پاپ۔ مہاپاپ۔" چندو نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

"دلربا تیرے مجنوں کو زہر دے کر مار دیا۔"

"کس نے؟" دلربا یہ سنتے ہی یکدم بوکھلا گئی۔ اس کی آواز غم سے بھرا گئی۔

"کس نے مارا میرے مجنوں کو؟"

"کمیٹی کے پاپیوں نے۔" چندو نے جواب دیا۔

"دیکھو تو کل جُگ میں کیا کیا ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہے میرا مجنوں؟ کہاں ہے میرے دل کا ٹکڑا؟ دلربا نے غم و غصہ سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ کدھر ہے؟"

"نانو کبجڑے کی دکان سے ذرا ادرے گُوت مُوت کی ڈھیری پہ یوں سوکھی لکڑی بنا پڑا ہے۔ گُوت مُوت میں سنا ہوا۔" چندو نے جواب دیا۔

"چل تو دکھا مجھے۔" دلربا شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔

"مردود کہیں کے۔ کیا ظلم کرتے پھر رہے ہیں۔"

اپنے مجنوں کے قاتلوں کو گالیاں دیتے ہوئے دلربا اس کے مقتل میں پہنچی۔ خوش قسمتی سے کتے مار اس وقت کہیں دور نکل گئے تھے۔ دلربا کا مجنوں بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کے بادلوں کے نیچے اینٹھا پڑا تھا۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ دلربا نے اس کی لاش پر کھڑے ہو کر کتے ماروں کو وہ کوسنے دیئے۔ وہ تحفے سنائے۔ جو آج تک کسی نے نہ سُنے ہوں گے۔ ان کی ماں بہن کی پور پور ناپتی چلی گئی۔ یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گندی گالیوں کی چلتی پھرتی ایک بہت بڑی لُغت ہے۔ چندو چمار اڈے پر بیٹھا ایک فوجی کا فل بوٹ گانٹھتے ہوئے اُسے داد دیتا رہا۔

"جیئو۔ دلربا جیئو۔ طبیعت صاف کر دی۔ ایسوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ آج کتوں کو زہر دیتے پھر رہے ہیں۔ کل کتنے ختم ہو

جائیں گے تو انسانوں کی باری آئے گی۔ پتلے دُبلے۔ یوں الف ننگے
انسانوں کی باری۔ جن کا نہ گھر نہ گھاٹ۔"

اسی اثنا میں شفیا وہاں سے گزرا۔ شفیا۔ ایک پاگل۔ مجنون۔ جو اُس بازار میں
ہر وقت بالکل ننگا گھوما کرتا تھا۔ الف ننگا ایک سایہ۔ اُسے دیکھتے ہی چندو
نے آواز دی۔

"بھاگ جا۔ شفیئے بھاگ جا۔ دیکھتا نہیں قتل عام ہو رہا ہے۔ ننگا
بھوکا، پتلا دُبلا آج کوئی نہ بچے گا۔"

اور شفیا دونوں کولہوں پہ ہاتھ دھر کر یوں تن کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔
"کتے ماروں کی ماں ۔"

"ارے آہستہ بول آہستہ۔" چندو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اگر انھوں نے سن لیا تو بس تیری بھی خیر نہیں۔"

"کیوں لالہ میں نے کیا جرم کیا ہے؟" شفیئے نے آواز دی۔
"میں نے کس کی جورو کو ہاتھ لگایا ہے؟"

"شرم نہیں آتی تجھے شفیئے۔" چندو نے کہا۔
"عورتوں کے سامنے ننگا پھرتا ہے۔"

یہ سن کر شفیئے نے ایک پُر زور قہقہہ مارا۔ کہنے لگا۔
"لالہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ اور عورت یہاں کون ہے۔ ان
کھولیوں میں بیٹھنے والیوں کو کیا تم عورتیں سمجھتے ہو۔"

"عورتیں نہیں تو کیا ہیں یہ؟" چندو نے پوچھا۔

"بہرحال کچھ بھی ہوں۔" شفیقہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"شفیاان سے بہت دور۔ دھرتی سے بہت دور ہے۔ یہ شہر۔ یہ گلیاں۔ یہ بازار مجھ سے بہت نیچے رہ گئے ہیں۔ جہاں میں ہوں وہاں سے ساری دنیا مجھے ایک اندھیری گلی نظر آتی ہے۔ سونی اجاڑ گلی۔ جہاں کوئی نہیں ہے۔"

اور وہ قہقہے پر قہقہہ مارتے ہوئے آگے نکل گیا۔ دلربا اپنے مجنوں کی لاش کو ڈھیری پر سے اٹھا لائی۔ کافی دیر تک بین کرتی رہی۔ پھر اپنے مجنوں کو مالسری کے پیڑ تلے دفن کر دیا۔ اپنے مجنوں کی موت کا اس کے دل کو بڑا صدمہ ہوا تھا۔ تین دن متواتر اس کی کھولی کا دروازہ بند رہا۔ اس نے چراغ نہ جلایا۔ چارپائی چھوڑ کر زمین پر سوتی رہی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا گلفام بھی اس کے ساتھ غمناک رہا۔ اپنے رقیب کی موت کے خیال سے نہ سہی دلربا کی غمناکی کے خیال ہی سے سہی۔

اس دن دیوالی تھی۔ مکانوں کے منڈیروں پر چراغ جل رہے تھے اور ان کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان میں ستارے۔ دلربا بن ٹھن کر اڈے پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ الی باہر والا آ گیا۔ بولا

"چائے لاؤں دلربا؟"

"نہیں۔ اس وقت دل نہیں چاہتا۔" دلربا نے جواب دیا۔

"آج دیوالی ہے دلربا۔ دیکھ کتنے چراغ جل رہے ہیں۔" الی نے کہا۔

"جلنے دے۔" دلربا نے کہا۔

"یہاں اپنے دل کے داغ جل رہے ہیں۔ تو یہ بتا اتنے دن نظر نہیں آیا الی؟"

"میں گاؤں چلا گیا تھا۔" الی نے جواب دیا۔

"خیر تو تھی؟" دلربا نے پوچھا۔

"بہن بیمار ہو گئی تھی۔" الی نے جواب دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تیری بہن کی؟" دلربا نے پوچھا۔

"اب تو اچھی ہے۔" الی نے کہا۔

"میں نے سنا ہے تمہارا مجنوں مر گیا۔"

"مرا نہیں، مارا گیا ہے۔" دلربا نے کہا۔

"سچے عاشق مرا نہیں کرتے۔"

"بڑا افسوس ہے میاں مجنوں کی موت کا۔" الی نے کہا۔

"اس کھولی کی رونق تھا۔"

"مگر اس ظالم دنیا کو کسی کے گھر کی رونق سے کیا۔" دلربا نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

"کوئی تاپے کسی کا گھر جلے۔ کوئی مرے کوئی ملہار گائے۔"

"تم کمیٹی کے بڑے صاحب کے پاس جا کر ان کی شکایت کرو۔" الی نے مشورہ دیا۔

"بڑا صاحب بڑا ودہ ہے۔" دلربا نے کہا۔

"ایک بار نہیں کئی بار گئی اس کے پاس۔ کرتا کرا تا کچھ نہیں۔ تسلی دے کر ٹال دیتا ہے۔"

"اچھا دلربا صبر کرو۔"

"ہاں بھیا صبر کے سوا ہم لوگوں کے پاس اور ہے بھی کیا۔" دلربا نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا اور خاموش ہوگئی۔

افیون کا نشہ دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ بنارسی تمباکو کے ہلکے ہلکے کش ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ دلربا آنکھیں بند کئے پلنگ میں ہلورے لے رہی تھی۔ اس کے آس پاس بکھرے ہوئے اندھیروں اور اجالوں میں گذرنے بیتے لمحوں کے بگولے سے اٹھنے لگے تھے۔ جن میں کچھ گذری بیتی رتیں۔ کچھ خواب شاخ سے ٹوٹے ہوئے خشک سوکھے پتوں کی طرح ادھر اُدھر اڑتے ہوئے صاف صاف نظر آرہے تھے۔ شاخ ماضی سے ٹوٹا ہوا ایک پتہ۔ ایک خواب اڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ تو دلربا نے اس میں ایک جانی پہچانی صورت دیکھی۔ پنڈت چاند گرہن سورج گرہن کی صورت۔ اور پھر وہ صورت اُس سے باتیں کرنے لگی۔

"دلربا۔ میں لنکا سے آرہا ہوں۔ راون کے دیس سے آرہا ہوں۔ ایکے میں نے لنکا میں جنم لیا ہے۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ چل تجھے لنکا دکھا لاؤں۔ لنکا کے لنگور دکھا لاؤں۔ لنکا میں ہر کوئی باون گز کا ہے۔ لنکا کے باون گزے دیکھ کر تو بہت خوش ہوگی۔ اور انسان کو ہمیشہ خوش ہی رہنا چاہئے۔"

"لنکا کیسی ہے؟" دلربا سپنے میں پنڈت چاندگرہن سورج گرہن سے باتیں کرنے لگی۔

" بڑی اچھی ہے ۔"

" وہاں کے لوگ کیسے ہیں ؟"

" بہت اچھے ہیں ۔ رنگ مگر کالے ہیں ۔"

" افیون ملتی ہے لنکا میں ؟"

" بہت ۔ اور بہت سستی ۔ دو آنے تولہ ۔"

" نامراد دو تین سیر سوغات کے طور پر ہی لے آتے ۔"

" تو میرے ساتھ چل افیون کے ڈھیر لگا دوں گا تیرے آگے ۔ دیوار چین سے بھی بڑی افیون کی دیوار ۔ دن رات اُسے چاٹا کرنا ۔"

" اچھا ۔"

" ہاں ۔ لنکا کے پاپڑ کھائے ہیں تم نے ؟"

" نہیں کھائے ۔"

" تو پھر کچھ نہیں کھایا تو نے ۔"

" کیسے ہوتے ہیں ؟"

" بڑے مزے دار ۔ لنکا کے نمکین چنے بھی کبھی کھائے ہیں ۔"

" نہیں کھائے ۔ کیسے ہوتے ہیں ؟"

" چٹخارے دار ۔"

" چٹخارے دار چیزیں تو مجھے بہت پسند ہیں ۔"

" چُنیا بیگم جو کھاتی ہے ۔"

" کیا کروں خون میں رچ گئی ہے ۔"

"ہرے ناریل کا پانی پیا ہے تو نے ؟"
"نہیں پیا۔ کیسا ہوتا ہے ؟"
"بڑا ہاضمے دار۔"
"مونڈی کاٹے۔ دو تین آبخورے بھر لاتا اپنے ساتھ۔ میرا ہاضمہ بڑا خراب ہو رہا ہے۔"
"تو ہاضمے کی بات کرتی ہے۔ تیرا تو سارا جیون ہی خراب ہو چکا دلربا۔"
"جورو کے بھائی مذاق کرتا ہے مجھے۔"
"نہیں دلربا میں تو تجھے پیار کرتا ہوں۔ چل بیٹھ اڑن کھٹولے میں تجھے لنکا کی سیر کراؤں۔"
اور دلربا سپنے کے اڑن کھٹولے میں بیٹھ گئی۔ جو بادلوں میں اوپر ہی اوپر اڑنے لگا۔ نشے کی پینک میں اس وقت بڑا ہی سہانا سپنا دیکھ رہی تھی دلربا۔ اتنے میں بے فکروں کی ایک ٹولی ادھر آنکلی۔ انھوں نے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ فقرے چست کرنے لگے۔
"کیوں جی شام ویلے ای سوں گئے او۔"
"چھمک چھلو بڑیاں نیندراں آیاں نیں۔"
"بے خبرے کہیں کے چنیا بیگم کھاتی۔ چنیا بیگم۔"
"اماں چٹیا کھینچ سالی کی۔"
"بوڑھی گھوڑی لال لگام۔"
"سر کے بال وسمے سے کالے کئے ہیں کہ خضاب سے ؟"

”کمائی اور نہ پہیا گاڑی جوت میرے بھیا۔“

”نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اور بنتی ہے سولہ برس کی۔“

”ٹاٹ کی انگیا مونج کی تنی دیکھ میرے بالم میں کیسی بنی۔“

”ہائے ری تیرے نخرے میں گرم مصالہ۔“

”کیوں جی بڑا اچکڑ کیتا ہویا جے دکان اگے؟“

”بدرہ بانیاں سننے کا شوق ہے۔“

”تلکن کیتی ہوئی سوہنی کوئی تلکے تے ایہدے تروپے توڑے اگوں پچھوں۔“

”کھومڑتے چوناگھنا بڑا لپیا ہویا اے۔“

”بلھاں تے سرخی اے کہ کسے ماں مہڑدا لہو پیتا ہویا اے۔“

”مائی بچے گھسٹ۔“

”ہپوڈین۔“

”نانی حقی۔“

”لومیں وکھاناں تہانوں ایس بڈھی باندری دا تماشہ۔“

اور اس نے چپکے سے آگے بڑھ کر دلربا کی کھوپڑی پہ ٹھاپ جڑ دی۔ وہ ہڑبڑا کر چونک پڑی۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے سپنے کا اڑن کھٹولا لنکا پہنچنے سے پہلے ہی دھڑام سے زمین پہ آگرا ہے۔ اس کا گلفام ٹرانے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”دلربا یہ پکے حرامی ہیں۔ لچے۔ لفنگے۔ لوفر۔ اس بازار کے باون گزے۔
جوتا پکڑ لے اور ان کے کلّے چھاڑ کر رکھ دے۔“

دلربا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر جوتا پکڑ لیا اور ان پہ پل پڑی۔

"سور کے نطفو۔ کتے کے بچو۔ گدھے کی اولادو۔ بوڑھی بندریا تمہاری ماں۔ تمہاری بہن۔ اور تمہارا باپ بھڑوا مداری۔ ایکے ہاتھ لگاکر دیکھو منڈی کاٹو۔"

اور وہ سب ٹھٹھا ٹھٹھا ہنستے ہوئے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ تھوڑی دور جاکر وہ پھر سب اکٹھے ہوئے اور آپس میں ٹھٹھا مخول کرنے لگے۔ فلمی گانے۔ فلمی قوالیاں۔ فلمی ڈائیلاگ۔ گالی گلوچ۔ دھینگا مشتی۔ دھول دھپہ۔ سامنے ایک کھولی کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ ایک لپک کر آگے بڑھا۔ اور دروازے کے پٹ پکھاوج کی طرح بجانے لگا۔ اور دوسرے نے لہکنا شروع کر دیا۔ تیسرا بیڑی کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

"چھمیاں کی بہن کی وہ۔ رات سپنے میں دوبار خراب کر گئی۔"

چوتھے نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔

"بس دوبار۔ یہاں تو ساری رات سندری کو خدا کی قسم سپنے میں لٹو کی طرح گھمایا ہے۔ جالی پہ جالی۔ کبھی الٹی جالی کبھی سیدھی جالی۔"

پانچویں نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں بکتے ہو۔ سندری اور چھمیاں تو ساری رات میرے پیار کی چھم چھم کھاتی رہی ہیں۔"

"تو وہ پھر پلنگ میں جھونکیں لینے لگی۔" چھٹے نے کہا۔

"بوڑھی بکری نے گردن جھکا کر پھر جگالی شروع کر دی۔"

"یہ بوڑھی جونک تو لہو کی ایک بوند نہ چھوڑے گی۔"

"اور میں بھی ادھر سے غلہ چھوڑنے لگا ہوں۔ اب ذرا تماشا دیکھنا کتنا مزا آتا ہے۔"

اور اُس نے جیب سے غلیل نکال کر دلربا کے گلفام کو نشانہ بنا دیا۔ غلہ پنچھی کے پر پر لگا۔ وہ چیخ کر پھڑپھڑایا۔ اور ہوا میں پلٹے کھاتا ہوا گلی میں جا پڑا۔ پاس ہی ایک رخنے میں کئی دنوں سے ایک بلی گلفام کو ہر روز ایسے ہی حسرتناک نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ جیسے دلربا کا عاشق مرحوم جانی کبابیہ کسی زمانے میں جبکہ دلربا جوان تھی اُسے اپنی دکان پر بیٹھا ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتا تھا۔ بلی جھپٹی اور طوطے کی گردن دانتوں میں دبائے ہوا ہوگئی۔ غلہ مارنے والے ٹھاہ ٹھاہ ہنستے ہوئے آگے نکل گئے۔ اور دلربا کھولی سے نکل کر بلی کے پیچھے بھاگی۔ الی گلی کی نکڑ پر کھڑا اپنے دو دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ دلربا کو یوں بے تحاشا بھاگتے دیکھا تو سمجھا کوئی آفت آن پڑی ہے بیچاری پر۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پے بہ پے کئی آوازیں دیں۔ مگر دلربا نے وحشت میں کوئی جواب نہ دیا۔ بے تحاشا بھاگتی گئی۔ بھاگتی گئی۔ بلی گلی سے نکل کر اس طرف ہوگئی جس طرف زمین دوز نالہ بنانے کے لئے خندق کھودی جا رہی تھی۔ یہ چونکہ اس علاقہ کا غیر آباد رقبہ تھا لہذا یہاں روشنی نہ تھی۔ جابجا مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گڑھے تھے۔ ایک طرف بدرو بہتی تھی۔ بلی بھاگتے بھاگتے زمین دوز نالے میں کود گئی۔ اور دلربا کے گلفام کے پر نوچنے لگی۔

وہ چیخ رہا تھا۔ اور اس کی چیخیں دلربا کے دل پر چرکے لگا رہی تھیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے بیدم ہوگئی تھی۔ مگر وہ بھاگ رہی تھی۔ بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ اس کا گلفام

چیخ رہا تھا۔ دلربا کو بُلا رہا تھا۔ آوازیں دے رہا تھا۔

"بچالے۔ دلربا مجھے بچالے۔ موت نے بُری طرح دلبوچ رکھا ہے۔ پھڑپھڑانے بھی نہیں دیتی۔"

اور دلربا اس کی آواز پہ آواز دیئے جاتی تھی۔

"میں آگئی۔ گلفام میں آگئی۔ میں تجھے مرنے نہ دوں گی۔ اب مجھ سے بھاگا نہیں جاتا لیکن بھاگ رہی ہوں۔"

اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط اس کے گلفام کی چیخیں اس کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ اس طرف۔ دلربا اس طرف۔ اس گہرے کنوئیں میں موت مجھے دبوچے بیٹھی ہے۔ اس کے دانت میری گردن میں دھنسے ہوئے ہیں۔ بولا نہیں جاتا لیکن بول رہا ہوں۔ جیسے تجھ سے بھاگا نہیں جاتا لیکن تو بھاگ رہی ہے۔ پیار ہو تو ایسا ہو۔ اور تیز۔ دلربا اور تیز۔ بھو کی موت بہت جلدی کر رہی ہے۔ تو بھی جلدی سے آجا۔ اور دلربا دھم سے زمین دوز نالے میں کود گئی۔ اور اس کے فوراً ہی بعد گلفام کی دردناک چیخیں بند ہو گئیں۔ اتنے میں الی اور اس کے دوست بھی دلربا کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ نکلے۔

"اس نالے میں ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔" الی نے کہا۔

"ہاں ضرور۔" اس کے ایک دوست نے کہا۔

"میں ماچس جلاتا ہوں۔"

ماچس کی روشنی میں الی اور اس کے دوستوں نے گہرائی میں جھانک کر دیکھا دلربا تازہ ہی تازہ گیلی گیلی مٹی کے ڈھیر پہ لیٹی ہوئی تھی۔ اپنے گلفام کو سینے سے لگا یا ہوا تھا۔

گلفام کی چونچ اور دلربا کے ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے۔

"دلربا۔" الی نے آواز دی۔ "دلربا۔"

مگر کوئی جواب نہ ملا۔ لمحہ توقف کے بعد الی نے پھر بلند آواز میں پکارا۔

"دلربا —— دلربا۔"

اور کامل سکوت کے چند لمحے یونہی گزر گئے۔

# ناولٹ

## ریشم کا کیڑا

# حرفِ اول

"ریشم کا کیڑا" اپنی طرز کا ایک نرالا ناولٹ ہے جس میں داستان گوئی کی پرانی تکنیک کے ساتھ ساتھ نئے انداز کی مینا کاری کا سراغ بھی ملتا ہے۔ آغا اشرف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے پیشتر ان کی بے شمار کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی توجہ کا مرکز بن چکی ہیں۔ لیکن زیرِ نظر ناولٹ فکشن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا ہے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ تبدیلیِ جنس کی ایک معمولی سی خبر یوں افسانے کا روپ دھار سکتی ہے اور قاری کو اس طرح اپنے آپ میں جذب کر سکتی ہے!

اس ناولٹ میں جہاں جہاں تصور کی آنکھ گوری کے کردار اور اس کے گرد و پیش پر مرکوز ہوتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا خانہ بدوشوں اور چرواہوں کی تصوراتی زندگی کا فلم چل رہا ہے اور دل بار بار کہتا ہے کہ اگر یوں نہیں تو یوں ہوا ضرور کرے! اسی طرح مصوّرہ کا وجود بھی نہایت اچھوتے تخیل کی پیداوار ہے۔ تخیل کا یہ پیکر جب جنسی تبدیلی کا شکار ہوتا ہے تو پڑھنے والے کو ذرا بھی دھچکا نہیں لگتا۔ کیونکہ مصنف نے اس کا وجود ہی کچھ ایسی مٹی سے اٹھایا ہے کہ اسے کسی قالب میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ آغا اشرف ایک انوکھا کوزہ گر ہے جس کے ہاتھ ساحرانہ قوت رکھتے ہیں۔ اس کی انگلی کا ایک اشارہ انہونی باتوں کو ہونی میں تبدیل کر سکتا ہے اور ناممکن باتوں کو اپنے مخصوص استدلال سے ممکنات میں تبدیل کر سکتا ہے۔ آغا اشرف بلاشبہ ساحر بھی ہے اور منطقی بھی۔

میری آرزو ہے کہ وہ اپنے فنِ افسانہ نگاری کو اسی طرح سے جاری رکھیں تاکہ آنے والے ادیبوں کو اپنی راہیں تعین کرنے میں آسانی رہے۔

ناولٹ کس حد تک مختصر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ آپ کو یہ داستان پڑھنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔


اشفاق احمد

479/N - سمن آباد - لاہور

# ریشم کا کیڑا

بہار کی رُت تھی۔

اُدھر ندی کے کنارے شہتوت کے پیڑوں میں ایک کہانی جنم لے چکی تھی۔

ریشم کے کیڑے کی کہانی۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے ریشم کے کیڑے کی کہانی اُس نے ڈی لیکس کلر زمیں سکرین پر بھی دیکھی تھی۔ کہانی کا وہ حصہ تو خاص کر بڑا ہی دلچسپ تھا جس میں ریشم کا کیڑا شہتوت کے پتوں میں رہتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اپنی زندگی میں چھ بار سوتا ہے۔ اور چھٹی نیند کے بعد جب وہ جاگتا ہے تو اس کا سر اُسے بھاری بھاری لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے سر کو بار بار جھٹکتے ہوئے کوئی ایسی شاخ ڈھونڈتا ہے جس پر وہ ریشم کا کوکون، ریشم کا غنچہ بنا سکے۔

اور پھر ایسی ہی شاخ ڈھونڈ کر وہ اس پر ریشم کا غنچہ بناتا ہے۔ شاخ سے ایک جگہ چپک کر وہ ریشم کے تار اپنے گرد داگرد بُنتا ہے اور ریشم کا ایک خول بنا کر اس میں بند ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ اس خول کو چیر کر نکلتا ہے تو اس کی جنس تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ ریشم کا بھونڈی اور بھیانک شکل کا کیڑا ایک بڑی ہی خوشنما تتلی بن چکا ہوتا ہے۔

بڑی ہی دلچسپ تھی ریشم کے کیڑے کی کہانی۔ اور ڈی لیکس کلر بھی جن میں

وہ پیش کی گئی تھی کافی دلچسپ تھے۔ اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے اندر بھی کہیں ریشم کا کیڑا چھپا ہوا ہے۔ جو اس کے گرداگرد ریشم کے تار بُن رہا ہے۔ وہ کئی دن تک ایسا ہی محسوس کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ ایسا کیوں محسوس کرتا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور وہ احساس خود بخود اس کے اندر ہی کہیں ریشم کے کیڑے کی طرح سو گیا۔ اور سوتی جاگتی رُتوں کے چکر میں جب اس نے ریشم کے جیتے جاگتے کیڑے شہتوت کے نئے پتوں پر رینگتے دیکھے تو وہ احساس اس کے اندر پھر جاگ گیا۔

جہاں وہ رہتا تھا وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک ندی بہتی تھی۔ جس کے دونوں کناروں پر دور دور تک شہتوت کے پیڑ اُگے ہوئے تھے۔ فرصت کے لمحوں میں وہ ان پیڑوں کے پاس ٹہلا کرتا۔ یہ اس کی ہوبی تھی۔ وہ آرٹسٹ تھا۔ طلوع و غروب کے رنگ ندی کے پانیوں میں گھلتے اور کھلتے تو کئی رنگ اس کی سمجھ میں آتے۔ رنگوں کو آپس میں ملا کر نئے رنگوں کو جنم دینے کی کئی سکیمیں اُسے سُوجھتیں اور وہ ایسی تصویریں بناتا جن میں وہ زندگی کے بہت قریب نظر آتا۔

وہ آرٹسٹ تھا۔ رنگوں کا کھلاڑی۔ رنگوں سے کھیل کھیلنے والا۔ رنگ اس کے کھلونے تھے۔ اور کبھی وہ خود کھلونا بن جاتا اور رنگ اس کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ اور وہ بڑی اچھی اچھی تصویریں بنا کر انہیں بیچنے لے جاتا۔ اس بستی کے بڑے بازار میں سڑک کنارے کہیں کسی جگہ وہ اپنی تصویریں سجا کر بیٹھ جاتا۔ آتے جاتے لوگوں کا مجمع لگ جاتا اس کے آس پاس۔ جن میں تصویروں کے خریدار نو بہت کم ہوتے لیکن ان کو دیکھ کر دل خوش کرتے ہوئے چپکے سے آگے نکل جانے والے زیادہ۔

وہ اس بستی میں ایک کچے کوٹھے میں رہتا تھا جس میں بس ایک کمرہ تھا اور اس کے آگے چھوٹا سا آنگن۔ اس کے آس پاس اور بھی کئی اونچے نیچے کچے کوٹھے تھے۔ برکھا کے چھینٹے آتے تو ان کی گیلی گیلی مٹی سے بڑی عجیب سی مہک آنے لگتی۔ اور وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس مہک کو پھانکنے کی کوشش کرتا۔ اس مہک کو اپنی رگ رگ میں رچانا چاہتا۔ اس مہک میں لمبے لمبے سانس لینے سے اُسے بڑا لطف آتا۔ وہ بڑا مزا لیتا اس مہک کا۔

اسی مزے میں ایک دن اُسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنے کچے کوٹھے کی گیلی گیلی مٹی میں کچھ رنگ گھولے اور ندی کنارے اُگے ہوئے ایک شہتوت کے تنے میں ابھری ابھری ایک تصویر بنائی۔ ایک شکل بنائی جس نے اُس پیڑ کو بڑا ہی عجیب بنا دیا۔ تنے سے ملتے جلتے رنگوں سے بنی ہوئی تصویر اور اس میں بنی ہوئی ایک شکل معلوم ہوتا تھا پیڑ ہی کی شکل ہے بنائی نہیں گئی۔

بستی پہ دور دور تک پھیلی ہوئی دھوپ چھینٹے پڑ جانے سے بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ہوا کے دھیرے دھیرے بہتے جھونکوں میں بہار کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ کھیتوں کے اُس پار نشیب میں جوہڑ کے کنارے چھتری نما گھنے بوٹے تلے کوئی چرواہا الغوزہ بجا رہا تھا۔ اور اس کی بھیڑیں گردن جھکائے ہری ہری گھاس چر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھوڑی دور آگے نکل گیا۔ ایک کھیت کی مینڈ پر کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف دور اور نزدیک ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے واپس لوٹ آیا۔ سگریٹ کا

ایک ہلکا سا کش لیتے ہوئے اس نے برش پکڑا۔ اور اُس تصویر میں جہاں اُس نے اس سے پہلے آنکھیں بنائی تھیں وہاں ہاتھ بنا دیئے اور جہاں ہاتھ بنائے تھے وہاں آنکھیں بنا دیں۔ جس سے تصویر اور اس میں بنی ہوئی شکل ایک معمہ بن گئی۔ ایک بجھارت۔ ایک پہیلی۔ سامنے سے ایک گھسیارہ گھاس کی گانٹھ اٹھائے "من لگو یو گیو" گاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے شہتوت کے پیٹ میں تصویر اور تصویر میں پیڑ اور پیڑ میں پہیلی اور پہیلی میں آنکھ اور آنکھ میں ہاتھ اور ہاتھ میں آنکھ دیکھی تو گھاس کی گانٹھ ایک طرف پھینک پھانک کر ڈنڈوت کرنے لگا۔

اُدھر سے ڈنڈا ہاتھ میں لئے ایک چرواہی بکریاں ہانکتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے نیا نیا لچکا لگایا تھا گھگھری کے گھیرے میں۔ چاندی کی نئی چھاگل لائی تھی وہ چندوسی کے میلے سے۔ گھگھری کے گھیرے سے گھسر گھسر کر چھنک رہے تھے چرواہی کی چھاگل کے گھنگرو۔ دنیا جھوم جھام رہی ہوئی۔ پیڑ کے پیٹ میں شکل دیکھ کر وہ بھی جھوم گئی۔ بکریوں کو آگے چلتا کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے تصویر کی آنکھوں میں ابھی صرف ہاتھ ہی دیکھے تھے۔ ہاتھوں میں آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ ورنہ اس کی آنکھوں کا سارا کاجل اسی وقت بہہ جاتا۔ اور اس کے ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی مٹی میں مل جاتی۔

اتنے میں ایک پھیرا لگیرے اور ہار لئے ادھر سے گزرا۔ اس نے پیڑ کے پیٹ میں آنکھ اور آنکھ میں زبان لٹکتی دیکھی تو وہ بھی ہوا میں لٹک گیا۔ اپنی باٹ ہی بسیر گئی اس کو۔ آنکھیں جھپکنے لگا۔ اس کی نظر بند ہو گئی تھی۔ اس کی

زبان اس وقت منہ کی بجائے پیٹ میں لٹکنے لگی تھی۔ اور پھر جب اس کی نظر کھلی تو ادھر تصویر میں دوسری آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ اور اس میں ایک پوری ٹانگ ٹنگی ہوئی تھی۔ جیسے دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں میں چستی آ گئی۔ اس نے ڈبکی لگا دی۔ تھوڑی دور جا کر سرپٹ ہو گیا۔ ایک کیل لے آیا۔ بسنتی پر چھائے ہوئے بادلوں سے ایک ننھی سی بوند اس کی ناک پر گری۔ بڑا اچھا شگون تھا۔ کیل اس نے پیڑ میں گاڑ دی۔ ٹوکری سے سارے گجرے، سارے ہار نکال کر کیل پر لٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا کر منہ میں نہ جانے کیا پھسر پھسر کرنے لگا۔

وہ چپ چاپ ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دو گلہریاں ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کے قدموں کے درمیان سے ہوتی ہوئی سامنے درخت پر چڑھ گئیں۔ پھر جب وہ سب چلے گئے تو آرٹسٹ ایک جگہ کھڑا ہو کر یہ دیکھنے لگا کہ ان لوگوں نے اس تصویر میں کیا دیکھا؟ انہیں کیا نظر آیا اس تصویر میں جو مجھے ابھی تک نظر نہیں آیا؟ اسی دیکھ بھال میں شہتوت کے نئے پتوں میں اچانک اس نے ریشم کے کیڑے رینگتے دیکھ لئے۔ اور بت بنا کافی دیر تک یہ دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ وہ نرم نرم کونپلیں کھا رہے تھے۔ کلبلا رہے تھے۔ اور یہ اسے اس دن معلوم ہوا کہ بڑے پیٹو ہوتے ہیں ریشم کے کیڑے۔ انہیں تو ہر وقت ہیں کھانے ہی سے کام ہوتا ہے۔ نرم نرم پتوں اور کونپلوں کو چھلنی کئے جاتے ہیں۔ اور وہ سوچنے لگا یہ پتے کیوں کھاتے ہیں میٹھے

میٹھے شہتوت کیوں نہیں کھاتے ؟

وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ مگر اس گتھی کو نہ سلجھا سکا۔ بہرحال ایک اچھا شغل مل گیا تھا اُسے۔ فرصت کے لمحوں میں وہ شاخوں میں جھانکتے ہوئے چپ چاپ کھڑا ریشم کے کیڑوں کا تماشہ دیکھتا رہتا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کیڑے ریشم کا غنچہ کب اور کیسے بناتے ہیں ؟ یہ کیڑے تتلی کب بنتے ہیں ؟ ان کی جون کیسے بدل جاتی ہے ؟ اُس کا اشتیاق دن بدن بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ ریشم کے کیڑوں میں جلدی جلدی کچھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ وہ پہلی نیند کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اور پھر ایک دن جب کہ وہ ریشم کے کیڑوں سے متعلق اپنا ایک تاثر تصویر میں پینٹ کرنے جھکی جھکی شاخوں کے سایوں میں آکھڑا ہوا تو چڑھتے سورج کی گوری گوری دھوپ میں اس نے ریشم کے کیڑوں کو گہری نیند سوتے دیکھا۔ یہ ان کی پہلی نیند تھی۔ مگر گوری کو اُس دن اُس نے دوسری بار وہاں دیکھا تھا۔ وہ کپڑے کا جھولا پیچھے لٹکائے شہتوت کے پیڑوں تلے بکھرے ہوئے سوکھے پتے اور جھانکڑیں اکٹھی کر رہی تھی۔ اور سوئی سوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے وہ بھی نیند میں چل پھر رہی ہو۔ نیند میں پتے اور جھانکڑیں اکٹھی کر رہی ہو۔

گوری بستی کی ایک بیوہ مائی شبو بھٹیارن کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی چنچل، بڑی ہنس مکھ۔ ہر وقت اور ہر حال میں ہنستے رہنے والی لڑکی۔ جب وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی تو اس کی باتوں میں پھول کھلنے تھے۔

اسے گوری کا ہنس ہنس کر باتیں کرنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ اور گوری کو تو آرٹسٹ کی کئی چیزیں بڑی پسند تھیں۔ شانوں کو چھوتے ہوئے اس کے لانبے لانبے گھنگریالے بال، اس کی چوڑی پیشانی، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اس کے ایک گال پر کالا تل، اس کی عورتوں کی سی چال، سگریٹ سلگا کر سوچتے ہوئے اس کا ادھر اُدھر ٹہلنا۔ عورتوں کی سی اس کی باریک آواز، آنکھیں جھپک جھپک کر اس کا باتیں کرنا، اس کی بنائی ہوئی تصویریں۔ گوری کو اس کی کئی چیزیں پسند تھیں۔ جس کا اظہار وہ اس کے سامنے اپنی شرارتوں میں اکثر کیا کرتی تھی۔

وہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دو کوٹھے چھوڑ کر تیسرے کوٹھے میں۔ جس کے سامنے ببول کا بھوت سا پیڑ تھا۔ ایک طرف اس کا ایک درمیانی ڈال باہر کی طرف آسیب کے بازو کی طرح زمین کی جانب لٹک رہا تھا۔ جس کے نیچے مائی شبو نے بھٹی بنائی ہوئی تھی۔ دن ڈھلے بھٹی گرم ہوتی تو دانے بھنوانے والوں کی وہاں چہل پہل ہو جاتی۔ دانے مائی شبو بھونا کرتی اور گوری بھٹی میں سوکھے پتے اور جھانکڑیں جھونکتے ہوئے ادھر اُدھر جھانکتی رہتی اور بیٹھے بیٹھے کوئی نہ کوئی شرارت کرتی جاتی۔ اسی لئے تو اپنی ماں سے اکثر پٹا کرتی تھی۔ مگر وہ کیا پرواہ کرتی تھی ایسی پٹائیوں کی۔ شرارت تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُسے شرارت سے روکنا پانی کے آگے پاڑ باندھنے والی بات تھی۔ آرٹسٹ آنگن میں بیٹھا تصویریں بنایا کرتا تو وہ شیشہ سورج کے سامنے کر کے اس پر چمکارے ڈالا کرتی۔ وہ گلی میں سے

گذرتا تو منڈیر سے لگ کر اُسے کنکر مارتی۔ اور وہ ہنس دیا کرتا۔ شریر لڑکی۔
اس بستی کی شریر لڑکی۔

شریر لڑکی نے ایک دن اُسے بڑا ہی ستایا۔ اس کی ماں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تھی گھر میں۔ آرٹسٹ آنگن میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ وہ اندر سے شیشہ اٹھا لائی اور اس پر چمکارے ڈالتی رہی۔ پھر وہ منڈیر سے لگ کر اس کی طرف کنکر چلاتی رہی۔ پروا چل رہی تھی۔ آرٹسٹ کام کرتے کرتے مست ہو کر بیٹھا بیٹھا وہیں سو گیا۔ گوری کو ایک اور شرارت سوجھی۔ اس نے کڑک بیٹھی ہوئی مرغی ڈربے سے نکال کر گلی میں اچھال دی۔ مرغی پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر آتے ہی کڑکڑاتی ایک طرف بھاگی تو یہ بھی بھاگ کر کوٹھے سے نیچے اتر آئی اور اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ گھیر گھار کر مرغی کو ادھر آنگن میں چلتا گیا اور اُسے پکڑنے کے بہانے چپکے سے خود بھی آنگن میں پہنچ گئی۔ آرٹسٹ پروا سے مست ہو کر ایسی گہری نیند سو رہا تھا کہ اُسے ذرا خبر نہ ہوئی کیا ہو رہا ہے۔

گوری نے برش اٹھایا اور مصوری شروع کر دی۔ وہ ایک سیتری بنا رہا تھا۔ گوری نے الٹے سیدھے برش چلا کر اس کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ بنی بنائی تصویر کو بگاڑ دیا۔ نیلے پیلے بے ہنگم رنگوں کے پھیلے پھیلے ایسے چٹاخ ٹالے کہ تصویر کو چیچک نکل آئی۔ اور پھر اُس نے آرٹسٹ کے چہرے پر بھی کچھ بنانا چاہا۔ لال رنگ میں برش بھگو کر اس کے ہونٹوں پر رکھا ہی تھا کہ وہ ہڑبڑا کر چونک گیا۔ گوری نے مرغی کو بغل میں دبایا اور کھل کھلا کر

ہنستی ہوئی ہوا ہو گئی۔ اور وہ بھی ہنسنے لگا۔ شریر لڑکی۔ اس بسنتی کی شریر لڑکی۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ گوری اتنی شریر کیوں ہے؟ اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے؟ شرارت کے سوا اس لڑکی کو اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ عجیب لڑکی ہے۔ عجیب عجیب شرارتیں کرتی ہے۔ جوانی میں مائی شبو بھی شاید ایسی ہی شریر لڑکی ہوتی ہو گی۔ اور ایک دن تو اس نے مائی شبو سے یہ پوچھا ہی لیا۔

"بوا کیا تم بھی جوانی میں ایسی ہی شرارتیں کیا کرتی تھیں؟"

"نہیں بیٹا۔ میری ماں تو بڑی جلاد تھی۔ ایک بار نہ جانے کیا شرارت کی میں نے۔ اتنا پٹی۔ اتنا پٹی کہ ابھی تک ہڈیاں دکھتی ہیں۔ یہ موئی تو اپنی موسی پہ ہے۔ جوانی میں بڑی شریر تھی وہ بھی۔ آفت کی پرکالی۔ اسی نے اسے گھُٹی دی تھی۔" مائی شبو نے کہا۔

کبھی کبھار فرصت میں جب وہ مائی شبو کے پاس بیٹھ جاتا تو وہ بھی اپنا نریل لے کر بیٹھ جاتی۔ اُسے آپ بیتیاں، جگ بیتیاں سنایا کرتی۔ زندگی کے دُکھ سُکھ اس کی باتوں سے جھانکنے لگتے۔ وہ اس کی باتوں کو بڑے غور سے سنا کرتا۔ اور گوری اس سنجیدہ ماحول میں بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ چپکے سے کوئی شرارت کر دیتی۔ اور مائی شبو غصے سے کلبلا اُٹھتی۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں آتا دے مارتی۔ ایک دن تو مائی نے طیش میں آکر دال کو تڑکا لگانے والا لوہے کا کڑچھا ہی اٹھا لیا۔ مگر آرٹسٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔

"یہ لڑکی پگلی ہے پگلی۔"

مگر اس دن تو گوری نے اُسے پاگل بنا دیا تھا۔ چڑھتی ہوئی دھوپ میں اس نے

اپنے سائے میں ایک اور سایہ دیکھا تو یکدم سناٹے میں آگیا۔ اور گھبراہٹ میں یوں سپاٹ کھڑا ہو گیا۔ گوری مسکرا رہی تھی۔ اس نے آج آنکھوں میں کاجل ڈالا ہوا تھا۔

"تم بڑی شریر ہو گوری۔" آرٹسٹ نے کہا۔

"ڈرا دیا مجھ کو۔"

"کیوں میں کوئی بھوت ہوں۔ چھلاوا ہوں۔" گوری نے متبسم لہجہ میں پوچھا۔

"اب کیا معلوم کیا ہو تم۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔

"میں کیا ہوں؟" گوری کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بتا دوں گی پر بوندی کے لڈو کھاؤں گی۔ کھلاؤ گے؟"

"کھلا دوں گا۔ کھا لینا۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔

"شاباش۔ تم بڑے اچھے ہو۔ تم بوندی کا لڈو ہو۔"

"میں؟ بوندی کا لڈو؟"

"معافی دینا بابو۔ زبان پھسل گئی۔ میں کہتی ہوں بوندی کے لڈو بھی بڑے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ نام لیتے ہی منہ میٹھا ہو جاتا ہے۔" چٹخارہ مارتے ہوئے گوری نے کچھ اس طرح سے آنکھیں مٹکائیں کہ اس کی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے بھی مٹکنے لگے۔ اور آرٹسٹ کی نظریں غیر ارادی طور پر ایک پیڑ کی اُس شاخ کی طرف اُٹھ گئیں جس پہ تھوڑی دیر پہلے ایک پرندہ چہک کر پن چکی کی طرف اڑ گیا تھا اور شاخ ہل رہی تھی۔

"بابو وہ جو تم کہتے تھے میری تصویر نہ بنائی تم نے؟" ذرا توقف کے بعد گوری نے کہا۔

"بناؤں گا۔ ضرور بناؤں گا۔ بڑی اچھی سی تمہاری اک تصویر بناؤں گا۔"
آرٹسٹ نے جواب دیا۔

"لو میں بیٹھ گئی۔ بناؤ اب۔"

"اب۔"

"اور کب؟"

"کل۔"

"کل کس نے دیکھا ہے بابو آج کی بات کرو۔"

"آج مجھے فرصت نہیں ہے۔"

" فرصت ہی فرصت ہے بابو ایسی باتیں نہ کرو۔"

"دیکھو گوری آج میں ایک بڑی ضروری تصویر بنا رہا ہوں۔ گاہک کئی روز سے پھیرے ڈال رہا ہے۔ اس کا کام آج مجھے کر ہی دینا ہے۔"

"تو میرا کام بھی کر دو نا آج ہی۔ یہ ٹال مٹول اب نہ چلے گی۔" گوری نے کہا۔

"گوری ہٹ نہ کرو۔" آرٹسٹ نے کہا۔

"چلو تو ہٹاؤ بابو نہ سہی۔"

"اوہو۔ تم تو روٹھ گئیں۔"

"بس بابو بس۔ اب نہ بلانا مجھ کو۔" گوری نے دھمکی دی۔

"رُک جاؤ گوری۔ رک جاؤ۔"

"کیوں؟ کیا ہے؟" گوری نے رک کر تنتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیا یاد آیا؟"

"میں تمہیں خفا نہیں کروں گا۔" آرٹسٹ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہاری تصویر بناتا ہوں۔"

"دیکھو بابو اچھی سی بنانا میری تصویر۔" گوری نے ایک بار پھر کچھ اس انداز سے کاجل بھری آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا کہ بستی پر دور دور تک پھیلی ہوئی گوری گوری دھوپ کجلانے لگی۔

پچھم سے کالے کالے بادل آ رہے تھے۔ آرٹسٹ دو رنگوں میں کھو گیا۔ سیاہ اور سپید۔ گوری اور کاجل۔ وہ اس کی تصویر بنانے لگا۔ ہوا کے جھونکوں سے دوپٹہ سر سے سرک جانے پر ڈھیروں کالے کالے لانبے بال اس کے شانوں پر بکھر رہے تھے۔ گوری گوری دھوپ میں ریشم کے تار معلوم ہو رہے تھے۔ مگر گوری پتھر پر بڑے بھونڈے انداز سے بیٹھی تھی۔ اچھی سی تصویر بنانے سے پہلے اس کا اچھا سا پوز بنانا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے ماڈل کو شانے سے پکڑ کر پہلے تو اس کا ایک اچھا سا پوز بنایا۔ اور پھر جب اس نے اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر اس کے سینے پر سجایا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشم کی ملائم جھالروں میں شہتوت کے دو پتے دھڑک رہے ہیں۔ اور اس کا یہ

احساس بڑی سرعت سے بڑھنے لگا۔ گوری کے ریشم بال ریشم کے تار بن کر اس کے گرداگرد گھومتے ہوئے ریشم کا ایک غنچہ بنانے لگے۔ جس میں وہ بند ہوتا چلا گیا۔

اسے نیند سی آنے لگی۔ کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سویا ہوا کچھ جاگ اٹھا تھا اور اس کی رگ رگ میں رینگنے لگا تھا۔ اس نے اس ناگوار احساس کو سلانے کے لئے اپنا دھیان رنگوں میں لگانے کی کوشش کی۔ مگر ایکا ایکی اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ برش بھی کپکپانے لگا۔ رنگ بکھرنے لگے۔ بکھرتے چلے گئے۔ اب وہ کچھ نہیں بنا رہے تھے۔ ان سے کچھ نہیں بن رہا تھا۔ بے معنی ـــــ بیکار ـــــ بے سروپا ـــــ بے مقصد دھبے ـــــ دھند ـــــ دھند لکے۔ اسے سیاہ و سپید دو رنگوں کے آسیب نے دبوچ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں خود بخود مچنے لگی تھیں۔

اس نے کئی بار آنکھیں جھپکیں۔ سر کو جھٹکا مگر نیند کے دھند لکے اس کے ذہن پر جھکتے ہی چلے آئے۔ اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ ایک انجانی گھبراہٹ میں اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھرکنے لگیں۔ کائیں کائیں کرتے ہوئے کووں کی ایک ڈار اس کے سر پر سے چھیم کو نکل گئی۔ بے مقصد، بے محل وہ کمر پہ ہاتھ رکھے بائیں طرف چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر دائیں طرف ہو گیا۔ ایک جھاڑی کے پاس پہنچ کر پیچھے گھوما اور لوٹ کر پھر وہیں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔ گوری ٹھٹھا ہنسنے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بابو؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ واقعی اُسے کچھ ہو رہا تھا جو اس کی سوچ سمجھ سے باہر تھا۔ نیند کے اتنے بوجھل بادل اس پر جھکتے چلے آ رہے تھے کہ اب وہ ان کا بوجھ نہیں سہار سکتا تھا۔ سامنے سے ایک بھانڈ اکتارا بجاتا چلا آ رہا تھا گوری جلدی سے سوکھے پتوں کے ڈھیر کی طرف سرکی تو وہ موقعہ پاکر اپنا کینوس، برش، رنگ اٹھاکر سرپٹ ہوگیا۔ گوری اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ سوچتی ہی رہ گئی بابو تصویر بناتے بناتے بھاگ کیوں گیا؟

جب وہ ادھ بیچ کوٹھوں کے پاس پہنچا تو بندو بساطی کے دروازے کے آگے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بندو کی بیوی نے بچہ جنا تھا۔ دو ہیجڑے تالیاں بجاتے ہوئے سازوں کی آواز سے مل کر گاتے ہوئے ناچ رہے تھے۔

"ہائے میرا دل دھڑکے۔"

وہ رکا۔ دیوار کی اوٹ میں اس نے ادھر جھانک کر لمبا سا سانس لیا تو دفعتہً ایک ہیجڑا چک پھیری لیتے ہوئے اپنی کمر کو پکڑ کر "اوئی" کہہ کر یوں بل کھا گیا جیسے اس کی کمر کی کمانی ٹوٹ گئی ہو۔ عین اسی وقت آرٹسٹ کی کمر کو بھی بیساختہ ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی کمر کا بھی کوئی کارآمد کل پرزہ کڑک کر کے بالکل بیکار ہو گیا ہو۔ عجیب احساس تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس نے ایسا کیوں محسوس کیا؟ اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنا چاہا مگر کچھ نہ سوچ سکا۔ نیند کے جھونکے پہلے سے بہت تیز ہو گئے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا مگر وہ سویا ہوا تھا۔ وہ نیند میں

چل رہا تھا۔ اس قسم کی یہ اس کی پہلی نیند تھی۔ یہ احساس زندگی میں پہلی بار اس میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایسا کبھی محسوس نہ کیا تھا عجیب احساس تھا۔ جیسے اس کے نامکمل حواس بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے گھر میں گھستے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اور سو گیا۔

بستی کے ایک عطر فروش نے بالوں کو ریشم کی طرح ملائم، چمکدار اور لمبا کرنے والا ایک تیل ایجاد کیا تھا اور اس کا نام رکھا تھا "کالی گھٹا ہیئر آئل" جس کی مشہوری کرنے کے واسطے وہ بستی میں منادی تو کرا چکا تھا۔ اور اب وہ اخباروں اور رسالوں میں کالی گھٹاؤں کی تصویر دینے کے لئے کوئی اچھا سا ڈیزائن بنوانا چاہتا تھا۔ جس میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر ہو اور اس کے لمبے لمبے بال گھٹاؤں کی طرح ہوں۔

وہ آرٹسٹ کے پاس آیا۔ دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ اس نے آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے زور زور سے دروازہ تھپتھپایا کنڈی کھڑکائی تو اندر سے ٹر بٹر کی آوازیں سنائی دیں۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ آرٹسٹ آنکھیں ملتا اور جمائی پہ جمائی لیتا ہوا باہر آیا۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے آرٹسٹ سے کہا۔

"میں ایک تصویر بنوانا چاہتا ہوں۔"

"کیسی تصویر؟" آرٹسٹ نے پوچھا۔

"ایک بڑی ہی خوبصورت عورت کی تصویر۔ جس کے بال یہاں

ایڑی تک لمبے، چمکدار، ریشم کی طرح ملائم اور بس کالی گھٹا ہوں۔"
"بنا دوگے ایسی تصویر؟" عطر فروش نے پوچھا
"کیوں نہ بناؤں گا۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔
"اجرت کیا ہوگی؟" عطر فروش نے پوچھا۔
"یہ بات تصویر تیار ہو جائے گی تو ہوگی۔" آرٹسٹ نے کہا۔
"پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو۔" عطر فروش بولا۔
"سائز کیا ہوگا اس تصویر کا؟" آرٹسٹ نے پوچھا۔
"بس مناسب سائز۔" عطر فروش نے کہا۔
"چالیس روپے دے دینا۔" آرٹسٹ نے کہا۔
"کچھ کم کر دو۔" عطر فروش نے کہا۔
"رعایت تو میں نے پہلے ہی کر دی ہے۔" آرٹسٹ نے کہا۔
"یہ لو پینتیس روپے اور بس ٹھیک ہے۔" عطر فروش نے کہا۔
"چالیس سے کوڑی کم نہ ہوگی۔" آرٹسٹ نے کہا۔
"بڑی محنت کا کام ہے۔"
"چلو میاں چالیس ہی سہی۔" عطر فروش نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"تصویر لاجواب ہو۔ جو دیکھے بس تصویر ہی بن جائے۔"
"تصویر کتنے رنگوں میں ہو؟" آرٹسٹ نے پوچھا۔
"تصویر اچھی بنے رنگ چاہے جتنے ہو جائیں۔" عطر فروش نے کہا۔

" اچھا میاں کر دیں گے تمہارا کام ۔" آرٹسٹ بولا۔

" سنو میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں ۔" عطر فروش نے کہا۔

" کیا مشورہ دو گے ؟" آرٹسٹ نے پوچھا۔

" یہاں تمہارے پڑوس میں ایک بھٹیارن رہتی ہے ۔"

" جانتا ہوں ۔"

" اس کی ایک لڑکی ہے ۔"

" ہاں ہے ۔"

" تم نے اُسے دیکھا ہی ہوگا ؟"

" دیکھا ہے ۔"

" بڑی خوبصورت لڑکی ہے - اس کے بال دیکھے ہیں تم نے ؟"

" دیکھے ہیں ۔"

" بالکل ایسے ہی بال ہوں تصویر میں ۔ بال اتنا فرق بھی نہ ہو ۔"

" نہیں ہوگا ۔" آرٹسٹ نے بڑے وثوق سے کہا۔

" اور سنو ۔" عطر فروش نے کہا۔

" بس سن لیا ۔ تصویر پرسوں تیار ہو جائے گی ۔"

" پکی بات ۔"

" پکی بات ۔"

اس کے جاتے ہی وہ پھر رنگوں کے خلا میں لٹک گیا ۔ رنگوں کے پھیلنے سے ، سمٹنے سے ، رنگوں کے آپس میں گھلنے ملنے سے بہت کچھ بن

سکتا ہے۔ بہت کچھ بن جاتا ہے۔ وہ تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس نے چہرہ بنایا۔ چہرے میں بھویں، پلکیں، آنکھیں، ناک، ہونٹ۔ رنگ پر رنگ لگاتے ہوئے چہرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے سینہ بنایا تو اس کے ذہن میں کچھ اور ہی بننے لگا۔ سینے پر سجے ہوئے کالے ریشم بالوں کی جھالروں میں شہتوت کے دو پتے دھڑکنے لگے۔ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی بننے لگا۔ اور تصویر کچھ اور ہی بن گئی۔ وہ اکتا گیا۔ اُسے بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس کے اندر چھپا ہوا پیٹو ریشم کا کیڑا کھانے کو مانگ رہا تھا۔ سب کچھ اسی حالت میں وہیں چھوڑ چھاڑ کر اس نے دروازہ بند کیا اور بستی کے بڑے بازار کو چل دیا۔

پڑوس میں کسی کی چولہے پر پڑی ہوئی ہنڈیا کا مصالحہ جل رہا تھا جس کی تیکھی تیکھی دھانس ہوا میں گھل کر اس کے نتھنوں میں اتر گئی۔ بھوک اور تیز ہوئی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کھلبلی مچنے لگی۔ سامنے پڑی پر کیلے بیچنے والا بیٹھا تھا۔ وہ ایک درجن کیلے کھا گیا۔ چلنے لگا تو کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اُسے چوٹ تو نہ آئی ڈکار آ گیا۔ بھوک اور تیز ہوئی۔ ایک درجن کیلے اس کے پیٹ میں اترتے ہی نہ جانے کہاں لٹک گئے تھے۔ وہ ابھی اور بہت کچھ کھانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں نے قدرے تیزی پکڑی۔ جلدی سے چوک پار کر کے وہ چاٹ والے کی دکان پر آ گیا۔ پانچ روپے کی چاٹ کھا گیا۔ مگر وہ ابھی تک بھوکا تھا۔ ساتھ والی دکان سے کبابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ ادھر کو سرک گیا۔ تین چار سیخیں اٹھا کر ایک

پورے کباب کا بس ایک ہی لقمہ کیا۔ ایک ڈبل ڈیکر سامنے سڑک پر سے گزری۔ چند سواریاں کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے اُسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے چارلی چیپلن کی کوئی فلم دیکھ رہی ہوں۔ چھ سات سیخیں صاف کر کے اب وہ تھالی میں رکھی ہوئی مولی کا پتہ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس کے بعد اُس نے سموسے اور گلاب جامن بھی کھائے۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پیٹ میں ریشم کا پیٹو کیڑا پیٹ بھر کر کہیں سو گیا ہے اور اس کے فوراً ہی بعد اُسے بھی نیند سی آنے لگی۔ وہ گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک لڑکا اُپلے پر دُھواں چھوڑتا اُپلا رکھے گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ اُپلے پر ایک اور اُپلا اور اس سے اٹھتا ہوا دھواں۔ دیکھنے میں کچھ نہیں سوچنے میں بہت کچھ تھا۔ اور اُسے پھر اُسی اجنبی احساس کی سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ پھر وہی گھٹن۔ بے چینی۔ دھند۔ دھند لکے۔ نیند کا شدید احساس کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔ اور پورے بیس گھنٹے سویا رہا۔

گاہک کو تصویر بنا کر دینے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ وہ برش ہاتھ میں لے کر پھر کینوس پر جُھک گیا۔ دو تین رنگوں کی آمیزش سے اس نے تصویر میں سینے کا ابھار بڑی چابکدستی سے مکمل کیا تو ایکا ایکی اس کی نظر کونے میں لٹکتے مکڑی کے جالے پر جا پڑی۔ مکڑی نے ایک مکھی کو اپنے تاروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے برش ہاتھ سے رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے

کش لیتے ہوئے یہ تماشہ دیکھنے کے لئے چہرے کا رخ اس کونے کی طرف کرلیا۔ مگر نہ دیکھ سکا۔ شہتوت کے پتوں میں رینگتے ہوئے ریشم کے کیڑوں کو دیکھنے کی خواہش اُپلے پر رکھے ہوئے اُپلے کے دھوئیں کی طرح اس میں پیچ و خم کھانے لگی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا۔

گندے نالے پر بنے ہوئے لکڑی کے چھوٹے سے پل پر سے گذرتے ہوئے وہ سڑک کے کنارے پر لگے ہوئے سبز جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بچوں کے سکول کی طرف نکل گیا۔ سکول کے ساتھ ہی ٹوٹی پھوٹی غیر آباد ایک عمارت تھی۔ اس سے ذرا آگے چند دکانیں۔ لکڑی کا ایک ٹال۔ جس کے پچھلی طرف گھاس کے پلاٹ کے کنارے پیپل کا پیڑ۔ جس کے نیچے خانہ بدوش ڈیرہ ڈالے پڑے تھے۔

وہ خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھنے کے لئے ایک جگہ رک گیا۔ جو باہر سے بالکل کپڑے کی قبر نظر آرہے تھے۔ کپڑے کی قبر۔ کپڑے کی اندھیری کوٹھڑی۔ جس میں کوئی ستون، کوئی شہتیر، کوئی گرڈی، کوئی دیوار، کوئی کھڑکی نہیں ہوتی۔ بس آنے جانے کو چھوٹا سا ایک راستہ ہوتا ہے۔ جسے دروازہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ زمین میں بانس کی کمان سی چھڑیاں گاڑ کر اس پر پھٹے پرانے کپڑے، چیتھڑے، ترپڑ، بوریاں، گھاس پھوس رکھ رکھا کر ایک اندھیری کوٹھڑی بنائی جاتی ہے زندگی بسر کرنے کے لئے۔

وہ سوچنے لگا۔ کتنی عجیب ہیں کپڑے کی یہ قبریں جن میں زندہ انسان

رہتے ہیں۔ روتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ اور معاً اس کی نظر کپڑے کی ایک قبر کے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے اندر ایک خانہ بدوش جوان عورت سینہ ننگا کئے اپنے ننھے کو دودھ پلا رہی تھی۔ ننھا ماں کا تھن منہ میں لئے چسکیاں لگا رہا تھا۔

اُدھر لکڑیوں کے ٹال میں بھی اس وقت یہی کچھ ہو رہا تھا گائے گتا وا کھا رہی تھی۔ اور اس کا بچھڑا اس کا تھن منہ میں دبائے چسکیاں لگا رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ ایک عورت اور ایک گائے آپس میں کتنی ملتی جلتی ہے۔ اور ایک عورت اور ایک مرد میں بھی چند مخصوص چیزوں کا فرق ہے۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے سے بھی ایک ننھا چمٹا ہوا کچھ ٹٹول رہا ہے۔ کتنا عجیب احساس تھا۔ اور وہ مسکرایا اس احساس پہ۔ وہ اپنے آپ پر بھی مسکرایا۔ کتنا حساس تھا وہ۔ اُدھر خانہ بدوش عورت کی گود میں اب اس کا ننھا بھی مسکرا رہا تھا۔

وہ ایک عورت اور ایک گائے کے درمیان کھڑا تھا اور جھانک رہا تھا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ اس کے احساس میں ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان بھی کچھ کھڑا تھا۔ مگر اُسے صاف صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ خانہ بدوش عورت نے اپنے بچے کو اب نیچے زمین پر لٹا دیا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنی چھاتی دبا دبا کر دودھ کی ننھی ننھی دھاریں نکال رہی تھی، اچھال رہی تھی۔ دودھ کی ان ننھی ننھی پھواروں کے نیچے اس کے ننھے کا چہرہ تھا اور ننھا مسکرا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلائے غوں غاں کر رہا تھا۔

"بابو اک پیسہ دو۔"

یہ ایک بوڑھے خانہ بدوش کی آواز تھی جو لاٹھی کے سہارا لئے اس کی پچھلی طرف کھڑا تھا۔ اور وہ جھینپ گیا۔ اپنی ٹھوڑی سینے پر جماکر ایک ہی جھونک میں کافی دور نکل آیا۔

سورج اس کے سر پر آگیا تھا۔ چمکنی دھوپ میں ندی کنارے پیڑوں کے پتے ہل رہے تھے۔ اب اُن میں لانبے لانبے رس بھرے شہتوت بھی لٹک رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں ان سے چمٹ کر رس چوس رہی تھیں۔ اس نے پتوں میں جھانک کر دیکھا تو ریشم کے کیڑے آج پھر سو رہے تھے۔ یہ ان کی پانچویں نیند تھی۔ اس سے پہلے وہ انہیں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چار بار سوتے دیکھ چکا تھا۔ بس اب آخری نیند باقی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ریشم کے غنچے بنانے تھے۔ اور پھر ان کو چیرتے ہوئے ان میں سے تتلی بن کر اڑ جانا تھا۔

"بابو۔ چھلیے بابو۔" یہ گوری کی آواز تھی۔

وہ کپڑے کا جھولا پیٹھ پر لٹکائے اس کی طرف مسکراتی چلی آرہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں چنچل پن کے ساتھ ایک تیکھی تیکھی طنز اور چوٹ بھی تھی۔ اُسے گوری کی آواز اپنے دل پر میٹھی سی ایک چٹکی معلوم ہوئی۔ وہ پھر شرما گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب وہ گوری کو دیکھ کر شرما کیوں جاتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن کے جھروکے میں سے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اور اندھیرے میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے

پیروں تلے مکھیوں کا ایک چھال سا اٹھا اور وہ اس کے ساتھ ہی اڑنے لگا۔ رس بھرے شہتوتوں سے چمٹی ہوئی شہد کی مکھیاں اب اس کے ایک احساس میں اُسے اپنے چھتے کے کسی خانے میں موم کی دیواروں میں بند کر رہی تھیں۔

بے تحاشا بھاگتے ہوئے گھر میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور بڑی بے چینی میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ عجیب وحشت تھی۔ اس کے اندر کچھ ہو رہا تھا۔ بڑی تیزی سے کچھ ہو رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا سر اس وقت اتنا بوجھل ہو گیا کہ اس کا جی چاہتا تھا دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھوڑ لے۔ خون بہنے لگے۔ بہتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کے سر میں خون کی ایک بوند بھی نہ رہے۔ پھر شاید یہ بوجھ ہلکا ہو جائے اور اس کے سینے میں جو جونکیں سی رینگنے لگی تھیں رینگنا بند کر دیں۔

مگر دیواریں کچی تھیں۔ برکھا کے چھینٹے پڑنے سے ان سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وحشت اور بڑھی۔ اور بڑھی۔ وہ بے بس ہو گیا۔ اسے اپنی کوئی چیز اپنے بس میں معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ گلابی بہار ہی میں اس کا بدن تپنے لگا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے واسکٹ، قمیض اور بنیان اتار کر پھینک دی۔

دھم سے چارپائی پر گر گیا۔ ننگے بدن کو زور زور سے کھردرے بان پر رگڑنے لگا۔ رگڑتا رہا۔ ایسا کرنے سے اس کی بے چینی کچھ کم ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بڑی تیزی سے اس کی کایا کلپ ہو رہی ہو۔ وہ پرانی

کینچلی اتار رہا ہو۔ اس کی پرانی کینچلی کے نیچے سے نئی کینچلی جھانکنے لگی ہو۔ اس کے گوشت میں دھنسے ہوئے نوکیلے کانٹوں کی نوکیں کوٹی جھانویں اور کھر کھرے سے رگڑ رہا تھا۔ تاکہ ان کی چبھن جاتی رہے اور وہ سو جائے۔ اور اسی احساس میں وہ اپنے بدن کو کھردرے ریگ مال سے بان پر رگڑتے رگڑتے سو گیا۔ مختلف احساسات جن میں مختلف رنگ گھلتے ہوئے اس کے پپوٹوں کو سہلانے لگے۔

مگر ادھر گوری کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے چاند کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ بابو نے اس سے ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ ابھی تو ایسی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ پھر یہ اس کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا؟ یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ کتنے ہی سوال۔ کتنے ہی واہمے۔ کتنی ہی سوچیں اس کے ذہن میں جاگ جاگ کر سوتی چلی گئیں۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچوں بھری رات یونہی بیت گئی۔

سویرا ہوا۔ وہ گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہوئی۔ پیٹھ پہ جھولا لٹکایا اور ایندھن لینے کے بہانے ندی کی طرف چل دی۔ یہاں شہتوت کے پتوں میں اب ایک اور ہی چکر چل رہا تھا۔ ریشم کے کیڑے تتلیاں بن کر اڑتے جا رہے تھے۔ آرٹسٹ بھی وہاں موجود تھا۔ شاخوں کے سائے میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کے سامنے سات آٹھ ریشم کے غنچے پھٹے تھے۔ جیسے چوزہ باہر نکلنے سے پہلے مرغی کا انڈہ پھٹتا ہے۔

بالکل ویسے ہی ریشم کا غنچہ پھٹتے ہی ایک بڑی خوشنما تتلی دھنک سے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوا میں اڑ جاتی تھی۔

وہ چپ چاپ کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور پھر جب ایکا ایکی اس نے گوری کو دبے دبے پاؤں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ ندی کے اس پار مٹی کے ٹیلے کی طرف بے تحاشا بھاگ نکلا۔ مگر گوری بھی گھر سے آج سوگند کھا کے نکلی تھی کہ اُس سے یہ پوچھ کر ہی رہے گی کہ وہ جو تم میری تصویر بنانے لگے تھے ادھوری کیوں چھوڑ دی؟ مجھ کو دیکھ کر شرما کیوں جاتے ہو؟ چھپتے کیوں پھرتے ہو؟ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بے تحاشا بھاگنے لگی۔

تھوڑی دور جا کر آرٹسٹ نے پچھلی طرف گھوم کر متوحش نظروں سے دیکھا تو وہ اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ وہ اُس سے زیادہ تیز بھاگ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر اُسے پکڑ لے۔

اب وہ دونوں مٹی کے ٹیلے پر آ گئے نیچے چھوٹی سی پگڈنڈی پر جلدی جلدی اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں ہانپ رہے تھے۔ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ دھوپ تیز تیز چمک رہی تھی۔ پہلے وہ چوٹی پر پہنچا۔ سانس لینے کو رک گیا۔ راستے میں ایک جگہ آندھی سے پیڑ اکھڑ کر گرا ہوا تھا جسے وہ آسانی سے پھاند گیا۔ اس کا خیال تھا گوری کو پیچھے ہی روک دینے کو یہ رکاوٹ کافی ہو گی۔ مگر گوری تو اس وقت توپ کا گولہ ہو رہی تھی۔ سنسناتی چلی آ رہی تھی۔ چوٹی پر ابھی اس کی چوٹی ہی ابھری کہ وہ پھر بھاگ نکلا۔ ٹیلے کی دوسری طرف یوں سیدھی ڈھلوان پر سے بدحواسی میں نیچے اترنے لگا۔ اس کا

خیال تھا ادھر کوئی رامنہ نہ ہونے سے گوری ٹیلے کی چوٹی پر ہی رک جائے گی۔ مگر توپ کے گولے تو بس نشانے پر ہی رکا کرتے ہیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی اس کے اوپر سیدھی ڈھلوان پر نیچے کو رینگ رہی تھی۔ اور اس سے کہیں زیادہ تیز۔ وہ بوکھلا گیا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ کس آفت سے پالا پڑا ہے۔ اسی بوکھلاہٹ میں اس کا توازن بگڑ گیا۔ اور وہ ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے نیچے کھیتوں میں جا پڑا۔ کچھ کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگے آئے۔ وہ چوٹوں سے نڈھال ہو کر بیہوش ہو گیا تھا۔ لہو اور مٹی سے اس کے کپڑے لت پت ہو رہے تھے۔ اتنے میں گوری بھی وہاں پہنچ گئی۔ کسان اُسے اٹھا کر بستی کے ہسپتال میں لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر نے پہلے اُسے ٹیکہ لگایا۔ اور پھر اس کے سر کی چوٹ پر دوائی لگا کر پٹی باندھ دی۔ بس یہی ایک چوٹ ایسی تھی جو اگرچہ زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ بہرحال خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اُسے اسی وقت چھٹی دے دی گئی۔

گھر آتے ہی اُسے ٹیکے کا اتنا نشہ ہوا کہ دروازہ بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اور اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں اُسے کچھ خبر نہ رہی وہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ دن ڈھلا۔۔۔ شام ہوئی۔ رات ہوگئی۔ تارے نکل آئے۔ اور گوری بھی چپکے سے گھر سے نکل آئی۔ اس کی ماں سو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو لمبے لمبے خراٹے لیتے چھوڑ آئی تھی۔ بستی کے دھندلکوں میں ایک سائے کی طرح سرسراتے ہوئے وہ اس کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کیسا ہے؟ کہیں کوئی چوٹ اسے زیادہ دکھ تو نہیں دے رہی۔ بیچارا

آرٹسٹ۔ کسی تنہائی میں اُگا ہوا تنہا شہتوت کا پیڑ۔ اکیلا ریشم کا کیڑا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ کواڑ سے کان لگا کر کچھ سننے لگی۔ کمرے میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا مگر اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ نیم کے پیڑ کے اس پار چاند نکل آیا تھا۔ جس میں پوری چمک آنے تک وہ اس کمرے میں گھس جانا چاہتی تھی۔ تاکہ کوئی اُسے وہاں کھڑا نہ دیکھ لے۔ مگر اندر جانے کو اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے حافظے پر زور دیا اب کیا کرنا چاہیئے تو ایک کھڑکی سی کھٹ سے کھلی اس کی کھوپڑی میں۔ دروازے کے اس طرف کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی۔ جس کے آگے بیر کا بوٹا تھا۔ وہ چپکے سے ادھر چلی گئی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ وہ مسکرائی۔ اچھل کر کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ چاندکی روشنی میں ادھر اُدھر جھانک کر دیکھا اور چپکے سے کمرے میں اتر گئی۔

ٹیکے کی غنودگی میں اُسے کچھ خبر نہ تھی اس کے پاس کون بیٹھا ہے۔ کھڑکی سے اندر آتی ہوئی روشنی میں گوری اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ سہلاتی رہی۔ گدگداتی رہی۔ چاندنی میں کتنا پیارا دکھائی دے رہا تھا اس کا چہرہ۔ کھڑکی سے باہر ہوا سے بیر کے بوٹے کی شاخیں ہل رہی تھیں۔ اس کا دل بھی اس کے سینے میں ہلورے لینے لگا۔ اور اُسے بس کچھ ہو گیا۔ بیٹھے بٹھائے یوں ہانپنے لگی جیسے کاسے کوسوں سے بھاگتی آ رہی ہو۔ وہ چپکے سے اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کے

ہاتھ پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر کروٹ بدل کر اپنی ٹانگ اس کی ٹانگ پہ رکھ دی۔ وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ یہ اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں چلانے لگی۔ کتنے ملائم اور چمکدار تھے اس کے بال۔ جیسے کہ اس کے اپنے بال ملائم اور چمکدار تھے۔ اور پھر ہوا کی اک لہر سی آئی۔ بیر کے بوٹے کے پتے چھنکے۔ اور اس کی کلائی میں چوڑیاں بھی چھنک گئیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے سینے پہ ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کے سینے کو ٹٹولا۔ اُسے جھنجھنی آ گئی۔ اس کا تیز تیز چلتا ہوا سانس منجمد ہونے لگا۔ وہ کلبلائی۔ اور کلبلاتے ہوئے اس کے جسم پہ ایک کروٹ سی لے کر اس کے کھلے گریبان میں جھانکنے لگی۔ اس کے بند ہونٹ یکدم کھل گئے۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ وحشت میں کھڑکی کی طرف بھاگی۔ خلا سے جھانکتا ہوا چاند مسکرا رہا تھا۔ ریشم کا کیڑا تتلی بن چکا تھا۔

## میری لائبریری کا سلسلہ عملی نفسیات

| | | |
|---|---|---|
| جینے کی اہمیت ، | لن، یو، تانگ ، | ۶/۰۰ |
| میٹھے بول میں جادو ، | ڈیل کارنیگی ، | ۳/۵۰ |
| پریشان ہونا چھوڑ دیئے ، جینا شروع کیجئے ، | ڈیل کارنیگی ، | ۳/۵۰ |
| مانیں نہ مانیں ، | ڈیل کارنیگی ، | ۲/۵۰ |
| گفتگو اور تقریر کا فن ، | ڈیل کارنیگی ، | ۲/۵۰ |
| جنس کا نفسیاتی پہلو ، | کینتھ واکر، پیرٹ فلیچر ، | ۳/۰۰ |
| جنس کا جسمانی پہلو ، | کینتھ واکر ، | ۲/۵۰ |
| زندگی کے موڑ پر ، | ۱۰۴ سچے واقعات ، | ۲/۲۵ |
| شادی اور کامیابی ، | ڈاکٹر یوسٹس چیسر ، | ۲/۲۵ |
| روزمرّہ نفسیات ، | پروفیسر محمد اکرم طاہر ، | ۲/۰۰ |
| ۳۹ بڑے آدمی ، | ڈی کارنیگی ، | ۳/۷۵ |
| زندگی اور عمل ، | ڈاکٹر ماررڈن | ۱/۵۰ |
| نفسیات اور عمل ، | ۲۳ مقالات ، | ۲/۰۰ |
| دولت نامہ ، | محمد اکرم طاہر ، | ۲/۵۰ |
| ترقی کی راہیں ، | ڈاکٹر محمد نعمان ساجد ، | ۲/۰۰ |
| نفسیات کی روشنی ، | ۴۴ مضامین ، | ۱/۵۰ |
| تازہ دم رہنے کے گر ، | جوزف اے کینیڈی ، | ۲/۵۰ |
| ہماری عادتیں ہمارے جذبات ، | دیانند ورما ، | ۱/۰۰ |
| آپ کے خواب اور اُن کے حل ، | | ۴/۰۰ |
| شیر، سیر، شیر، شکار کی کہانیاں | | ۳/۰۰ |
| معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ، | سید علی ناصر زیدی ، | ۳/۷۵ |
| حلال و حرام ، قرآن کی روشنی میں ، | عطاالله پالوی ، | ۲/۲۵ |

## میری لائبریری میں سلسلہ طنز ومزاح

| مصنف | کتاب | قیمت |
|---|---|---|
| شفیق الرحمٰن | لہریں، | ۱/۷۵ |
| | پرواز، | ۱/۷۵ |
| | حماقتیں، | ۳/۷۵ |
| | مزید حماقتیں، | ۳/۰۰ |
| کنہیا لال کپور | سنگ وخشت، | ۱/۵۰ |
| | شیشہ وتیشہ، | ۱/۵۰ |
| | چنگ ورباب، | ۱/۵۰ |
| | گرد کارواں، | ۱/۵۰ |
| | نرم گرم، | ۱/۵۰ |
| | بال وپر، | ۱/۵۰ |
| | نوکِ نشتر، | ۱/۵۰ |
| شوکت تھانوی | راجہ صاحب | ۱/۷۵ |
| اشفاق احمد خاں (لطیفے) | گرما گرم، | ۱/۵۰ |
| شوکت محمود (کارٹون) | ڈھول کا پول، | ۱/۰۰ |
| مشتاق احمد یوسفی، | چراغ تلے، | ۱/۵۰ |
| کارلو گولڈونی، | دغاباز | ۱/۲۵ |
| احمد جمال پاشا، | اندیشۂ شہر، | ۲/۰۰ |
| مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، | اردو کا بہترین انشائی ادب، | ۵/۵۰ |
| " " | اردو میں شخصیت نگاری، | |
| " " | اردو کا بہترین طنز ومزاح، | |